مولانا وحید الدین خاں

GOODWORD

فہرست مضامین

حکمتِ عبادت:

حکمتِ دعوت:

حکمتِ علم:

حکمتِ اسلام

اسلام اور مغربی تہذیب

کسی بھی قوم کے رہن سہن (way of living) کا نام کلچر ہے۔ دنیا کی ہر قوم کا ایک کلچر ہوتا ہے جب کہ سویلائزیشن سے مراد شہری زندگی ہے۔ کلچر کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک پہنچنے کا نام سویلائزیشن ہے۔

عام تصور کے مطابق، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ حتیٰ کہ سموئیل ہنٹنگٹن کی مشہور کتاب کے مطابق، دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے خلاف متصادم ہیں۔ یہ تصادم تشدد کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ مگر راقم الحروف کے نزدیک یہ تجزیہ اصل واقعہ کے مطابق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اصولی طور پر اسلام کے حق میں ایک معاون واقعہ تھا۔ اُس نے اسلام کے لیے بہت سے نئے امکانات کھولے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک مطلوب انقلاب تھا۔ اس انقلاب کے لانے والوں میں بالفرض اگر کچھ منفی پہلو پائے جاتے ہوں تب بھی اس انقلاب کا مؤیدِ اسلام ہونا مشتبہ نہ ہوگا۔ احادیث سے ثابت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار غیر مسلموں کی رائے یا ان کے طریقہ کو کسی عملی معاملہ میں اختیار فرمایا۔

فنی تعریف سے قطع نظر، کوئی تہذیب ہمیشہ تخلیقی طاقت کے زور پر اُٹھتی ہے۔ کوئی گروہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ نئی فکری اور عملی طاقتوں کو دریافت کرتا ہے۔ یہ دریافت اُس گروہ کو دوسرے لوگوں سے آگے کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک تہذیب وجود میں آتی ہے اور اس تہذیب کے حامل دوسروں کے اوپر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔

مغربی تہذیب کا ظہور اصلاً اسی قسم کے ایک مثبت واقعہ کی حیثیت سے ہوا۔ مگر بعد کو اس میں ایسے اضافی پہلو شامل ہو گئے جن کی وجہ سے مغربی تہذیب کی وہ متنازعہ صورت بن گئی جو آج نظر آتی ہے۔ یہ اضافی پہلو خاص طور پر دو ہیں۔ ایک پہلو کا تعلق خود مغربی تہذیب کے علم برداروں سے ہے۔

اور دوسرے پہلو کا تعلق اُن مسلم علماء اور دانشوروں سے ہے جنہوں نے اس کو غیر اسلامی قرار دے کر مطلق طور پر اس کی مخالفت شروع کر دی۔

مغربی تہذیب کا آغاز

مغربی تہذیب کا آغاز زیادہ واضح صورت میں سولھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اُس وقت یہ تہذیب فطرت کے قوانین یا فطرت میں چھپی ہوئی طاقتوں کی دریافت کے ہم معنٰی تھی۔ مگر یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ اپنے ابتدائی زمانہ میں مغربی تہذیب کے بانی سائنسدانوں نے عالمِ فطرت کے جو حقائق دریافت کیے وہ زوال یافتہ مسیحیت کے مزعومہ عقائد سے ٹکراتے تھے۔ مسیحیت کے پیشواجوں کہ اس وقت اقتدار کی حالت میں تھے، اُنہوں نے ان سائنس دانوں کی سخت مخالفت کی اور انہیں سخت سزائیں دیں۔ ان سزاؤں کی تفصیل ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Science and Religion) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ ٹکراؤ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اہل سائنس اور اہل مذہب کے درمیان تھا۔ مگر غلط طور پر اس کو سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ سمجھ لیا گیا۔ اُس وقت جذباتی ہیجان کی بنا پر اس فرق کو سمجھا نہ جاسکا اور مغربی تہذیب غلط طور پر اپنے آغاز ہی میں عملاً ایک مخالفِ مذہب تہذیب کی حیثیت اختیار کرگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کے لوگ مذہب کو اپنا حریف سمجھنے لگے اور اہل مذہب نے مغربی تہذیب کو اپنا دشمن فرض کرلیا۔ یہ منفی ذہن ابتداءً مسیحیت کے مقابلہ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ توسیع پاکر دوسرے مذاہب تک پہنچ گیا۔

موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسلم علماء اور دانشوروں کا رخ مغربی تہذیب کے معاملہ میں منفی رہا۔ اس کا سبب بھی حقیقی کے بجائے اضافی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں جب یہ مغربی تہذیب اپنے عروج تک پہنچ کر مسلم دنیا میں داخل ہوئی تو یہ داخلہ صرف ایک تہذیبی داخلہ نہ تھا بلکہ وہ سیاست اور ملک گیری کے جلو میں ہوا جس کو نوآبادیاتی نظام (colonialism) کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کے اس سیاسی مارچ کی زد سب سے زیادہ جن لوگوں پر پڑی وہ مسلمان تھے۔

اس وقت ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبہ میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔ مغربی تہذیب کے سیاسی مارچ نے ان مسلم حکومتوں کا خاتمہ کر کے ان کے اوپر اپنا غلبہ قائم کر دیا۔

انیسویں صدی کے مسلم علماء اور دانشور مغربی تہذیب اور اس کے سیاسی پہلو میں فرق نہ کر سکے۔ مغربی سیاست کو ایک غیر مطلوب چیز سمجھنے کے ساتھ انہوں نے یہ کیا کہ خود مغربی تہذیب کو بھی ایک غیر مطلوب چیز سمجھ لیا۔ انگریز سے متنفر ہونے کے ساتھ وہ انگریزی سے بھی متنفر ہو گئے۔ ابتدائی طور پر دو چیزوں کے درمیان یہی عدم تمیز تھی جس نے مغربی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں نفرت پیدا کر دی۔

مگر بعد کو خود مغربی تہذیب میں کچھ مزید برائیاں پیدا ہوئیں۔ یہ برائیاں اگر چہ اضافی تھیں مگر وہ اسلامی مزاج کے سراسر خلاف تھیں۔ اس لیے مغربی تہذیب کے معاملہ میں مسلم علماء اور دانشوروں کے منفی ذہن میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

اس معاملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے مسیحی مذہب کے خلاف ردعمل میں آزادی کے تصور کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ اس کو خیر مطلق (summum bonum) کا درجہ دے دیا۔ انسانی آزادی کے نام پر مذہبی قدروں کی وسیع پیمانہ پر پامالی شروع ہوگئی۔ اس کی آخری حد وہ مجرمانہ عریانیت (criminal pornography) ہے جو اب شرمناک حد تک غیر انسانی صورت اختیار کر چکی ہے۔

تاہم ان تمام منفی پہلوؤں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مغربی تہذیب نے اسلام اور اسلامی دعوت کے حق میں ایسے نئے امکانات کا دروازہ کھولا ہے جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ مسلمان اگر خذ ما صفا، دع ما کدر کے اصول کے مطابق یہ کریں کہ وہ مغرب کے برے پہلوؤں کو نظر انداز کریں اور اس کے موافق پہلوؤں کو لے لیں تو بلاشبہہ مغربی تہذیب ان کے لیے ایک عظیم نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔

اساساتِ اسلام، تائیداتِ اسلام

اصل یہ ہے کہ وسیع تر معنوں میں اسلام کے دو پہلو ہیں — اساساتِ اسلام، اور تائیداتِ اسلام۔

اساسات اسلام سے مراد اسلام کی وہ بنیادی تعلیمات ہیں جن کا ماخذ وحی الٰہی ہے، یعنی عقائد، عبادات، اخلاقیات، اور روحانیات وغیرہ۔ اسلام کا یہ پہلو پیغمبر اسلام کے زمانہ میں آخری طور پر مکمل ہو چکا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے قرآن اور حدیث اور سیرت کا مطالعہ بالکل کافی ہے۔ اس حصۂ اسلام میں اگر کوئی مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے تو وہ اصحابِ رسول کی سنت کا اضافہ ہے۔ اس کے بعد اس حصۂ اسلام میں کوئی اور اضافہ بدعت ہے، اور اسلام میں بدعت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

اسلام کا دوسرا حصہ جس کو ہم نے تائیدات اسلام کا نام دیا ہے اس کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ یہ حصہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ اس میں غیر مومنین اور غیر مخلصین بھی مفید حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو ایک حدیث رسول میں ان الفاظ میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری) یعنی اللہ اس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعہ بھی کرے گا۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو عظیم انقلاب برپا ہوا اس کے کچھ اجزاء ایسے تھے جو مستقبل میں تکمیل پانے والے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انقلاب محمدی نے انسانی تاریخ میں ایک عمل (process) جاری کیا۔ یہ عمل مختلف نشیب وفراز کے ساتھ مستقل جاری رہا۔ مغربی تہذیب اپنے سائنسی پہلو کے اعتبار سے اسی انقلابی عمل کا گویا ایک نقطۂ عروج (culmination) ہے۔

اس اعتبار سے اسلام کے حق میں جو مفید اسباب پیدا ہوئے ان کو چار عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ چار عنوانات یہ ہیں — حفاظت اسلام، دلائل اسلام، دعوت اسلام، شعور اسلام۔

حفاظت اسلام

قرآن آخری آسمانی کتاب ہے۔ اس کے بعد اب خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آنے والی نہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کتاب کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔ اس منصوبۂ الٰہی کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون (الحجر ۹) یعنی ہم نے اس

قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

خدا کے قانون کے مطابق، اس حفاظت کا نظام اسباب کے دائرہ میں کرنا تھا۔ چنانچہ ظہور اسلام کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک اس کی حفاظت اس طرح کی جاتی رہی کہ قرآن کا ایک ایک نسخہ لوگ اپنے ہاتھ سے لکھتے رہے اور اسی کے ساتھ حافظہ کی مدد سے اس کو یاد کرتے رہے۔ اس طرح کتابت اور حفظ کے ذریعہ اس کو محفوظ حالت میں رکھا جاتا رہا۔ مگر موجودہ زمانہ میں پریس اور پرنٹنگ کے طریقہ نے قرآن کو زیادہ مستحکم طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ یہ جدید ذرائع تمام تر مغربی تہذیب کے زیر اثر ظہور میں آئے ہیں۔

اسی طرح ظہور اسلام کے بعد ہزار سالہ ابتدائی تاریخ میں کثیر تعداد میں اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ حدیث، سیرت، تاریخ، فقہ، اور دوسرے اسلامی علوم پر عربی زبان میں بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں اسلام کے کلاسیکل لٹریچر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ تمام کتابیں مخطوطات کی شکل میں تھیں۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے مختلف اسلامی کتب خانوں کی الماریوں میں محفوظ تھے۔

قدیم زمانہ میں یہ کتابیں صرف مخصوص علماء کی دسترس تک محدود تھیں۔ آج وہ ساری دنیا میں ہر شخص کے لیے قابل حصول ہوگئی ہیں۔ ان کتابوں کی یہ عمومی اشاعت کیسے ممکن ہوئی۔ یہ واقعہ پرنٹنگ پریس کے ذریعہ ہوا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے پرنٹنگ پریس تیار کیا۔ انہوں نے اعلیٰ قسم کے کاغذ بنائے اور دوسری متعلق چیزیں ایجاد کیں۔ اس طرح یہ قیمتی کتابیں چھپ کر اور مجلّد ہو کر ساری دنیا میں پھیل گئیں۔

اسی طرح مغربی تہذیب کے زیر اثر ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ تمام قدیم کتابوں اور دستاویزات کی سائنٹفک تحقیق شروع ہوگئی۔ یہ ذوق توسیع پا کر مذاہب کی مقدس کتابوں تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے ایک مستقل فن وجود میں آیا جس کو تنقید عالیہ (higher criticism) کہا جاتا ہے۔

اس کے تحت قدیم مذہبی کتابوں کی تحقیق وتنقید خالص علمی انداز میں کی جانے لگی۔اس کے ذریعہ پہلی بار یہ حقیقت واضح ہوکر لوگوں کے سامنے آئی کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب کی مقدس کتابیں تاریخی اعتبار سے غیر معتبر ہیں۔صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کی مقدس کتاب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔یہ اہم واقعہ بھی مغربی تہذیب کے زیر اثر پیش آیا۔

دلائل اسلام

قرآن میں آئندہ آنے والے عہد کے بارہ میں کچھ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔اُن میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں بیان ہوئی ہے۔اس سلسلہ میں قرآنی آیت کا ترجمہ یہ ہے: عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے نفسوں میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ حق ہے (حٰم السجدہ ۵۴)

قرآن کی اس پیشین گوئی کے مطابق، مستقبل میں ایسا ہونے والا تھا کہ کائنات میں چھپی ہوئی نشانیاں ظاہر ہوں اور وہ قرآن کے بیانات کی علمی تصدیق کریں۔یہ واقعہ کب پیش آیا۔وہ مسلم عہد میں پیش نہ آسکا۔وہ مغربی تہذیب کے ظہور کے بعد موجودہ زمانہ میں پیش آیا۔اس زمانہ میں مغربی سائنس دانوں نے کائنات کی تحقیق وتفتیش جدید ذرائع سے کی۔اُنہوں نے دوربین اور خوردبین جیسے بہت سے طریقے ایجاد کیے جن کے ذریعہ کائنات میں چھپی ہوئی حقیقتیں ظاہر ہوکر انسانی علم کے دائرہ میں آگئیں۔

اس موضوع پر ایک مغربی سائنس داں کی انگریزی کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا ہے اور موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کا نام بامعنٰی طور پر یہ رکھا گیا ہے: اللہ یتجلی في ضوء العصر۔ اس موضوع پر انگریزی زبان میں کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ان میں سے دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

The Evidence of God in an Expanding Universe
Nature and Science speak about God

راقم الحروف نے اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور اس کے بارہ میں کئی کتابیں تیار کر کے شائع کی ہیں۔اُن میں سے ایک کتاب کا نام مذہب اور جدید چیلنج ہے۔اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان

میں **الاسلام یتحدی** کے نام سے شائع ہوا ہے۔انگریزی زبان میں اس کتاب کے ترجمہ کا نام گاڈ ارائزز (God Arises) ہے۔

مذہب اور جدید چیلنج (صفحات ۲۲۰) کا موضوع خاص طور پر یہی ہے۔ وہ گویا قرآن کی مذکورہ آیت کی سائنسی تفسیر ہے۔اس کتاب میں دورِ جدید کی سائنسی دریافتوں کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ یہ دریافتیں قرآن کی تعلیمات کی سائنسی تصدیق ہیں۔گویا کہ جو بات پہلے وحی کے ذریعہ بتائی گئی تھی وہ اب خود علمِ انسانی کی سطح پر ثابت شدہ بن گئی۔

قرآن میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔آخری مرحلہ میں جب فرعون پانی میں غرق ہوا تو قرآن کے بیان کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة** (یونس ۹۲) یعنی آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تا کہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے۔

جیسا کہ معلوم ہے، فرعون پانی میں ڈوب کر مرا۔قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ فرعون کا جسم اس کی موت کے بعد بھی محفوظ رہے اور بعد کے زمانہ میں ظاہر ہو کر وہ لوگوں کے لیے خدائی نشانی بنے۔

یہ واقعہ مسلم دور میں پیش نہ آسکا۔ ہزار سالہ مسلم دور میں وہ ایک نامعلوم واقعہ بنا رہا۔انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار اہلِ مغرب نے اس کو اہرامِ مصر کے اندر دریافت کیا اور جدید سائنسی طریقوں کو استعمال کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ اُسی فرعون کا جسم ہے جو حضرت موسیٰ کا ہم عصر تھا۔(اس معاملہ کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب عظمتِ قرآن میں دیکھی جا سکتی ہے) نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر موریس بوکائی کی کتاب:

The Bible, the Qur'an and Science

دعوتِ اسلام

اہلِ اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کے دین کی دعوت تمام انسانوں تک پہنچائیں۔وہ اس کام کو نسل در نسل مسلسل جاری رکھیں۔ اس کام کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لیے سب سے زیادہ

ضروری یہ ہے کہ دنیا میں مکمل مذہبی آزادی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، بالفاظِ دیگر، داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوں۔

جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے، قدیم زمانہ میں وہ موجود نہ تھی۔ اسی صورت حال کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اہل اسلام کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مذہبی عدم آزادی کی صورت حال کو ختم کردیں۔ خواہ اس کے لیے اُنہیں مخالف طاقتوں سے لڑنا پڑے۔ یہی وہ حکم ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں دیا گیا ہے: **وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة (الأنفال ٣٩)** اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے)۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اور اصحاب رسول نے اس حکم کی تعمیل فرمائی۔ اُنہوں نے زبردست جدوجہد کے ذریعہ عرب اور اطرافِ عرب میں مذہبی جبر کا خاتمہ کردیا اور مذہبی آزادی کا دروازہ کھولا۔ اس طرح پہلی بار دنیا میں مذہبی آزادی کا دور شروع ہوا۔ یہ دور ایک عمل (process) کے روپ میں تاریخ میں جاری ہوگیا۔

مغربی تہذیب نے موجودہ زمانہ میں اس عمل کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ اب ساری دنیا میں مذہبی آزادی آگئی۔ ہر ملک کے دستور میں مذہبی آزادی کی دفعات شامل کی گئیں۔ اقوام متحدہ کے منشور میں مذہبی آزادی کو انسان کا ناقابلِ تنسیخ حق قرار دیا گیا اور اس پر تمام قوموں کے نمائندوں نے اپنے دستخط ثبت کیے۔

صلحِ حدیبیہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تھا جس نے دس سال کے لیے ٹکراؤ کا خاتمہ کردیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد عرب کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں معتدل تعلقات قائم ہوگئے اور کھلا ڈائیلاگ شروع ہوگیا۔ باہمی تعلقات کے اسی نارملائزیشن کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف چند برسوں میں پورے عرب میں اسلام پھیل گیا۔

موجودہ زمانہ میں اقوام متحدہ اور دوسرے بین اقوامی اداروں کے ذریعہ امن اور اعتدال کی جو حالت قائم ہوئی ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے گویا ایک انٹرنیشنل صلح حدیبیہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں

سیکولرزم کی صورت میں ناطرفداری کا جو اجتماعی اصول ساری دنیا میں رائج ہوا ہے اُس نے عملاً اُسی چیز کا تحفہ انسانیت کو دیا ہے جو اسلام کے دور اول میں صلح حدیبیہ کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔ اس انقلابی تبدیلی نے اب دعوت کے تمام مواقع کھول دیے ہیں۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ کے اندیشہ کے بغیر ہر ملک میں آزادانہ طور پر دعوت کا کام کیا جائے۔

یہ آزادی مغربی تہذیب کے زیر اثر حاصل ہوئی۔ یہ ایک مکمل آزادی ہے۔ آزادی کے ان مواقع کو استعمال کرنے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ داعی کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کی بنا پر تشدد کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ وہ پوری طرح پُر امن دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا دعوتی کام جاری رکھے۔

شعور اسلام یا اضافۂ ایمان

قرآن اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کوئی جامد چیز نہیں، وہ ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ ایمان ایک پودے کی مانند ہے جو اپنے گرد وپیش کی دنیا سے غذا لے کر بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی آخری اونچائی تک پہنچ جاتا ہے (ابراہیم ۲۴)۔ اس اضافۂ ایمان کو دوسرے لفظوں میں شعوری ارتقاء (intellectual development) بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ اضافۂ ایمان یا ازدیادِ ایمان کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس اضافہ کا ذریعہ خدا کی یاد ہے۔ قرآن وسنت کا مطالعہ ہے۔ کائنات میں غور کرنا ہے۔ اپنے اندر تفکر اور تدبر اور توسم کی صلاحیت کو اتنا زیادہ بیدار کرنا ہے کہ گرد وپیش کی پوری دنیا آدمی کے لیے ایک وسیع دسترخوان بن جائے جس سے ربّانی غذا لے کر آدمی اپنی دینی شخصیت میں اضافہ کرتا رہے۔

قدیم زمانہ کے خدا پرست افراد ہمیشہ اپنے ایمان میں اس قسم کے اضافے کرتے رہتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب کے زیر اثر جو علمی انفجار (knowledge explosion) ہوا ہے اُس نے اضافۂ ایمان کی کوششوں کا دائرہ بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے زمانہ کا انسان روایتی فریم ورک (traditional framework) کے اندر اپنے شعور کو بیدار کرسکتا تھا اور اُس کے دائرہ میں اضافۂ ایمان کی غذا حاصل کرتا تھا۔ مگر موجودہ

زمانہ میں اس کا دائرہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ سائنٹفک فریم ورک کے زیادہ وسیع دائرہ میں اضافۂ ایمان کی خوراک حاصل کی جا سکے۔

مثال کے طور پر قدیم زمانہ کا انسان جب رات کے وقت کھلے آسمان کو دیکھتا تھا تو وہ برہنہ آنکھ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دس ہزار ستاروں کو گن سکتا تھا۔ مزید یہ کہ جن ستاروں کو وہ دیکھتا تھا، ظاہری مشاہدہ کے مطابق، وہ ان کو آسمانی چراغ جیسی چیز سمجھتا تھا۔

مگر موجودہ زمانہ میں دوربینی مشاہدہ نے بتایا کہ آسمان میں ستاروں کی تعداد اُس سے بھی زیادہ ہے جتنا کہ تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذروں کی تعداد۔ نیز یہ کہ یہ ستارے اُس سے بہت زیادہ بڑے ہیں جتنا کہ وہ برہنہ آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں۔ سورج جو بظاہر بڑا دکھائی دیتا ہے، وہ دوسرے ستاروں کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے۔ اس طرح ستاروں کے مشاہدہ سے ایمانی غذا لینے کا دائرہ اب بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

جدید سائنسی ترقی نے بتایا ہے کہ خلائی دنیا ناقابلِ قیاس حد تک وسیع ہے۔ اُس کی وسعت دہشت ناک حد تک بڑی ہے۔ اُس کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اُس کا تصور کرنے سے دماغ میں بھونچال آجائے اور جسم تھرتھرا اُٹھے۔ یہی پانی اور ہوا اور دوسری تمام کائناتی چیزوں کا معاملہ ہے۔ سائنس نے بتایا ہے کہ ہر چیز اتنی زیادہ عظیم اور عجیب ہے کہ اُس کا ابتدائی علم بھی انسان کو سراسیمہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات حسب ذیل کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں:

Man Does Not Stand Alone by Cressy Morrison

موجودہ زمانہ میں اس قسم کی بے شمار دریافتیں ہوئی ہیں جنھوں نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ زیادہ وسیع دائرہ میں سوچے۔ وہ زیادہ وسیع معلومات کی روشنی میں چیزوں کو دیکھ سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آج کا انسان اس پوزیشن میں ہو گیا ہے کہ وہ خدا کی تخلیقات میں زیادہ گہرائی کے ساتھ ازدیادِ ایمان کا وہ عمل کر سکے جس کو قرآن میں تفکر اور تدبر اور توسّم (الحجر ۷۵) کہا گیا ہے۔

تفکر و تدبر کے یہ نئے مواقع کس نے پیدا کیے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مغربی تہذیب کے تحت پیدا ہونے والی جدید سائنس نے۔

خلاصۂ کلام

جدید مغربی تہذیب اسلام دشمن تہذیب کے طور پر نہیں، ابھری وہ خود اپنی مثبت طاقت کے زور پر پیدا ہوئی۔ تاہم اسی کے ساتھ اس میں کچھ ایسے غیر مطلوب اجزاء شامل ہو گئے جنھوں نے مغربی تہذیب اور مسلم دنیا کے درمیان تلخی پیدا کر دی۔ اس تلخی کے اسباب دونوں طرف تھے، مغربی تہذیب کی طرف بھی اور مسلمانوں کی طرف بھی۔ مگر یہ صورت حال مسلم علماء اور دانشوروں کے لیے کوئی عذر فراہم نہیں کرتی۔ اس ناخوشگوار صورت حال کے باوجود مسلم علماء اور مسلم دانشوروں کا فرض تھا کہ وہ مغربی تہذیب کے حقیقی پہلو اور اس کے اضافی پہلو کے فرق کو سمجھیں۔ وہ اضافی پہلو کو نظر انداز کر کے اس کے اصل پہلو کو دیکھیں اور اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

یہ غلطی جو ماضی میں کی گئی وہ بلا شبہہ نہایت مہلک تھی۔ مغربی تہذیب اسلام کی تائید کے طور پر ابھری تھی مگر اہل اسلام نے غلط فہمی کی بنا پر اس کو اپنا دشمن سمجھ لیا۔ وہ **الناس اعداء ما جهلوا** کے مصداق بن گئے۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اس امکان کو واقعہ بنایا جائے۔ مسلم علماء اور دانشوروں کو چاہئے کہ وہ اپنی غلطی کا احساس کریں۔ وہ اکیسویں صدی میں اس غلطی کو نہ دہرائیں جس کا ارتکاب وہ بیسویں صدی میں کرتے رہے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کر کے اسلام کی جدید تاریخ بنائیں۔

یہ مواقع ماضی میں بھی خدا کے دین کے لیے تھے اور آج بھی وہ خدا کے دین کے لیے ہیں۔ مسلمان صدیوں سے اونٹ اور گھوڑے پر یہ کہہ کر سواری کرتے رہے ہیں کہ: **سبحان الذی سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين**۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس دعا کا نیا استعمال دریافت کریں۔ وہ صنعتی دور کی طاقتوں کو کلمۂ اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کرنے کا ثبوت دیں اور اس طرح دنیا اور آخرت میں خدا کی نصرتوں کے مستحق بنیں۔

دارالاسلام، دارالحرب

دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح زمانہ نبوت کے ڈیڑھ سو سال بعد عباسی دور میں بنی۔ یہ الفاظ قرآن اور حدیث میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ دونوں اصطلاحیں مبتدعانہ اصطلاحیں تھیں۔ ان کو قرآنی اصطلاح یا مسنون اصطلاح نہیں کہا جا سکتا۔

فقہاء کے نزدیک دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جو مسلمانوں کے لیے معاند ملک کی حیثیت رکھتا ہو، جس سے مسلمان امکانی طور پر جنگ (potentially at war) کی حالت میں ہوں۔ یہ دونوں اصطلاحیں ذاتی قیاس کے تحت بنائی گئیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ اتنی اہم اصطلاح خالص قرآن کی روشنی میں بنائی جائے۔

اس نظر سے قرآن کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ دو قسم کے علاقوں کے اس فرق کو بتانے کے لیے زیادہ درست الفاظ دوسرے ہیں۔ اور وہ دارالخوف اور دارالامن کے الفاظ ہیں۔ اس رائے کا ماٴخذ قرآن کی وہ آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

> اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن کی حالت سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی بھی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔ (النور۔ ۵۵)

قرآن کی اس آیت کے مطابق، دور اول کے مسلمان اپنے ابتدائی دور میں خوف کی حالت میں تھے۔ پھر اللہ نے ان کو امن کی حالت میں پہنچا دیا۔ یعنی وہ پہلے دارالخوف میں رہ رہے تھے، پھر اللہ نے ان کو دارالامن عطا فرمایا۔

وسیع تر تقسیم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دار الخوف سے مراد بنیادی طور پر وہ زمانہ ہے جس کو سیرت کی کتابوں میں مکی دور کہا جاتا ہے اور دار الامن سے مراد بنیادی طور پر وہ زمانہ ہے جس کو سیرت کی کتابوں میں مدنی دور کہا گیا ہے۔ گویا کہ وہ چیز جس کو بعد کے فقہاء نے دار الحرب سے تعبیر کیا، اس کو قرآن میں دار الخوف کہا گیا تھا۔ اس طرح ان فقہاء نے جس حالت کو دار الاسلام سے تعبیر کیا، اس کے لیے قرآن میں دار الامن کا لفظ استعمال کیا گیا۔

مذکورہ حالت اسلام کے ظہور کے تقریباً بیس سال بعد تک رہی۔ اُس کے بعد خدا کی مزید عنایت ہوئی۔ پیغمبر اسلام کے آخری زمانہ میں وہ اہم اعلان کیا گیا جو قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں موجود ہے۔ اُس کا ترجمہ یہ ہے:

آج انکار کرنے والے لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم اُن سے نہ ڈرو، اور تم صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ (المائدہ ۳)

قرآن کی یہ آیت اس بات کا ایک خدائی اعلان ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل کے بعد دنیا میں ایک ایسا انقلاب آیا ہے جس نے ہمیشہ کے لیے اس امکان کو ختم کر دیا ہے کہ زمین کا کوئی حصہ اہلِ اسلام کے لیے دوبارہ دار الخوف بن جائے۔ اب قیامت تک کے لیے اہل اسلام امن کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب ساری دنیا میں اہلِ اسلام کے لیے ایک ایسا دور آ چکا ہے جس میں اُن کے لیے خشیت انسانی کا مسئلہ باقی نہیں رہا۔ اب انسانی تاریخ خشیت الٰہی کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ گویا اب ساری دنیا ہمیشہ کے لیے دار الامن ہے، اب وہ اہل اسلام کے لیے کبھی دار الخوف بننے والی نہیں۔ اب اہل اسلام کا کام یہ ہے کہ وہ حاصل شدہ مواقع کو استعمال کریں، نہ کہ وہ مفروضہ خوف کے نام پر اہل عالَم سے بے فائدہ لڑائی چھیڑ دیں۔

اب مسلمانوں کو یہ نہیں کرنا ہے کہ وہ دار الاسلام یا دار الامن قائم کرنے کے نام پر غیر مسلم قوموں سے لڑائی کریں۔ اس کے برعکس اب اہل اسلام کو یہ کرنا ہے کہ وہ ہر حال میں دار الامن

کے محافظ بنے رہیں۔ اب مسلمانوں کو اُس نادانی سے بچنا ہے جس کا ذکر حدیث میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

عن حذيفة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: لا ينبغی لمسلم ان يذل نفسه، قيل و كيف يذل نفسه قال يتعرض من البلاء لما لا يطيق

(مسند احمد، ۵/۴۰۵)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلم کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ خود اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو کیسے ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسی بلا سے تعرض کرے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔

قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق، دنیا کا ہر ملک اب اہلِ اسلام کے لیے دار الامن بن چکا ہے۔ دار الامن سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پُر امن دینی عمل کے مواقع موجود ہوں۔ اب جب کہ خُدا نے تمام دنیا کو مسلمانوں کے لیے دار الامن بنا دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اہلِ اسلام کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنا ملّی اور دینی عمل مکمل طور پر امن کے حدود میں رہتے ہوئے انجام دیں۔ اب اُن کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ پُر امن طریقِ کار کو چھوڑ کر پُر تشدد طریقِ کار اختیار کریں۔

پُر امن طریقِ کار کی یہ فرضیت صحیح البخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ نے پیغمبر اسلام کی عمومی پالیسی کو بتاتے ہوئے کہا: **ما خيّر رسول الله صلی الله عليه وسلم بين أمرين الا اختار ايسرهما** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ اختیار فرماتے)۔

اس حدیث کے مطابق، پُر تشدد طریقِ کار ایک مشکل طریقِ کار ہے اور پُر امن طریقِ کار ایک آسان طریقِ کار۔ اب سنّت رسول کی پیروی میں اہلِ اسلام کو یہ کرنا ہے کہ وہ پُر تشدد طریقِ کار سے مکمل طور پر بچیں، اور پُر امن طریقِ کار پر سختی کے ساتھ کار بند رہتے ہوئے اپنا دینی اور ملّی مقصد حاصل

کریں۔ اب پُر تشدد طریقِ کار کو استعمال کرنا سنتِ رسول کی کھلی خلاف ورزی ہے، اور جو لوگ سنتِ رسول کی خلاف ورزی کریں وہ کبھی فلاح پانے والے نہیں۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات حتمی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے جس متشددانہ سلوک کا تجربہ ہو رہا ہے وہ دوسری قوموں کے ظلم کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اُس کا سبب تمام تر یہ ہے کہ مسلمانوں نے سنتِ رسول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ کیا کہ اُنہوں نے پُر امن طریقِ کار کو چھوڑ کر پُر تشدد طریقِ کار کو اختیار کر لیا۔ اب وہ جس ہلاکت کا تجربہ کر رہے ہیں اُس کا سبب خود اُن کا مسنون طریقِ کار سے انحراف ہے، نہ کہ کسی مفروضہ دشمن کی طرف سے سازش یا ظلم کا معاملہ۔

دارالاسلام، دارالکفر، دارالحرب

اسلام میں، قرآن وحدیث کے بعد، فقہ کو شریعت کا تیسرا ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم فقہ ایک استنباطی یا اجتہادی علم ہے نہ کہ مبنی بروحی علم۔ فقہ کی تدوین رسول اور اصحاب رسول کے بعد عباسی خلافت کے زمانہ میں ہوئی۔ اس دور کے فقہاء نے قرآن وحدیث سے استنباط کر کے جوئی اصطلاحیں وضع کیں ان میں سے تین اصطلاحیں یہ تھیں دارالإسلام، دارالکفر اور دارالحرب۔

فقہاء نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق، دارالاسلام، دارالکفر اور دارالحرب کی ذیلی تقسیمات بھی کی ہیں اور اس طرح ہر ایک دار کو کئی دار کی صورت میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ ذیلی تقسیمات ہمارے نزدیک اضافی ہیں۔ ہم نے ذیلی تقسیمات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس مقالہ میں صرف بنیادی تقسیم کو سامنے رکھا ہے اور اس سہ گانہ تقسیم کے اعتبار سے ہر ایک کے شرعی احکام بیان کئے ہیں۔

عباسی دور کے جن فقہاء نے یہ اصطلاحیں بنائیں ان میں سے ہر فقیہہ کو بعد کے علماء نے مجتہد مطلق کا درجہ دے دیا تھا۔ اس لیے پچھلے ہزار سال میں کسی نے ان اصطلاحات کی صحت پر سوال نہیں اُٹھایا۔ لیکن اگر کھلے ذہن کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فقہاء کی یہ اصطلاحات یقینی طور پر روح اسلام کے مطابق نہ تھیں۔

فقہاء کی بنائی ہوئی یہ اصطلاحیں قرآن وسنت میں موجود نہ تھیں۔ فقہاء نے اپنے حق اجتہاد کو استعمال کرتے ہوئے بطور خود ان اصطلاحوں کو وضع کیا۔ مگر یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اجتہاد کی کچھ شرطیں ہیں۔ جائز اجتہاد وہی ہے جس میں یہ شرطیں پوری طرح پائی جاتی ہوں۔ جس اجتہاد میں یہ شرطیں نہ پائی جائیں وہ یقینی طور پر غلط اجتہاد قرار پائے گا۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ: **المجتهد يخطی ويصيب** (مجتہد کا اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی)۔

اجتہاد شریعت کا ایک اصول ہے۔ علماء نے عام طور پر مانا ہے کہ اجتہاد کے اصول کا شرعی ماخذ وہ حدیث ہے جو صحابیٔ رسول معاذ بن جبل کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے۔ وہ حدیث یہ

ہے: عن معاذ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين بعثه إلى اليمن فقال كيف تصنع إن عرض لك قضاء قال أقضي بما في كتاب الله قال فإن لم يكن في كتاب الله قال فبسنة رسول الله قال فإن لم يكن في سنة رسول الله قال اجتهد رائي و لا آلو قال فضرب رسول الله صدى ثم قال الحمد لله الذي وفق رسول الله لما يرضي رسول الله (ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ، الترمذی، کتاب الاحکام، النسائی، کتاب القضاۃ، ابن ماجہ، کتاب المناسک، مسند احمد ۵/ ۲۳۰)

معاذ بن جبل کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں یمن بھیجا تو اُن سے کہا کہ اگر تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش آئے تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ میں خدا کی کتاب کے مطابق، فیصلہ کروں گا۔ فرمایا کہ اگر تم خدا کی کتاب میں نہ پاؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ کی سنت کی رو سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا کہ اگر تم رسول اللہ کی سنت میں نہ پاؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی نہیں کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس اللہ کا شکر ہے کہ جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

علماء اور فقہاء کے نزدیک یہی حدیث اصولِ اجتہاد کا بنیادی ماخذ ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم کے لیے اجتہاد کرنا کب جائز ہے۔ وہ اُس وقت جائز ہے جب کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی سنت میں زیر بحث مسئلہ کے بارے میں کوئی رہنمائی موجود نہ ہو۔ اگر کتاب وسنت میں متعلقہ مسئلہ کے بارہ میں واضح رہنمائی موجود ہو تو اجتہاد کرنا جائز نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن سے ثابت ہے کہ روزہ رمضان کے مہینہ میں مقرر کیا گیا ہے۔ اب روزہ کے مہینہ کے بارہ میں کسی کے لیے کوئی نیا اجتہادی حکم وضع کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں۔ ایسی حالت میں کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ فرض نمازوں کی تعداد کے بارہ میں اجتہاد کر کے اُس میں کمی یا بیشی کرے۔

اس اُصول کی روشنی میں دیکھئے تو دارالاسلام اور دار الکفر اور دار الحرب کی اصطلاحوں کے بارے میں کتاب وسنت میں واضح رہنمائی موجود ہے۔ ایسی حالت میں کسی عالم یا فقیہہ کے لیے یہ درست نہیں کہ اس رہنمائی کے باوجود وہ اس معاملہ میں اجتہاد کر کے بطور خود نئی اصطلاحیں وضع کرے۔

فقہاء نے جن حالات کی نشاندہی کر کے ان کے تسمیہ (nomenclature) کے لیے یہ تین بنیادی اصطلاحیں وضع کی ہیں وہ حالات مبینہ طور پر دور نبوت میں موجود تھے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات کے لیے فقہاء جیسی اصطلاحیں مقرر نہیں فرمائیں۔ ایسی حالت میں اصطلاح سازی کا یہ معاملہ اجتہادی اجازت سے خارج قرار پائے گا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں عین اُس نوعیت کے حالات تھے جن حالات کے حوالہ سے بعد کو فقہاء نے دار الکفر کی اصطلاح وضع کی۔ یعنی فقہاء کی تقسیم کے مطابق، بعثت سے لے کر ہجرت تک کا مکہ حکماً دار الکفر کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر نہ قرآن میں اور نہ حدیث میں ایسا کوئی حوالہ موجود ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ قبل از ہجرت دَور (pre-migration period) کے لیے دار الکفر کی اصطلاح مقرر کی گئی۔

رسول اللہ کی ہجرت کے بعد اہل مکہ نے کھلے طور پر آپ کے خلاف مسلّح کارروائی شروع کر دی۔ اس طرح ہجرت کے بعد مسلمان اور اہلِ مکہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ جنگ (at war) ہو گئے۔ گویا ہجرت کے بعد (post-migration) مکہ میں عین وہی حالت پیدا ہو گئی جس کو ایک نام دینے کے لیے بعد کے فقہاء نے دار الحرب کی اصطلاح وضع کی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، قرآن وحدیث میں بعد از ہجرت مکہ کے لیے کبھی ایسی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ نہ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ مکہ اب دار الحرب ہو چکا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اُس وقت کے مکہ کے لیے دار الحرب کا لفظ استعمال فرمایا۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہجرت کے بعد مدینہ میں پیغمبر اسلام کی سربراہی میں مسلمانوں کی وہ اجتماعی تنظیم قائم ہو گئی جس کو اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہجرت کے بعد مدینہ میں عین وہی حالت

پیدا ہوگئی جس کو بتانے کے لیے فقہاء دار الاسلام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ مگر اب بھی ایسا نہیں ہوا کہ قرآن میں اُس وقت کے مدینہ کے لیے دار الاسلام کا لفظ استعمال کیا جائے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کے مدینہ کو کبھی دار الاسلام کا لقب عطا فرمایا۔ قرآن میں جنت کے لیے دارالسلام (یونس ۲۵) کا لفظ آیا ہے مگر کسی زمینی خطہ کے لیے دار الاسلام یا دار الایمان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قرآن میں منکرین حق کی اخروی قیام گاہ دارالبوار (ابراہیم ۲۸) کہا گیا ہے۔ مگر کسی زمینی خطہ کو قرآن میں دار الکفر یا دار الکفار نہیں کہا گیا۔ گویا کہ فقہاء کی تقسیم کے مطابق، دارالاسلام، دار الکفر اور دار الحرب جیسے حالات کی موجودگی کے باوجود یہ جائز نہیں کہ ان کو بتانے کے لیے درالاسلام، دار الحرب یا دار الکفر کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ یہ اصطلاح سازی ایک بدعت ہے، نہ کہ سنت۔

مذکورہ تجزیہ واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ فقہاء نے جن ارضی تقسیمات کو بتانے کے لیے دار الاسلام اور دار الکفر اور دار الحرب کی اصطلاحیں وضع کیں، وہ تقسیمات خود زمانۂ نبوت میں عملاً ظہور میں آچکی تھیں۔ مگر ان کو بتانے کے لیے کتاب وسنت میں ان سہ گانہ اصطلاحوں کا استعمال نہیں کیا گیا۔ ایسی حالت میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ عباسی دور کے فقہاء نے ان اصطلاحوں کو وضع کرنے میں حدود اجتہاد سے تجاوز کیا۔ فقہاء نے ایک ایسے معاملہ میں اجتہاد کیا جس کے لیے انہیں شرعی طور پر مجاز نہیں کیا گیا تھا۔

ایسی حالت میں محتاط طور پر صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہاء کی یہ اصطلاح سازی اجتہادی خطا کا ایک واقعہ تھا، وہ یقینی طور پر اجتہادی صحت کا واقعہ نہ تھا۔ ایسی حالت میں اسلام کے ایک طالبِ علم کو جائز طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس اجتہاد کو تسلیم نہ کرے۔ اگر شرعی زبان استعمال کی جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ ایک اصطلاحی بدعت تھی اور وہ بہر حال اس قابل ہے کہ اس کو رد کر دیا جائے۔ کیوں کہ حدیث میں واضح طور پر آیا ہے کہ: من أحدث في أمرنا هذا ماليس منه فهو رد (البخاری، مسلم) یعنی جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالے جو اُس میں نہیں ہے تو وہ قابل رد ہے۔

دار الاسلام اور دار الکفر اور دار الحرب کی اصطلاحات بطور خود وضع کرنے کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، یہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو عالمی طرز فکر (world view) سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے ذہنی رخ کو متعین کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پوری سوچ کی تشکیل کرنے والا ہے۔ وہ مسلمانوں کے اندر شعب اللہ المختار (chosen people) کا ذہن بناتا ہے۔ یہ ذہن کسی قوم کے تنزل کی علامت ہے، اور جیسا کہ معلوم ہے، یہ ذہن یہودیوں میں اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہ تنزل کا شکار ہو چکے تھے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا انسانی معاشروں کو دار الاسلام اور دار الکفر اور دار الحرب میں تقسیم کر کے نہیں دیکھتا۔ خدا تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور ایک ہی اصول کی روشنی میں وہ تمام انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن میں مسلمانوں کے اس ذہن کی سختی سے تردید کی گئی ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں خدا کے زیادہ محبوب بندے ہیں۔ (المائدہ ۱۸)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کے یہاں کسی شخص کی قدر و قیمت نسلی تعلق سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذاتی عمل سے متعین ہوتی ہے (النجم ۳۹) قرآن میں مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ بریکیٹ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: **لیس بأمانیکم و لا أمانی أهل الکتاب من یعمل سوءًا یجز به** (النساء ۱۲۳) یعنی نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ گروہی فضیلت یا گروہی نجات کا تصور قرآن میں ایک اجنبی تصور ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا مطالعہ کافی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اس نے نیک کام کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (البقرہ ۶۲) یعنی مسلم گروہ، مسیحی گروہ، یہودی گروہ سب گروہی اعتبار سے خدا کے نزدیک یکساں ہیں۔ خدا کی عدالت میں کامیابی کا

فیصلہ گروہی تعلق کی بنیاد پرنہیں ہوگا بلکہ حقیقی کردار کی بنیاد پر ہوگا۔

اس طرح کے قرآنی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ صحیح اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانوں کو خدا کی نسبت سے (God vs man) دیکھا جائے نہ کہ مسلم ورسز نان مسلم کی نسبت (Muslim vs non-Muslim) کی نسبت سے۔ کسی کا جو مقام خدا کی نسبت سے متعین ہو وہی اس کا مقام ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی مسلمانوں کی نسبت سے دوسرے انسانوں کا مقام (status) متعین کرنا ایک قومی نقطۂ نظر ہے، اس کا قرآن یا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے خلاف ہے۔ کیوں کہ خدا نے یہ دنیا سارے انسانوں کے لیے بنائی ہے، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔

قرآن میں خدا جب لوگوں کو خطاب کرتا ہے تو وہ بار بار ایھا الانسان اور ایھا الناس جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ایسی حالت میں قرآن کی روشنی میں دار کا تعین کرنا ہو تو کہا جائے گا کہ ساری دنیا دار الانسان ہے۔ ایک طرف خدا ہے اور دوسری طرف تمام انسان۔

مذکورہ اصطلاح سازی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر وہ تفریقی نظریہ پیدا ہوا جس کو ہم اور وہ (we and they) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت مسلمان انسانی تاریخ کو صرف اپنے ریفرنس میں دیکھنے لگے۔ وہ اپنی نسبت سے دوسروں کا درجہ متعین کرنے لگے۔ ایک کو انہوں نے مسلم قوم کہا اور دوسرے کو انہوں نے کافر قوم قرار دیا۔ اب یہ ہوا کہ جو لوگ ان کے اپنے ہم مذہب (co-religionist) تھے ان کو انہوں نے اپنا سمجھا اور جو لوگ دوسرے مذہب پر قائم تھے ان کو انہوں نے غیر (other) کی حیثیت دے دی۔ اپنے سوا جو دوسرے لوگ تھے وہ ان کے لیے یا تو ''کافر'' بن گئے یا امکانی دشمن (potential enemy)۔ قرآن کی ساری بشارتیں انہوں نے اپنے خانہ میں لکھ لیں اور قرآن کی ساری وعیدیں انہوں نے دوسروں کے خانہ میں ڈال دیں۔

انسانیت کا درجہ مسلمانوں کے حوالے سے مقرر کرنے کا یہ طریقہ سراسر قرآن کے خلاف تھا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انسانیت کا درجہ خدا کی نسبت سے متعین کرتا ہے۔

فقہاء نے دار کی جو تقسیم کی اس نے تاریخ بشری کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نظر پیدا کیا۔ اس کے مطابق، سارا معاملہ مسلم ورسس نان مسلم کا معاملہ بن گیا۔ مگر قرآن کے مطابق، یہ معاملہ خدا ورسس انسان کا معاملہ ہے۔

بعد کے زمانہ میں دار کی نسبت سے بننے والی اس غلط تقسیم نے مسلمانوں کے طرز فکر کو نہایت گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کے بعد بننے والی پوری مسلم تاریخ میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ تقریباً سب کی سب مسلم اورینٹڈ سوچ کے تحت لکھی گئیں۔ سید رشید رضا کی کتاب **لماذا تأخر المسلمون و تقدم غیرهم** اور سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین** کے ٹائٹل اسی طرز فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

میرے علم کے مطابق، ہزار سال کی مسلم تاریخ میں عبد الرحمٰن ابن خلدون کی کتاب (مقدمہ ابن خلدون) کو چھوڑ کر غالباً کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جو حقیقی معنوں میں انسان اورینٹڈ سوچ کے تحت لکھی گئی ہو۔ اس مدت میں غیر مسلموں کو ایڈریس کرنے کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب مناظرہ کے اصول پر لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر ابن تیمیہ کی کتاب "**الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح**" اور مولانا قاسم نانوتوی کی کتاب **اظهار الحق**، وغیرہ۔ بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی کتابوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ انسانیت عامہ مسلمانوں کا کنسرن ہی نہیں۔

بعد کے زمانہ میں قرآن اور حدیث کی جو شرحیں لکھی گئیں وہ بھی بعد کو پیدا ہونے والی اس فکر سے متاثر نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں خیر امت (آل عمران ۱۱۰) کا لفظ آیا ہے۔ بعد کی تفسیروں میں اس لفظ کو مسلم کمیونٹی کا گروہی لقب سمجھ لیا گیا۔ چنانچہ یہ کہا جانے لگا کہ مسلمان خیر الامم ہیں: **انهم خیر الامم** (ابن کثیر، ۱/۳۹۱) اسی بات کو حالی نے اس طرح نظم کیا ہے:

وہ امت، لقب جس کا خیر الامم تھا

حالاں کہ قرآن کی اس آیت میں خیر امت سے مراد کوئی نسلی گروہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صفاتی گروہ ہے۔ اس آیت میں "خیر" کی بشارت ان افراد کو دی گئی ہے جو اس کی مطلوب صفات سے

متصف ہوں۔ چنانچہ عمر فاروق نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: **من فعل فعلهم كان مثلهم** (القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۷۰/۴) یعنی جو ان کے جیسا عمل کرے گا وہ اُن کے مانند ہوگا۔ گویا خیر امت کا مدار کردار پر ہے، نہ کہ کسی نسلی گروہ پر۔

اسی طرح سورہ الفاتحہ میں **الضالین** اور **المغضوب علیهم** کا مصداق عیسائیوں اور یہودیوں کو قرار دے دیا گیا۔ حالاں کہ یہ شخصی کردار کی بات ہے اور اس کا تعلق تمام انسانوں بشمول مسلمانوں سے ہے، نہ کہ کسی مخصوص مذہبی گروہ سے۔

حدیث کی شرحوں میں بھی اس کا اثر پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر روایات میں آیا ہے کہ مدینہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ آپ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر آپ کھڑے ہو گئے۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ: **أليست نفساً**۔ یعنی کیا وہ انسان نہیں:

Was he not a human being.

یہ واقعہ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازة يهودي کے تحت آیا ہے۔ پیغمبر اسلام کا یہ عمل واضح طور پر بتاتا ہے کہ ہر انسان عزت اور احترام کے قابل ہے، خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو۔ اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا یہ طریقہ ہے کہ ہر انسان کو اپنے جیسا انسان سمجھو۔ انسان کو دیکھ کر یہ یاد کرو کہ جس خدا نے مجھ کو پیدا کیا ہے اسی خدا نے اس دوسرے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ انسان کو دیکھ کر خدا کے تخلیقی کرشموں کو یاد کرے۔ کسی انسان کا مشاہدہ اس کے لیے خدا سے تعارف کا ذریعہ بن جائے۔

یہ روایت بلاشبہہ احترام انسانیت کے بارہ میں پیغمبر اسلام کی سنت کو بتاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ حدیث کے شارحین میں سے کسی کو اس واقعہ میں احترام انسانیت کا سبق نہیں ملا۔ اس کے برعکس لوگوں نے اس سنتِ رسول کی تشریح میں عجیب وغریب باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قیام واجب نہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ آپ موت کی فزع کو یاد کر کے کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا

کہنا ہے کہ آپ کا یہ قیام ایک اضطراری قیام تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ملائکہ کے احترام میں کھڑے ہوگئے جو جنازہ کے ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ملک الموت کو یاد کر کے کھڑے ہوگئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جنازہ کے ساتھ بخور کی بو کی وجہ سے آپ بطور کراہت کھڑے ہوگئے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ اس لیے کھڑے ہوگئے کہ جنازہ آپ کے سر کے اوپر سے نہ گذرے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ وقتی بیان جواز کے لیے کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتداء میں آپ نے قیام فرمایا تھا مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور اب وہ مسلمانوں سے مطلوب نہیں، وغیرہ۔ (ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، جلد ۳، صفحہ ۲۱۴۔۲۱۶)

یہ تشریحات بلاشبہہ نادرست ہیں۔ مگر مخصوص منطقی سٹ کی بنا پر شارحین کو اس کا احساس نہیں ہوا کہ وہ سنتِ رسول کی ایسی تشریح کر رہے ہیں جو نعوذ باللہ سنت کی تصغیر کے ہم معنٰی ہے۔ یہ سلسلہ آج تک بدستور جاری ہے۔ موجودہ زمانہ میں پرنٹنگ پریس اور میڈیا کے بعد مسلمانوں کے درمیان بے شمار نئی سرگرمیاں جاری ہوئیں۔ کتابوں اور جرائد کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ مسلمانوں نے ان گنت سرگرمیاں جاری کیں۔ مگر یہ تمام سرگرمیاں براہ راست یا بالواسطہ طور پر سابق روش کا امتداد (continuation) تھیں۔ ان سرگرمیوں سے مسلمانوں کے اپنے قومی ذہن کو تو غذا ملی مگر غیر مسلموں کے لیے ان میں کوئی مثبت مواد موجود نہ تھا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک تازہ مثال نقل کروں گا۔ حال میں ایک مسلم ملک میں ایک قرآن ٹی وی قائم ہوا ہے جس کو عام طور پر کیوٹی وی (QTV) کہا جاتا ہے۔ یہ کیو ٹی وی یا قرآن ٹی وی مسلمانوں کے درمیان بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ ٹی وی اگر چہ قرآن کے نام پر قائم کیا گیا ہے مگر حقیقتاً وہ صرف مسلم کمیونٹی کی نفسیات کو غذا پہنچانے والا ہے، وہ غیر مسلم ذہن کو ایڈریس نہیں کرتا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کا کمیونٹی ٹی وی ہے نہ کہ قرآن ٹی وی۔

نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمز (۴ دسمبر ۲۰۰۴) میں انڈیا کے معروف صحافی مسٹر خشونت سنگھ کا تبصرہ اس موضوع پر چھپا ہے جس کا عنوان ہے: Spreading Islamophobia

اس عنوان کے تحت مسٹر خشونت سنگھ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

About the most disturbing phenomenon of the past decade is the widening divide between the Islamic and non-Islamic world...... I looked forward to the Pakistani channel, Q (Qur'an) TV, to take the lead in this direction. I made it a point to tune in every afternoon to see and hear how it was going about its mission. I was sorely disappointed. I expected it would address itself to non-Muslim audiences among which wrong notions about Islam persist. I found it focused intirely on Muslims to assure them that their faith was better than any other and anyone who disagreed is an ignoramus. (p. 10)

انڈین جرنلسٹ کے مذکورہ الفاظ تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں پر صادق آتے ہیں۔ بعد کے زمانہ میں بننے والا یہ مزاج واحد سبب تھا جس کی بنا پر مسلمانوں کے اندر دعوت کا نشانہ سرے سے مفقود ہو گیا۔ مسلم اورینٹڈ تھنکنگ مسلمانوں کو مسلم فرینڈلی بناتی ہے۔ جب کہ انسان اورینٹڈ تھنکنگ مسلمانوں کو انسان فرینڈلی بنانے والی ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوا کہ مسلمان دعوہ ورک اور کمیونٹی ورک کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ کمیونٹی ورک کرتے ہیں اور اس کو دعوہ ورک کا نام دے دیتے ہیں۔

یہ سلسلہ بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔ فقہ، احکام وشریعت کا بیان ہے۔ فقہ کے موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ مگر ان کتابوں میں دعوت اور تبلیغ کا باب سرے سے موجود نہیں۔ اسی طرح الغزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی، محمد اقبال اور دوسرے تمام مسلم مصنفین کی کتابیں دعوت کے تصور سے خالی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ فقہی تصور کے مطابق، مسلمانوں کے لیے غیر مسلم عملاً جہاد کا موضوع بن گئے، وہ اُن کے لیے سرے سے دعوت کا موضوع نہ بن سکے۔

اس غیر فطری طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم امت ایک طرف فکری جمود کا شکار ہوگئی اور دوسری طرف وہ دوسری قوموں کے لیے صرف ایک حریف گروہ بن کر رہ گئی۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق ختم ہو گیا۔ اس کے بجائے دونوں کے درمیان حریف اور رقیب کا تعلق قائم ہو گیا۔

فقہاء نے دار کی جو تقسیم کی ہے اس کے مطابق، انہیں دکھائی دیا کہ کوئی ملک یا تو دار الاسلام ہوگا یا دار الحرب ہوگا۔ اس معاملہ میں ان کی یہ تقسیمی سوچ اس حد تک پہنچی کہ اکثر فقہاء نے یہ کہا کہ غیر مسلم حکومت میں اگر اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہو تب بھی وہ دار الحرب ہی رہے گا۔ ان فقہاء کے اندر اگر دعوت و تبلیغ کا شعور ہوتا تو وہ جانتے کہ یہاں ایک تیسری مطلوب صورت بھی موجود ہے، اور وہ دار الدعوہ ہے۔

دار الحرب کا لفظ غیر مسلموں کے لیے ایک قابلِ اعتراض لفظ ہے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ میں دار الحرب کا تصور لے کر مسلمان کسی سماج میں معتدل انداز میں نہیں رہ سکتے۔ یہ عجیب وغریب صورت اس لیے پیش آئی کہ قدیم فقہاء صرف دو قسم کے دار سے واقف تھے۔ اگر وہ اسلام کی دعوتی تعلیمات کو سمجھتے تو وہ بہت آسانی سے جان لیتے کہ دوسرے ممالک مسلمانوں کے لیے دار الدعوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ دوسرے ملکوں میں ہمیشہ دعوت کے مواقع موجود رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی ملک اگر قدیم مکہ کی طرح اہل توحید کا مخالف بن جائے تب بھی وہ بدستور دار الدعوہ بنا رہے گا۔ کسی ملک کی کوئی بھی حالت اس کی دار الدعوہ کی حیثیت کو ختم نہیں کرتی، جیسا کہ قرآن میں انبیاء کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔

اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ساری دنیا انسانی قیام گاہ کے اعتبار سے دار الانسان ہے اور اسلامی مِشن کے اعتبار سے دار الدعوہ۔ جن ملکوں کو دار الاسلام کہا جاتا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے دار المسلمین تو ہو سکتے ہیں مگر دار الاسلام نہیں۔

قرآن میں پیغمبر کو ناصح (الأعراف ٦٨) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنی مخاطب قوم کا خیر خواہ۔ گویا پیغمبر ناصح (خیر خواہ) ہے اور اس کی مخاطب قوم منصوح ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کی خیر خواہی کی جائے۔ اسی تعلق کو قرآن میں شاہد اور مشہود (البروج ٣) کہا گیا ہے۔ اس تعلق کو دوسرے الفاظ میں داعی اور مدعو کہہ سکتے ہیں۔

مسلمان ختم نبوت کے بعد، ذمہ داری کے اعتبار سے نبی کے قائم مقام (الحج ٧٨) ہیں۔ اس

لیے ان کا معاملہ بھی دوسری قوموں کے مقابلہ میں ناصح اور منصوح یا داعی اور مدعو کا ہے۔ یہ نسبت مسلمانوں کے اخلاقی کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ داعیانہ نفسیات کا تقاضا ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کے مقابلہ میں یک طرفہ طور پر حُسن کردار کی پابندی کریں۔ حتیٰ کہ وہ مدعو اقوام کی ایذاؤں پر صبر کریں (ابراہیم ۱۲) تا کہ دونوں کے درمیان دعوت کا ماحول باقی رہے۔

یہ داعیانہ کردار بلا شرط مطلوب ہے۔ اس یکطرفہ کردار کا تعلق جس طرح عوام سے ہے اسی طرح اس کا تعلق حکومت کے ذمہ داروں، پارٹیوں کے لیڈروں، میڈیا کے افراد اور دوسرے تمام سماجی طبقوں سے بھی ہے۔ مگر فقہ کی مذکورہ طبقاتی تقسیم نے اس تعلق کو توڑ دیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے دل میں دوسری قوموں کے خلاف شکایت اور نفرت کے جذبات بھر گئے۔ جب کہ مدعو ہونے کی حیثیت سے اُن کے ساتھ شکایت اور نفرت کا تعلق رکھنا اُن کے لیے جائز ہی نہ تھا۔

یہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس پورے معاملہ کا ازسرِنو جائزہ (re-examine) لیا جائے۔ ازسرِنو جائزہ سے کم تر کوئی چیز اس مسئلہ کا حل نہیں بن سکتی۔

یہ بلا شبہہ ایک بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ جب مسلم کمیونٹی کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہو جائے تو اس کے ساتھ بہت سے کمرشیل انٹرسٹ جڑ جاتے ہیں۔ اب ایک وسیع مسلم مارکیٹ وجود میں آجاتا ہے جس طرح یوروپین مارکیٹ اور ایشین مارکیٹ جیسے مارکیٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس مرحلہ میں پہنچ کر وہ مواقع پیدا ہو جاتے ہیں جب کہ دین کے نام پر دنیوی فائدے حاصل کیے جاسکیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں یہود کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: **لاتشتروا بآیاتی ثمنا قلیلاً** (البقرہ ۴۱)۔

موجودہ زمانہ میں مسلم دنیا اسی قسم کا ایک وسیع مارکیٹ بن چکی ہے۔ تسبیح اور مصلّی سے لے کر لٹریچر اور اسٹیج سب اس میں قیمتی سامانِ فروخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ بھی مسلمانوں کے قومی جذبات کو فیڈ کریں وہ ان کے اندر اپنا عظیم بزنس ایمپائر کھڑا کر سکتے ہیں۔

طویل مدت کے اندر بنے ہوئے اس ذہن کی تصحیح دراصل تجدید (revival) کا کام ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: من أحیا سنة امیتت بعدی فله اجر مأة شهید (جس نے میرے بعد میری کسی مردہ سنت کو زندہ کیا تو اس کے لیے سوشہیدوں کا اجر ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ سو بار لڑ کر شہید ہونا جتنا مشکل کام ہے اتنا ہی مشکل کام یہ ہے کہ کسی قوم کے اندر ایک ایسی سنت رسول کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو صدیوں کے عمل سے گم ہوگئی ہو۔ اس کے لیے نہایت وسیع علم، دوررس منصوبہ بندی، گہری معرفت، حکیمانہ تدبیر، دانش مندی اور صبر کی وافر مقدار ضروری ہے۔ ان شرطوں کو پورا کئے بغیر اس قسم کا تجدیدی کام نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کام وہ ہے جس کو تجدید دین کہا جاتا ہے۔ تجدید کے اس کام کو موثر طور پر انجام دینا لوگوں کے مائنڈ سٹ کو توڑنے کے ہم معنٰی ہے۔ یہ کنڈیشنڈ ذہنوں کی ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو تاریخ کو، ری پراسس کرنے کا طالب ہے۔ یہ ہزار سالہ تاریخ کو حذف کر کے اسلام کے دور اول کی طرف لوٹنا ہے اور اسلام کا مطالعہ دوبارہ اس فریم ورک میں کرنا ہے جو اسلام کے دور اول میں تشکیل پایا تھا۔ امت کی نشأۃ ثانیہ کے لیے یہ کام بلاشبہہ انتہائی حد تک اہم ہے۔

اس صورت حال نے امت کی اصلاح فکر کے کام کو بے حد مشکل بنا دیا ہے۔ جو لوگ اصلاح فکر کے اس مشن کو لے کر اٹھیں ان کو غیر مقبولیت کی قربانی دے کر یہ کام کرنا ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبی للغرباء (صحیح مسلم، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث ۱۵۹) یعنی اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا اور وہ دوبارہ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ شروع کے وقت تھا۔ تو مبارک ہیں وہ لوگ جو اس طرح اجنبی ہو جائیں۔

کفر اور کافر کا مسئلہ

بیسویں صدی میں کمیونسٹ نظریہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا۔ اس کے تحت انسانی سماج کو دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک محنت کش طبقہ (working class) اور دوسرا بورژوا طبقہ۔

بورژوا (bourgeois) ایک فرانسیسی لفظ ہے۔ یہ لفظ اپنے ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے متوسط طبقہ کے لیے بولا جاتا تھا۔ مگر مارکسی فلسفہ کے زیر اثر وہ ایک تحقیری (derogatory) لفظ بن گیا۔ اس نظریہ کے تحت سماج دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک محنت کش طبقہ جو ہر اعتبار سے معصوم طبقہ کی حیثیت رکھتا تھا اور دوسرا بورژوا طبقہ جو مارکسی تصور کے مطابق، سرمایہ دار طبقہ (capitalist class) کے ہم معنیٰ تھا اور جو مارکس کے مطابق، ہر قسم کی سماجی اور اقتصادی برائی کی جڑ تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ کافر کے لفظ کے ساتھ پیش آیا ہے۔ کافر کا لفظ ابتدائی طور پر صرف ایک سادہ مفہوم رکھتا تھا۔ لغوی اعتبار سے کافر کے معنیٰ ہیں، انکار کرنے والا۔ مگر بعد کے زمانہ میں کافر کا لفظ ایک تحقیری لفظ (derogatory word) بن گیا۔ موجودہ زمانہ میں نظری اعتبار سے یہ غالباً مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سب سے بڑا نزاعی مسئلہ ہے جس سے موجودہ زمانہ کے مسلمان دوچار ہیں۔

ایک مثال سے اس معاملہ کی وضاحت ہوگی۔ اقبال کا خاندان پہلے ایک برہمن خاندان تھا۔ بعد کو وہ لوگ اسلام میں داخل ہوگئے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اس شعر میں برہمن زادہ کا لفظ سننے والوں کو برا نہیں لگتا۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے برہمن زادہ اور کافر زادہ دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ لیکن اگر اقبال کے اس شعر کو بدل کر اس طرح کہا جائے:

کہ کافر زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اگر شعر میں ایسی تبدیلی لائی جائے تو تمام اقبال پسند لوگ غصہ ہو جائیں گے۔ کیوں کہ برہمن ایک سادہ لفظ ہے جب کہ کافر استعمال کے اعتبار سے ایک تحقیری لفظ بن گیا ہے۔

کمیونسٹ اور بورژوا کی تقسیم نے بیسویں صدی میں غیر کمیونسٹ دنیا کو کمیونسٹ لوگوں سے متنفر کر دیا تھا۔ یہی معاملہ اب مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے مومن اور کافر کی تقسیم نے غیر مسلم دنیا کو مسلمانوں سے بیزار کر دیا ہے۔ حتی کہ اب اشوک سنگھل اور پروین توگڑیا جیسے لوگ یہ مانگ کرنے لگے ہیں کہ اسلام پر نظر ثانی کرو اور کافر کے لفظ کو اسلام کے لغت سے خارج کرو۔ جب تک اسلام میں یہ ریفارم نہ لایا جائے، مسلم اور غیر مسلم معتدل طور پر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف اشوک سنگھل اور پروین توگڑیا جیسے انتہا پسند لوگوں کا نہیں ہے بلکہ اب وہ خود مسلمانوں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ آج کے صنعتی سماج میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں تعلیم یافتہ مسلمان عام طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ''کافر'' کے رواجی تصور کے ساتھ مشترک سماج میں معتدل طور پر نہیں رہ سکتے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اسلام نے موجودہ زمانہ میں اپنا ریلونس (relevance) کھو دیا ہے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے اسلام کو لے کر وہ آج کے سماج میں عزت کے ساتھ کس طرح رہیں۔

دہلی میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ ان سے اکثر میری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری پیدائش اگر چہ مسلمان کے گھر میں ہوئی مگر اب اسلام پر میرا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا مذہب ڈیموکریسی (جمہوریت) ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام انسانیت کو مومن اور کافر کے دو نامساوی طبقوں میں بانٹتا ہے۔ جب کہ ڈیموکریسی سارے انسانوں کو برابر کا درجہ دیتی ہے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میرے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوگا تو میں اس کے کان میں اذان نہیں دلواؤں گا بلکہ کسی پروفیسر کو بلاؤں گا جو بچہ کے کان میں کہے گا ـــ ڈیموکریسی، ڈیموکریسی، ڈیموکریسی۔

حقیقت یہ ہے کہ کافر کا مسئلہ صرف غیر مسلم لوگوں کا مسئلہ نہیں۔ اب جدید سماج میں وہ بڑے

پیمانہ پر خود مسلمانوں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور اس کے صحیح مفہوم کو سامنے لایا جائے تا کہ اسلام لوگوں کو وقت کا مذہب معلوم ہو اور مسلم اور غیر مسلم دونوں جدید سماج میں معتدل طور پر دوسروں کے ساتھ رہ سکیں۔

گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارا معاملہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ رواجی تصور میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کافر اور غیر مسلم دونوں ہم معنٰی الفاظ ہیں۔ جو لوگ مسلمان نہیں وہ سب کے سب کافر ہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک غلط تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کافر کا لفظ غیر مسلم کے مترادف نہیں:

The word Kafir is not synonymous with non-Muslim.

داعی اور مدعو کا رشتہ

شریعت کے اعتبار سے مسلمان کی حیثیت داعی کی ہے اور غیر مسلم کی حیثیت مدعو کی۔ یہ رشتہ لازم کرتا ہے کہ داعی اپنے مدعو کے ساتھ ہمیشہ معتدل تعلق قائم رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ تاجر کو ہمیشہ کسٹمر فرینڈلی (customer friendly) ہونا چاہئے۔ اسی طرح داعی کا فارمولا یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہمیشہ مدعو فرینڈلی ہو۔

Be always *Mad'u* friendly.

مدعو کے حق میں داعی کے اندر خیر خواہانہ جذبات ہونے چاہئیں۔ اگر داعی کے اندر مدعو کے لیے یہ مطلوب جذبات موجود ہوں تو وہ ہرگز اس کو پسند نہیں کرے گا کہ وہ ایسے الفاظ بولے جس سے مدعو کے دل میں اُس کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر وہ سچا داعی ہے تو اپنے دل میں بھی وہ ایسی بات نہیں سوچے گا۔ دعوت کا جذبہ نفرت کا قاتل ہے۔ داعی کا دل ایک دردمند دل ہوتا ہے۔ ایسے دل کے اندر محبت اور خیر خواہی کے سوا کوئی اور چیز پرورش نہیں پا سکتی۔

قدیم زمانہ میں آرین لوگ جب انڈیا میں آئے تو یہاں کے مقامی لوگوں کو انہوں نے ملیچھ کہا۔ اسی طرح مسیحی علماء نے مسلمانوں کو اپنی کتابوں میں انفڈل (Infidels) لکھا۔ ملیچھ اور انفڈل دونوں تحقیری الفاظ (derogatory words) ہیں۔ کہنے والا ان الفاظ کو بول کر خوش ہوتا ہے مگر جس کے بارے میں یہ لفظ بولا گیا ہے وہ اس کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ

استعمال کئے جائیں جن میں کوئی تحقیری مفہوم (derogatory sense) نہ ہو بلکہ وہ سادہ طور پر صرف اظہار واقعہ کے ہم معنٰی ہو۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں مسلم علماء احتیاط کا پہلو اختیار نہ کر سکے۔ وہ اپنی کتابوں میں اور قرآن کے ترجموں میں کافر کے لیے بے تکلف انفڈل کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن میں قل یا ایھا الکافرون کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

Say thou: infidels (4:535)

دراصل مسلم علماء اور رہنماؤں کی اسی قسم کی غیر احتیاطی باتیں ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سخت تناؤ پیدا ہوگیا ہے جس کا نتیجہ مختلف ناخوشگوار صورتوں میں سامنے آتا رہتا ہے۔

یہی غلطی قرآن کے اُردو اور فارسی مترجمین نے بھی کی ہے۔ قرآن کے بہت سے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ مگر غالباً صرف ایک مترجم (شاہ عبد القادر) کو چھوڑ کر تمام مترجمین نے اس معاملہ میں بے احتیاطی کا انداز اختیار کیا ہے۔ قل یاایھا الکافرون کے کچھ ترجمے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

بگوا ے کافراں	(شاہ ولی اللہ)
کہہ اے کافرو	(شاہ رفیع الدین)
آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے	(اشرف علی تھانوی)
کہہ دو کہ اے کافرو	(ابوالاعلیٰ مودودی)
کہہ دو، اے کافرو	(امین احسن اصلاحی)
تو کہہ، اے منکرو	(شاہ عبد القادر)

اس قرآنی آیت کے تحت اکثر مترجمین نے اسی قسم کے ترجمے کئے ہیں۔ اس آیت میں کافر کا ترجمہ درست نہیں۔ بالفرض وہ خالص لغوی اعتبار سے غلط نہ ہو تب بھی وہ دوسری قوموں کے لیے ایک

قابل اعتراض لفظ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ترجمہ سے احتراز کیا جائے۔ پھر یہ صرف ترجمہ کی بات نہیں، اسی ترجمہ کی بنیاد پر ذہن بنتا ہے اور تقریر و تحریر میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ پوری ملت کی منفی ذہن سازی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ہم اور وہ (we and they) کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اور اس قسم کا تقسیمی ذہن دعوتی اعتبار سے درست نہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، غالباً ایک ہی عالم ہیں جنھوں نے قرآن کے ان الفاظ کا درست ترجمہ کیا ہے اور وہ شاہ عبدالقادر دہلوی ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا اُردو ترجمہ تمام علماء کے نزدیک نہایت مستند مانا گیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ آیت کا ترجمہ 'منکرو' کیا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۹ میں **قل یاایھا الکافرون** (کہو کہ اے منکرو) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ طرزِ خطاب پورے قرآن میں صرف ایک بار اسی ایک سورہ میں استعمال ہوا ہے۔ کافر یا کفار یا **کافرون** کے الفاظ تو قرآن میں متعدد بار آئے ہیں۔ مگر **ایھا الکافرون** جیسے متعین خطاب کی صورت میں اس کا استعمال قرآن میں کسی اور مقام پر نہیں ہوا ہے۔

مفسرین کی رائے کے مطابق، یہاں **الکافرون** میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی وہ ایک گروہ خاص کے لیے مشخص طور پر آیا ہے، نہ کہ عمومی طور پر ہر اُس شخص کے لیے جو مسلم گروہ سے باہر ہو۔ ذیل میں کچھ مفسرین کے اقوال درج کیے جاتے ہیں:

(قل یٰایھا الکافرون) المخاطبون کفرة مخصوصون قد علم الله انهم لایؤمنون (تفسیر النسفی)

و عنی بالکافرین قوماً معینین لا جمیع الکافرین (تفسیر القرطبی)

خطاب لجماعة مخصوصة (تفسیر المظهری)

قل یٰایھا الکافرون ایک مخصوص خطاب ہے، اُس کو عمومی طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی **قل یٰایھا الکافرون** سے مراد ہمیشہ کے لیے صرف قدیم منکرینِ قریش رہیں گے جو پیغمبر اسلام کے معاصر تھے اور پیغمبرانہ اتمام حجت کے باوجود، جنھوں نے پیغمبر کی بات کو ماننے سے انکار کیا۔ زمانۂ نبوت

کے بعد کے لوگوں کو ایھا الانسان کے لفظ سے خطاب کیا جائے گا، نہ کہ ایھا الکافرون کے لفظ سے۔ اب یہی اندازِخطاب ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

کافر کا مفہوم

عربی زبان میں کفر کے معنٰی انکار کے ہیں اور کافر کا مطلب ہے، انکار کرنے والا۔ اسلام کے مطابق، کافر ایک کردار ہے، کافر کسی قوم کا اجتماعی لقب نہیں:

Kafir is an individual character rather than a group title of a certain race or community.

کافر وہ ہے جو منکر ہو (One who refuses to accept)۔ قرآن کے اُردو ترجموں میں سب سے زیادہ صحیح ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی کا مانا جاتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے ترجمۂ قرآن میں کافر کا ترجمہ منکر کے لفظ سے کیا ہے۔ یہی اس لفظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ قرآن کے انگریزی مترجمین اکثر کافر کا ترجمہ اَن بلیور(unbeliever) کے لفظ سے کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اَن بلیور کا مطلب غیر مومن یا غیر معتقد ہوتا ہے۔ جب کہ کافر کا مطلب صرف غیر معتقد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اتمام حجت کے باوجود ماننے سے انکار کرے۔

دوراوّل میں جب قرآن کی ابتدائی آیتیں اتریں تو ان میں پیغمبر کے مخاطبین کو کافر نہیں کہا گیا بلکہ ان کے لیے انسان جیسے الفاظ استعمال ہوئے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

یا ایھا الرسول بلغ ما أنزل الیك من ربك..... والله یعصمك من الناس ۔(المائدہ ٦٧)

اس آیت میں دیکھئے۔ یہاں **یعصمك من الناس** (خدا تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا) کے الفاظ آئے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہاں **یعصمك من الکفار** کا لفظ استعمال کیا جائے۔ قرآن میں کثرت سے اس طرح کی آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہر گروہ کے لیے اصلاً انسان جیسا عمومی لفظ استعمال کیا جائے گا۔ کافر کا لفظ صرف ان افراد تک مخصوص رہے گا جن کے لیے خدا نے خود کافر کا لفظ استعمال کیا ہو۔ کافر کا لفظ ایک خدائی اعلان ہے، وہ انسان کا دیا ہوا خطاب نہیں۔

فعل اور فاعل کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۹ کی پہلی آیت یہ ہے: قل یاایھا الکافرون (الکافرون ۱) اس آیت میں الکافرون سے مراد قدیم مکہ کے منکرین قریش ہیں۔ ان الفاظ میں قریش کے منکرین کے بارہ میں اتمام حجت کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ تم لوگ اللہ کی نظر میں کافر ہو چکے ہو۔ قرآن میں اس طرح تعین اور تشخص کی زبان میں کسی اور گروہ کے کافر ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا۔

قرآن میں دوسرے مقامات پر کفر اور کافر کے الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً فرمایا: فمنکم کافر ومنکم مومن (التغابن ۲) اسی طرح ارشاد ہوا ہے: فمنھم من آمن و منھم من کفر (البقرہ ۲۵۳) ان دوسری قسم کی آیتوں میں فعل کا ذکر ہے مگر مشخص طور پر فاعل کا ذکر نہیں۔ یعنی یہ تو کہا گیا ہے کہ فلاں فعل کا ارتکاب کفر ہے یا فلاں فعل کا ارتکاب کرنے والا خدا کی نظر میں کافر بن جاتا ہے۔ مگر ان دوسری قسم کی آیتوں میں ایسا نہیں کیا گیا ہے کہ کسی گروہ کو مشخص اور متعین کر کے اُس کے بارہ میں یہ اعلان کیا جائے کہ فلاں فلاں گروہ کافر ہیں۔

قرآنی بیان میں اس فرق سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے اور وہ اُصول یہ ہے کہ یہ کہنے کا حق ہر داعی کو ہے کہ فلاں فعل کا ارتکاب کفر ہے۔ مگر یہ حق کسی بھی داعی یا عالم کو نہیں کہ وہ مشخص طور پر یہ اعلان کرے کہ فلاں گروہ یا فلاں قوم کافر ہے۔

ایک متوازی مثال سے اس معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: من ترک الصلاۃ متعمداً فقد کفر۔ دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ بین العبد و بین الکفر ترک الصلاۃ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان جان بوجھ کر مسلسل نماز ترک کرے تو وہ شریعت کے مطابق، کافر ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو لے کر کوئی مصلح اگر یہ کرے کہ وہ عمومی طور پر ترغیب و ترہیب کے انداز میں مسلمانوں کو نماز کی طرف متوجہ کرے اور ترک صلاۃ کی وعید بتائے تو اُس کا ایسا کرنا بالکل جائز ہوگا۔ لیکن اگر کوئی مصلح ایسا کرے کہ وہ نماز نہ پڑھنے والے مسلمانوں کی نام بنام ایک فہرست تیار کرے اور اس فہرست کو لے کر مشخص طور پر یہ اعلان کرے کہ فلاں فلاں مسلمان ترک صلاۃ

کی بنا پر کافر ہو چکے ہیں تو اُس کا ایسا کرنا بالکل غلط ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح کوئی داعی یا مصلح قرآن کی آیتوں کو لے کر یہ مسئلہ بیان کر سکتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کا ارتکاب کرنے سے کوئی شخص اللہ کی نظر میں کافر ہو جاتا ہے۔ لیکن اُس کا ایسا کرنا اپنی حد سے تجاوز ہوگا کہ وہ غیر مسلم افراد یا گروہوں کے نام لے کر یہ اعلان کرے کہ فلاں فلاں غیر مسلم لوگ کافر ہیں۔

اس معاملہ میں فعل اور فاعل کے درمیان فرق کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کہ وہ مشخص طور پر فاعل کا اعلان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان صرف ایک بار قدیم منکرینِ قریش کے بارہ میں کیا ہے جن کے اوپر پیغمبر نے براہ راست اتمام حجت کیا تھا۔ بقیہ انسانوں کے بارہ میں وہ آخرت میں اعلان فرمائے گا۔ ہمارا کام صرف دعوت دینا ہے، نہ کہ لوگوں کے کافر ہونے کا اعلان کرنا۔

کریڈٹ کا مسئلہ

کافر یا منکر کا لفظ بیک وقت دو کردار سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک وہ جس نے کوئی بات پیش کی ہو۔ دوسرا وہ جس نے اس پیش کی ہوئی بات کا انکار کیا ہو۔ ان میں سے ایک کردار کو داعی کہہ سکتے ہیں دوسرے کردار کو مدعو کہہ سکتے ہیں۔

کافر ایک کردار ہے، کافر کسی گروہ کا قومی لقب نہیں۔ کسی گروہ کا کافر قرار پانا ایک بے حد غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس کا مطلب ایک کو انکار کی بنا پر ڈس کریڈٹ (discredit) کرنا اور دوسرے کو اس کے دعوتی عمل کی بنا پر کریڈٹ دینا ہے۔ کریڈٹ اور ڈس کریڈٹ کا یہ معاملہ فتویٰ یا بیان کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ دعوتی محنت کا طالب ہے۔

اس دعوتی محنت کا معیاری نمونہ پیغمبر اسلام کا تیرہ سالہ مکی دور ہے۔ پیغمبر اسلام نے جب مکہ کے لوگوں میں دعوتی کام کا آغاز کیا تو آپ کے خطاب کے الفاظ یہ تھے: یا ایھا الانسان۔ اس طرح تیرہ سال لوگوں کو بحیثیت انسان خطاب کرنے کے بعد جب لوگ جان بوجھ کر انکار پر قائم رہے

تو آخر میں قرآن کی یہ آیت اتری: قل یا ایھا الکافرون اُس وقت بھی یہ ایک براہِ راست خدائی اعلان تھا، نہ کہ خود پیغمبر کا اپنا خطاب۔

اس اصول کے مطابق، ہندستان کے ہندو یا دوسرے ملکوں کے غیر مسلم کی حیثیت اسلامی نقطۂ نظر سے صرف انسان کی ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی کافر یا کفار نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ ہندوؤں اور موجودہ زمانہ کے دوسرے غیر مسلموں پر یہ ضروری شرط پوری نہیں ہوئی کہ انہیں مکّی معیار کی تیرہ سالہ دعوت دی جائے اور وہ پھر بھی انکار کریں۔ اسی طرح اُنہیں منکر قرار دینا بھی درست نہیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو نزاعات ہیں اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے بارے میں جو شکایتیں ہیں وہ سب کی سب قومی اور مادی ہیں۔ یہ تمام تر اسی طرح کے دنیاوی جھگڑے ہیں جو خود غیر مسلم گروہوں میں ایک دوسرے کے خلاف پیش آتے ہیں۔ اِن نزاعات کو کافر اور مسلم کے درمیان دینی نزاع نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کو دو گروہوں کے درمیان دنیوی نزاع کہا جائے گا۔ ان قوموں پر اتمام حجت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان اُن سے ان دنیوی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔

کفر کا تحقق

کسی شخص کے بارے میں کب یہ متحقق (establish) ہوگا کہ وہ منکر یا انکار کرنے والا بن چکا ہے۔ اس سوال کا جواب خود قرآن میں موجود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن کے نزول کا آغاز ۶۱۰ء میں مکہ میں ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ مکہ کے لوگوں تک توحید کی دعوت پہنچاتے رہے۔ اس دعوتی مہم میں آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے مخاطبین کو کافر کہہ کر خطاب کریں۔ اس دوران میں جو آیتیں اتریں ان سب میں انسان جیسے الفاظ تھے۔ آپ نے انہیں اپنی قوم کا حصہ قرار دیتے ہوئے انہیں اپنا پیغام پہنچایا۔

دعوت کی یہ مہم آپ نے اس طرح چلائی کہ آپ گہرے طور پر ان کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ نے ان کی ایذاؤں پر یکطرفہ صبر کیا۔ آپ نے ان سے کسی بھی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ آپ نے ان

سے کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے آپ کے اور ان کے درمیان مادّی نوعیت کی کوئی نزاع قائم ہو جائے۔ آپ یک طرفہ طور پر ہمیشہ اُن کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ کو ان کی طرف سے طرح طرح کی مصیبتیں پہنچیں مگر آپ ہمیشہ ان کے لیے دعا کرتے رہے۔

دعوت کی یہ صبر آزما جدو جہد تیرہ سال تک چلتی رہی۔ تیرہ سال کے بعد بھی پیغمبر اسلام نے اپنی زبان سے ان کے لیے کبھی کافر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اتری کہ: قل یا ایھا الکفرون (تم کہہ دو کہ اے انکار کرنے والو) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ معیار کی تیرہ سال کی جدو جہد کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ مخاطبین کا انکار ثابت ہو جائے اور ان کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اے انکار کرنے والو۔ اس قسم کے دعوتی کورس سے پہلے کسی کو منکر یا کافر قرار دینا جائز نہیں۔ اب جب کہ پیغمبرانہ معیار کی تیرہ سالہ جدو جہد کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ کسی کو کافر یا منکر قرار دیا جا سکے تو عام لوگوں کے لیے تو ایک سو تیرہ سال کی مدت بھی اس کام کے لیے ناکافی ہوگی۔

کفر کی اصطلاح

مکّی دور میں قرآن میں بعض ایسی آیتیں اُتریں جن کا تعلق بیرون عرب کے غیر مسلموں سے تھا۔ مثلاً قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ کے آغاز میں رومیوں (عیسائیوں) کا ذکر ہے جو وقتی طور پر ایرانیوں سے مغلوب ہو گئے تھے۔ مگر آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ غلبت الکفار فی ادنی الارض (روم کے کفار جو مغلوب ہو گئے ہیں) بلکہ یہ فرمایا کہ غلبت الروم فی ادنی الارض (رومی جو مغلوب ہو گئے ہیں)۔ اسی طرح سورہ نمبر ۱۰۵ میں یمن کے غیر مسلم حاکم ابرہہ کا ذکر ہے۔ مگر قرآن میں اُس کا ذکر یمن کے ایک کافر حکمراں کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ اصحابِ فیل کے لفظ سے اُس کا ذکر کیا گیا۔

قدیم مکّہ کے منکرین کے لیے قرآن میں کفر اور کافر کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ اس کے بعد اُس زمانہ کے اہل اسلام تمام غیر مسلموں کو کافر کے لفظ سے پکارنے لگیں۔ مثلاً ہجرت کے بعد رسول اور آپ کے اصحاب مدینہ آئے تو انہوں نے یہاں کے لوگوں کو کافر کے لفظ سے خطاب نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو جو پہلا خطاب کیا اس

میں آپ نے انہیں اے لوگو (ایها الناس، اتقوا النار ولو بشق تمرة) کے لفظ سے خطاب کیا۔ اسی طرح مدینہ کے باہر ملک کے اطراف میں بہت سے غیر مسلم قبیلے موجود تھے۔ مگر اُن کو بھی کافرانِ عرب یا کافر قبائل کا نام نہیں دیا گیا۔ بلکہ اُن کے معروف نام سے اُنہیں پکارا گیا۔ مثلاً اہلِ سقیف، اہل نجران، اہل بحرین، وغیرہ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دوراول میں اہل اسلام جب عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف مذہب کے ماننے والے لوگ آباد تھے۔ دوراول کے مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا کہ ان غیر مسلموں کو کافر کے نام سے پکاریں۔ اُنہوں نے ہر ایک کو اُس کے اپنے اختیار کردہ نام سے پکارا۔ مثلاً شام کے مسیحیوں کو مسیحی کہا، فلسطین کے یہودیوں کو یہودی کہا، ایران کے مجوسیوں کو مجوسی کہا، افغانستان کے بودھوں کو بودھ (بوذا) کہا، وغیرہ۔

اسی طرح دوراول کے یہ مسلمان جب ہندستان آئے تو یہاں بھی اُنہوں نے یہی کیا۔ اُنہوں نے یہاں کے لوگوں کو ہندو کہا جو سندھو کا عربی تلفظ ہے۔ ابوالریحان البیرونی (وفات ۱۰۴۸ء) نے ہندستان کا سفر کیا۔ اُس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندستان کے بارہ میں ایک عربی کتاب تاریخ الہند لکھی۔ اُس میں وہ یہاں کے غیر مسلموں کو ہندو کہتا ہے، نہ کہ کافرانِ ہند۔

ہزار سال سے زیادہ مدت تک یہی رواج باقی رہا۔ اب بھی کثرت سے ہندستان اور پاکستان کے علاوہ بقیہ دنیا میں یہی رواج بالفعل قائم ہے۔ مسلمان امریکا اور یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔ وہاں اُن کا سابقہ غیر مسلم قوموں سے پڑتا ہے۔ مگر ہر ایک کو وہ اُن کے اپنے اختیار کردہ نام سے پکارتے ہیں، وہ اُنہیں کافر یا کفار نہیں کہتے۔

چند تاریخی مثالیں

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن میں ایها الکافرون کے انداز میں خطاب کی مثال صرف منکرین مکہ کے لیے آئی ہے اور وہ بھی تیرہ سال کے پیغمبرانہ اتمام حجت کے بعد۔ منکرین مکہ کے سوا کسی اور کو اس طرح مشخص انداز میں خطاب نہیں کیا گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو ابتدائی دور میں آپ نے اس طرح خطاب نہیں کیا کہ یا ایھا الکفار۔ بلکہ قرآن میں یہ آیت اُتری: یا ایھا الانسان ما غرّك بربك الکریم۔ ہجرت کے بعد صحیفۂ مدینہ کا ایک جملہ یہ تھا: للیھود دینھم و للمسلمین دینھم۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہ لکھا جائے کہ للکفار دینھم وللمسلمین دینھم۔ فتح مکہ کے بعد عرب کے مشرک قبائل کے وفود رسول اللہ سے گفت وشنید کے لیے مدینہ آئے۔ مگر یہاں بھی خطاب کا انداز یہی تھا: مثلاً یمن کے لوگ مدینہ آئے تو آپ نے فرمایا کہ: اتاکم اھل الیمن۔ اس کے بجائے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اتاکم کفار الیمن۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اطرافِ عرب کے حکمرانوں کو دعوتی مکاتیب روانہ کیے تو اُن کا انداز بھی یہی تھا۔ مثلاً آپ نے رومی حکمراں کو جو خط لکھا اُس کا پہلا جملہ یہ تھا: من محمد بن عبد الله الی هرقل عظیم الروم۔ اس کے بجائے آپ نے یہ نہیں لکھا کہ الی هرقل کافر الروم۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ان الله بعثنی کافة للناس فادّوا عنی۔ اس میں بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان الله بعثنی کافة للکفار۔ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں صحابہ کی فوج ایران میں داخل ہوئی تو روایات کے مطابق، وہاں ایران کے غیر مسلم حکمراں کو خطاب کرتے ہوئے ایک صحابی نے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے کہا: لنخرج العباد من عبادة العباد الی عبادة الله۔ اُنھوں نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہیں کہ لنخرج الکفار من عبادة الکفار الی عبادة الله۔

اس طرح دورِ اوّل کے مسلمان جب عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیلے تو کسی بھی ملک میں اُنھوں نے لوگوں کو کافر یا کفار کے الفاظ سے خطاب نہیں کیا بلکہ ہر قوم کو اُسی لفظ سے خطاب کیا جس لفظ کو اُس نے خود اختیار کر رکھا تھا۔ مثلاً مسیحی کو مسیحی، یہود کو یہود، مجوس کو مجوس، بُودھ کو بُودھ، وغیرہ۔

کافر کا تحقق اُس وقت ہوتا ہے جب کہ متعلقہ شخص کے اوپر کامل اتمامِ حجت کیا جا چکا ہو اور اس اتمام حجت کا ماڈل صرف ایک ہے۔ اور وہ پیغمبر اسلام کے دور میں مکّہ کی تیرہ سالہ دعوتی جدوجہد ہے۔ یہ تیرہ سالہ دعوتی عمل ہمیشہ کے لیے دعوت یا اتمام حجت کے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اتمامِ حجت

کے بعد بھی متعین طور پر کسی کے کافر ہونے کا اعلان خدا کی طرف سے ہوگا، نہ کہ داعی کی طرف سے۔

قریش کی مثال

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سال پیدائش ۵۷۰ میں ایک بڑا واقعہ ہوا۔ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ مکہ کی طرف اقدام کیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کعبہ کو ڈھادے۔ مگر اللہ کی خصوصی مدد کی بنا پر اُسے کامیابی نہیں ملی۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵ میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۶۱۰ء میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو نزولِ قرآن کے اس ابتدائی زمانہ میں قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۶ اُتری۔ اس سورہ کا ترجمہ یہ ہے: اس واسطے کہ قریش مانوس ہوئے، جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس۔ تو اُن کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے اُن کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے اُن کو امن دیا۔ (قریش ۱۔۴) اس سورہ میں قریش کو صرف قریش کہا گیا، نہ کہ کفار یا کفارِ قریش۔

پیغمبر اسلام توحید کے داعی تھے۔ آپ نے مکّہ میں اپنی دعوت شروع کی تو مسلسل تیرہ سال تک اسی انداز میں لوگوں کو پکارتے رہے کہ اے قریش کے لوگو، اے انسانو، اۓ میری قوم۔ پُر امن دعوتی مہم کی اس پوری مدت میں آپ نے کبھی کافر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ فریقِ ثانی کی طرف سے ہر قسم کی زیادتیاں کی گئیں۔ لیکن اُن کے لیے آپ کی خیر خواہی کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ اُن کی ایذاؤں پر یک طرفہ صبر کرتے ہوئے آپ نے اپنی پُر امن دعوتی جدو جہد جاری رکھی۔ آخر کار تیرہ سال بعد قرآن میں سورہ نمبر ۱۰۹ اتری۔ اس میں پہلی بار خدا کی طرف سے ان الفاظ میں اعلان کیا گیا کہ: **قل یاایّھا الکفرون** (کہہ دو کہ اۓ انکار کرنے والو)

اس سے معلوم ہوا کہ کافر (منکر) کا لفظ ایک صفت کو بتاتا ہے، نہ کہ کسی قوم کو۔ اگر کافر سے مراد کوئی قوم ہوتی تو قرآن میں آیت کے الفاظ **لایلف قریش** کے بجائے **لِایلف الکفار** ہونا چاہئے تھا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کافر کا لفظ صفتِ انکار کو بتانے کے لیے ہے، نہ کہ قومی تعلق کو بتانے

کے لیے۔ مزید یہ کہ اس بات کا تحقق کہ کسی کے اندر صفت انکار ہے یا نہیں، قیاس کی بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ حقیقی تجربہ کی بنیاد پر ہوگا۔ اور وہ تجربہ یہ ہے کہ پیغمبر کی سطح پر کم از کم تیرہ سال تک اعلیٰ ترین معیار کی دعوتی جدوجہد چلائی جائے۔ اس کے بغیر خود پیغمبر کے زمانہ میں بھی کسی کو کافر کہنا درست نہیں۔

مناظرہ

برصغیر ہند میں برٹش حکومت کے زمانہ میں اہل اسلام کے درمیان ایک مبتدعانہ رواج ظہور میں آیا جس کو مناظرہ کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دعوت کے بجائے مناظرہ بازی شروع ہوئی جس نے دونوں فرقوں کے درمیان غیر معتدل فضا پیدا کرنے کا کام کیا۔ مسلمان مناظر نے ہندو کے خلاف کتاب لکھی اور اُس کو 'کفر توڑ' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد ہندو مناظر نے مسلمانوں کے خلاف کتاب لکھی جو 'کفر توڑ کا بھانڈہ پھوڑ' کے نام سے شائع کی گئی۔

اسلام کا طریقہ دعوت ہے جو نصح (خیر خواہی) اور شفقت اور یک طرفہ صبر کے اُصول پر جاری ہوتا ہے۔ جب کہ مناظرہ (debate) کا مقصد فریقِ ثانی کو شکست دینا ہوتا ہے۔ مناظر کا نشانہ فریقِ ثانی کو ہرانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس قسم کی زبان بولتا ہے کہ اُن کے اوپر بلڈوزر چلا دو:

Bulldoze them all.

اس سے دونوں گروہوں کے درمیان نفرت اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے جو طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

دار الدعوہ

دار الکفر یا **بلاد الکفار** کے الفاظ عباسی دور میں استعمال کیے گیے۔ اس سے پہلے یہ اصطلاحیں اہل اسلام کے درمیان رائج نہ تھیں۔ میرے نزدیک یہ اضافہ درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ جو ملک اسلامی ملک ہو اُس کو دار الاسلام کہا جائے اور بقیہ تمام ملکوں کو دار الدعوہ کہا جائے۔ دار الاسلام کے سوا ہر ملک دار الدعوہ ہے، خواہ وہ مسلمانوں کے حق میں بظاہر دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن میں پیغمبر اسلام کی نسبت سے ارشاد ہوا ہے: **وھذا کتاب انزلنہ مبرک**

مصدق الذی بین یدیه و لتنذر ام القری و من حولها (الانعام ۹۳)۔یعنی یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اُتاری ہے، برکت والی ہے، تصدیق کرنے والی اُن کی جو اس سے پہلے ہیں۔ اور تا کہ تو ڈرائے اُم القری کو اور اُس کے آس پاس والوں کو۔

قرآن کی اس آیت میں ام القری سے مراد مکہ ہے۔ جب یہ آیت اُتری، اُس وقت مکّہ غیر مسلموں کے قبضہ میں تھا۔ حتیٰ کہ کعبہ کو بتوں کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔ مگر اس آیت میں قدیم مکّہ کو دار الکفر یا مدینة الکفر نہیں کہا گیا بلکہ أم القریٰ کہا گیا اور وہاں انذار، بالفاظ دیگر، دعوت کا حکم دیا گیا۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہو وہ اسلامی اصطلاح میں دار الدعوہ یا دار الانذار قرار پائیں گے۔ ایسے کسی بھی مقام کے لیے دار الکفر یا بلاد الکفار جیسے الفاظ کا استعمال درست نہ ہوگا۔

کسی ملک کا حوالہ جب جغرافی اعتبار سے دینا ہو تو اُس کا ذکر اُس نام سے کیا جائے گا جس نام سے وہ عمومی طور پر معروف ہے۔ مثلاً سری لنکا کو سری لنکا اور جنوبی کوریا کو جنوبی کوریا۔ اور جب اہلِ اسلام کی ذمہ داری کے اعتبار سے کسی ملک کا حوالہ دینا ہو تو اُس کو دار الدعوہ کہا جائے گا۔ دار الدعوہ کا لفظ جغرافی تقسیم کو نہیں بتاتا بلکہ وہ اہلِ اسلام کی دعوتی ذمہ داری کو بتاتا ہے۔

نکاح اور طلاق

عورت اور مرد کے درمیان تعلق کی جائز صورت صرف ایک ہے، اور وہ اعلان کے ساتھ نکاح ہے۔ یہی طریقہ فطرت کے مطابق ہے اور اسلام میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ تاہم دو زندہ انسان جب ساتھ مل کر رہیں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اس اختلاف کو رفع کرنے کی صورت اسلام میں یہ بتائی گئی ہے کہ دونوں اس معاملہ میں مصالحت کا انداز اختیار کریں (النساء ۱۲۸) یعنی اختلاف کو مٹانے کی کوشش نہ کرنا بلکہ ناگزیر ضرورت کے طور پر اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے زندگی گزارنا۔ یہی اس مسئلہ کا واحد فطری حل ہے۔

تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عورت اور مرد تنظیم اختلاف (difference management) کے اس اصول کو اپنانے میں ناکام رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے ازدواجی علیٰحدگی کا ارادہ کر لیتے ہیں جس کو طلاق کہا جاتا ہے۔ اسلام میں ایک مجبورانہ ضرورت کے طور پر طلاق کو جائز کیا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کی حوصلہ شکنی بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أبغض الحلال الی اللہ الطلاق (مشکوٰۃ المصابیح) یعنی طلاق اگرچہ حلال ہے لیکن اللہ کے نزدیک وہ سخت ناپسند چیز ہے۔

طلاق کا ارادہ طرفین کے درمیان بیشتر حالات میں غصہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام میں طلاق کا ایک ایسا طریقہ تجویز کیا گیا جو عملاً طلاق پر روک لگانے کے ہم معنٰی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف أو تسريح باحسان** (البقرہ: ۲۲۹) یعنی طلاق رجعی دو بار ہے، اُس کے بعد دستور کے موافق یا تو رکھ لینا ہے یا بھلی طرح چھوڑ دینا ہے۔

یہ قرآن کے مطابق، طلاق کا مجوزہ طریقہ (prescribed method) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص طلاق دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو ایسا کرنا چاہیے کہ وہ پہلے مہینہ میں طہر کی حالت میں اپنی بیوی سے کہے کہ میں نے تم کو ایک طلاق دیا۔ اگر مہینہ پورا ہونے کے بعد بھی وہ طلاق

کے ارادہ پر قائم ہوتو اگلے مہینہ دوبارہ وہ کہے کہ میں نے تم کو دوسرا طلاق دیا۔ یہ دونوں طلاقیں رجعی شمار ہوں گی۔ یعنی شوہر کو حق ہوگا کہ وہ دو ماہ کی اس مدت کے دوران اپنی طلاق واپس لے لے۔ تیسرا مہینہ آنے کے بعد اگر اس نے تیسری بار کہہ دیا کہ میں نے تم کو تیسرا طلاق دیا تو رجوع کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ اب دونوں کے درمیان شوہر اور بیوی کی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔

تین مہینہ کے درمیان تکمیل طلاق کا یہ طریقہ اس لیے رکھا گیا ہے تا کہ اگر وقتی غصہ کے تحت شوہر نے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے ازدواجی تعلق کو بحال کر لے اور اگر اس کا ارادہ غیر جذباتی تھا اور تیسرے مہینہ بھی وہ اپنے ارادہ پر قائم ہے تو تیسرے مہینہ میں وہ طلاق کی تکمیل کر کے مکمل علیٰحدگی اختیار کر لے۔

اسلام کے دور اول میں طلاق کے اسی فطری طریقہ پر عمل تھا۔ خلیفۂ اول کے آخری زمانہ میں بعض مسلمانوں نے ایسا کیا کہ انہوں نے غصہ کے تحت ایک ہی بار میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی۔ یعنی ایک ہی مجلس میں کہہ دیا کہ تم کو طلاق، طلاق، طلاق۔ مگر اس وقت تک یہ معاملہ بہت استثنائی اور انفرادی تھا۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق کی خلافت کے نصف آخر میں ایک مجلس میں تین طلاق کے واقعات زیادہ ہونے لگے۔

اب حضرت عمر فاروق نے خلیفہ کی حیثیت سے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو قانون کے اس غلط استعمال پر روک لگائے۔ چنانچہ انہوں نے بعض افراد کے ساتھ ایسا کیا کہ انہوں نے ایک مجلس میں تین طلاق دیا تو خلیفہ دوم نے ان کے طلاق کو واقع کر کے شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق کرا دی۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کیا کہ شوہر کی پیٹھ پر کوڑے مار کر اس کو زخمی کر دیا (ثم اوجع ظهره)۔

خلیفہ دوم کا یہ عمل کوئی منصوص حکم نہ تھا بلکہ وہ ایک انتظامی حکم (executive order) تھا۔ یعنی اس کی حیثیت یہ تھی کہ حاکم وقت نے اپنے اختیار کے مطابق، مرد کو ایک تنبیہی سزا دی۔ اس سزا کا مقصد یہ تھا کہ ایک مجلس میں تین طلاق کی سخت حوصلہ شکنی کی جائے۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا۔ لوگوں نے سزا کے

خوف سے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ چھوڑ دیا۔

موجودہ زمانہ میں، خاص طور پر برصغیر ہند میں، یہ طریقہ دوبارہ پھیل گیا ہے۔ لوگ غصہ میں آتے ہی فوراً طلاق طلاق طلاق کہہ دیتے ہیں۔ وہ ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیتے ہیں جو شرعی قانون کا غلط استعمال ہے اور وہ شوہر کے لیے سخت گناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ صورت بہت عام ہوگئی ہے اور ضروری ہوگیا ہے کہ اس معاملہ میں شریعت کا واضح حکم متعین کیا جائے۔

راقم الحروف کے نزدیک موجودہ حالت میں اس معاملہ میں ہمارے لیے دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب ہے۔ ایک یہ کہ جب ایک شخص فوری جذبہ کے تحت طلاق طلاق طلاق کہہ دے تو اس کو شوہر کی طرف سے غصہ پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ سمجھا جائے کہ شوہر نے شدت اظہار کے طور پر اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے دی۔ حالاں کہ اس کا مقصد تکمیلی طلاق دینا نہ تھا بلکہ صرف طلاق دینے کے ارادے کا شدید انداز میں اظہار کرنا تھا، یہ تہدید وتشدید کا معاملہ تھا، نہ کہ حقیقتاً تطلیق ثلاثہ کا معاملہ۔

اس صورت میں یہ کیا جائے گا کہ شوہر سے یہ کہا جائے گا کہ تمہاری تین طلاق عملاً پہلے مہینہ کی ایک طلاق قرار دی جاتی ہے۔ اب تم کو یہ اختیار ہے کہ چاہے تو رجوع کرلو اور اگر تم تفریق کے ارادہ پر قائم ہو تو قرآنی طریقہ کے مطابق، اگلے مہینہ تم دوسرا طلاق دو۔ اور اگر اس کے بعد بھی تفریق کا ارادہ باقی رہے تو تیسرے مہینہ تم طلاق کے عمل کی تکمیل کر کے اپنی بیوی سے علیٰحدگی اختیار کر سکتے ہو۔

اس معاملہ میں دوسرا ممکن طریقہ ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم سنت فاروقی کو اپنے زمانہ کے لحاظ سے اختیار کریں۔ یعنی ایک مجلس کی تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر عورت اور مرد کے درمیان تفریق کرادیں۔ مگر اس صورت میں لازمی طور پر ہمیں سنت فاروقی کے مطابق یہ کرنا ہوگا کہ اس مزاج کی حوصلہ شکنی کے لیے شوہر کو سخت سزا دیں۔

موجودہ قانونی نظام کے تحت غالباً یہ ممکن نہیں کہ ایسے شوہر کو کوڑا مارنے کی سزا دی جائے۔ مگر

اس کا ایک بدل یقینی طور پر ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ علمائے ہند نے جس طرح شاہ بانو بیگم کے مشہور کیس میں حکومتِ ہند سے مطالبہ کرکے پارلیمنٹ سے ایک قانون بنوایا تھا اسی طرح اس معاملہ میں بھی حکومت سے مطالبہ کرکے ہندستانی پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کرایا جائے۔ اس قانون میں یہ طے کیا جائے کہ جو مسلمان ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے گا تو اس کی طلاق تو واقع کردی جائے گی مگر اسی کے ساتھ شوہر کو اپنے اس غیر شرعی فعل کی سخت سزا بھی بھگتنی ہوگی۔

راقم الحروف کے نزدیک وہ سزا یہ ہونی چاہیے کہ جس شوہر نے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر شرعی فعل کیا ہے اس سے جرمانہ کے طور پر بھاری رقم وصول کی جائے اور یہ پوری رقم مطلقہ عورت کو دے دی جائے۔ بالفرض اگر یہ شوہر نقد رقم دینے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کو طویل مدت کے لیے قید بامشقت (rigorous imprisonment) کی سزا دی جائے۔ اس معاملہ میں مانع جرم سزا (deterrent punishment) ضروری ہے۔ اس سے کم کوئی سزا اس معاملہ میں مفید نہیں ہو سکتی۔

حکمتِ قرآن

قرآن کے ذریعہ رفعت

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بارہ میں فرمایا: ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً و یضع بہ آخرین (صحیح مسلم، کتاب المسافرین، مسند احمد) یعنی خدا اس کتاب، قرآن کے ذریعہ کچھ لوگوں کو بلندی عطا کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو اُس کے ذریعہ پست رکھتا ہے۔

اس حدیث میں جس رفعت اور پستی کا ذکر ہے اُس کا کوئی تعلق سیاست اور حکومت سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر ایک غیر سیاسی واقعہ ہے۔ یہ رفعت ہر حال میں کسی کو مل سکتی ہے، خواہ وہ ایک مقام پر ہو یا دوسرے مقام پر۔ خواہ وہ اقتدار کی حالت میں ہو یا بے اقتدار کی حالت میں۔ خواہ وہ غربت کی حالت میں ہو یا دولت کی حالت میں۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جن حقیقتوں کو کھولا گیا ہے اُس کو جو آدمی دریافت کرے وہ انسانی بُلندی کے درجہ پر پہنچ جائے گا۔ اُس کے اندر ذہنی ارتقاء کا عمل جاری ہوگا۔ اُس کے اندر فکری انقلاب آجائے گا۔ اُس کے اندر اعلیٰ ذوق کی صفت پیدا ہو جائے گی۔ وہ اخلاق کے بُلند مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔ اُس کی نفسیات مکمل طور پر مثبت نفسیات بن جائے گی۔ اُس کو کردار کی بُلندی حاصل ہوگی۔ وہ معاملات میں حُسنِ تدبیر کو اختیار کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ وہ دشمنی کے باوجود عدل سے نہیں ہٹے گا۔ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوگا۔ اُس کے اندر ربانی شخصیت پرورش پائے گی۔ وہ خدا کے جلال و کمال میں جینے والا انسان بن جائے گا۔

اس کے برعکس حالت اُس انسان کی ہوگی جو قرآن سے فیض حاصل نہ کر سکے۔ وہ فکری اور روحانی اعتبار سے ایک پست انسان بن جائے گا۔ وہ ہمیشہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہے گا۔ بے یقینی اُس کا سرمایہ بن جائے گی۔ خدا کی نشانیوں کے درمیان وہ خدا کی نشانیوں کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔ ہر واقعہ اُس کو منفی سبق دے گا۔ ہر تجربہ اُس کی پستی میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔ ہدایت کی روشنی سے فیض

حاصل کرنا اُس کے لیے ممکن نہ رہے گا۔ وہ غیر خدائی سوچ میں جئے گا اور اُسی میں مر جائے گا۔

مذکورہ حدیث میں جس رفعت اور پستی کا ذکر ہے اُس کا تعلق اصلاً افراد سے ہے۔ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کسی انسان کو سُپر انسان بناتا ہے۔ وہ انسان کو سیرت و کردار کی بُلندی عطا کرتا ہے۔ مگر جو شخص قرآن کو پڑھ کر اُس سے نصیحت نہ لے اُس کا معاملہ بالکل برعکس ہو جائے گا۔ سچائی کو جاننے کے بعد اُس کا انکار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس قسم کا انکار آدمی کو ذہنی پستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ اس بدترین کمزوری میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقت کو جانے مگر وہ حقیقت کا اعتراف نہ کر سکے۔ وہ بے اعترافی کی بُرائی میں مبتلا ہو جائے اور کسی کی ذہنی ترقی میں بے اعترافی ایک قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاہم اس کا ایک اجتماعی پہلو بھی ہے۔ جب کسی گروہ میں قابلِ لحاظ تعداد ایسے افراد کی ہو جائے جن کو قرآن نے پستی سے اُٹھا کر بلندی کے درجہ تک پہنچایا ہو تو ایسا گروہ عام گروہ کی مانند نہیں رہتا۔ ایسے گروہ میں وہی صفات اجتماعی سطح پر ظاہر ہونے لگتی ہیں جو اُس کے کچھ افراد کے اندر انفرادی سطح پر پیدا ہوئی ہیں۔

کسی گروہ میں ایسے افراد کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو جائے کہ وہ گروہ کے اندر غالب حیثیت حاصل کر لیں، یہی افراد اُس گروہ کی فکری اور اخلاقی پہچان بن جائیں تو اُس کے بعد یہ معاملہ انفرادی حد کے اندر نہیں رُکتا۔ اُس کا ظہور اجتماعی سطح پر بھی لازمی طور پر ہونے لگتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ایسا ہوتا ہے کہ جو رفعت افراد کو حاصل ہوئی تھی وہی پورے گروہ کا مقدر بن جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس صورت بھی پیش آتی ہے۔ یعنی جب کسی سماج میں ایسے افراد غالب آ جائیں جو حق سے محرومی کے نتیجہ میں پستی کے درجہ تک پہنچ گئے ہوں تو اُس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ گروہ بھی اُسی طرح پستی میں چلا جاتا ہے جس طرح اُس کے افراد فکر و عمل کی پستی میں پہنچ گئے ہیں۔

اسٹریس مینج منٹ Stress Management

زندگی میں بار بار مسائل اور مصائب آتے ہیں۔ ایسا ہر مرد اور عورت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس سے کس طرح کامیابی کے ساتھ نپٹا جائے۔ اس کا جواب قرآن کی سورہ نمبر ۲ کی ایک آیت میں ملتا ہے۔ اُس کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔ (البقرہ ۱۵۵۔۱۵۶)

مسائل اور مصائب کے وقت کوئی شخص ذہنی تناؤ کا شکار کیوں ہوتا ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ اُس کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جس کو نہ ہونا چاہئے تھا۔ آدمی اگر یہ سمجھ لے کہ جو کچھ پیش آیا ہے وہ خود فطرت کے قانون کے تحت پیش آیا ہے تو وہ کبھی ذہنی تناؤ کا شکار نہ ہو۔ مثلاً اگر آندھی اور بارش آئے تو وہ بھی انسان کے لیے مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ مگر آندھی اور بارش کے وقت آدمی ذہنی تناؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اُس کو فطرت کے قانون کے تحت ہونے والا ایک واقعہ سمجھتا ہے اور معتدل انداز میں اُس کا سامنا کرتا ہے۔

یہی معاملہ زندگی کے مسائل اور مصائب کا بھی ہے۔ یہ چیزیں خالق کے تخلیقی منصوبہ کے تحت پیش آتی ہیں۔ وہ انسان کے لیے زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی اگر پیش آنے والے مصائب کو اس حیثیت سے لے تو وہ کبھی ذہنی تناؤ کا شکار نہ ہو۔

مصائب یا مسائل کا سامنا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، صبر کا طریقہ اور دوسرا، بے صبری کا طریقہ۔ بے صبری کا طریقہ، دوسرے لفظوں میں، منفی ردّ عمل (negative response) کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس صبر کا طریقہ مثبت ردعمل (positive response) کا طریقہ۔ ذہنی تناؤ ہمیشہ بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں صبر کا طریقہ آدمی کو ذہنی تناؤ کا شکار ہونے سے بچا لیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر آدمی قانونِ خداوندی، بالفاظِ دیگر قانونِ فطرت کے تابع ہے۔ وہ اپنے آغاز میں بھی اسی قانون کے ماتحت ہے اور اپنے آخر میں بھی اسی قانون کے ماتحت۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت جب بھی کسی مسئلہ سے دوچار ہو تو وہ معتدل انداز میں اُس کا سامنا کرے۔ وہ اُس کو اپنے حق میں خیر سمجھ کر اُس کو قبول کرے۔

اس آیت میں مصیبتوں کا مقصد ابتلاء (ولنبلونکم) بتایا گیا ہے۔ ابتلاء کے معنٰی امتحان یا آزمائش ہیں۔ انسانی زندگی میں اس قسم کے امتحان کا مقصد یہ ہے کہ اُس کو حوادث کے درمیان تربیت دے کر زیادہ بہتر انسان بنایا جائے۔ حوادث کسی آدمی کے لیے ترقی کا زینہ ہیں۔ حوادث کے ذریعہ آدمی کا ذہن بیدار ہوتا ہے۔ حوادث کے ذریعہ آدمی کے اندر پختگی آتی ہے۔ حوادث آدمی کو متحرک کرنے کا ذریعہ ہیں۔ حوادث آدمی کے لیے زندگی کے سفر میں مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ حوادث کے بغیر آدمی نامکمل ہے۔ یہ حوادث ہی ہیں جو آدمی کی شخصیت کو مکمل شخصیت بناتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حوادث کا صحیح مقابلہ یہ نہیں ہے کہ اپنے اندر ذہنی عمل کو سپریس کر دیا جائے یا اُس کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ بہت سے لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ سگریٹ یا شراب کے ذریعہ اُس کو بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مخصوص ورزشوں کے ذریعہ اپنے اندر ذہنی عمل کو معطل کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ حقیقی زندگی سے فرار (escape) کا کوئی طریقہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ میڈیٹیشن (Meditation) کے ذریعہ اپنے ذہن کو ایک ایسی حالت میں لے جاتے ہیں جس کو ذہنی تخدیر (Intellectual anaesthesia) کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے تمام طریقے فطرت کے خلاف ہیں اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ کبھی انسان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

اکثریت پر اقلیت کا غلبہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ایک قدیم واقعہ کا ذکر ہے۔ اس کے تحت فطرت کے ایک ابدی قانون کو بتایا گیا ہے، ایک ایسا قانون جو کبھی بدلنے والا نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی مذکورہ آیت کا ایک حصہ یہ ہے:

’’کتنے ہی چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے‘‘ (البقرہ ۲۴۹)

قرآن کی اس آیت میں چھوٹے گروہ اور بڑے گروہ کے درمیان جس ہونے والے واقعہ کو بتایا گیا ہے وہ کوئی پراسرار بات نہیں، وہ مکمل طور پر ایک فطری واقعہ ہے جو معلوم قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ مزید یہ کہ اُس کا تعلق ہر گروہ سے ہے، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔ خواہ وہ ایک ملک کا رہنے والا ہو یا کسی دوسرے ملک کا رہنے والا۔ خواہ وہ ایک زمانہ میں رہنے والا ہو یا کسی دوسرے زمانہ میں رہنے والا۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر اتھاہ صلاحیت موجود ہے۔ مگر ابتدائی طور پر یہ صلاحیت سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ جو چیز اس صلاحیت کو جگاتی ہے وہ صرف ایک ہے، اور وہ چیلنج ہے، اسی چیلنج کی حالت کو قرآن میں عداوت (الاعراف ۲۴) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چیلنج (یا عداوت) کے حالات آدمی کے اندر سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو چیلنج والے حالات پیش نہ آئیں اُن کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ وہ ایک کمتر انسان کی مانند جیتے ہیں اور کمتر انسان کی مانند مر جاتے ہیں۔

چھوٹے گروہ اور بڑے گروہ کے درمیان فرق اسی فطری قانون کی بنا پر پیش آتا ہے۔ کسی سماج میں جب ایک گروہ کم تعداد میں ہو اور دوسرا گروہ زیادہ تعداد میں تو اس فرق کی بنا پر دونوں کو الگ الگ حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک کو صبر کی مشقت سے گذرنا پڑتا ہے اور دوسرا صبر کی مشقت سے بچا رہتا ہے۔ چھوٹا گروہ مسلسل طور پر بڑے گروہ کے مقابلہ میں چیلنج کی حالت میں رہتا ہے۔ اس دباؤ کی بنا پر چھوٹے گروہ کے لوگوں کی صلاحیتیں مسلسل بیدار ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ اپنی برتر پوزیشن کی بنا پر چیلنج یا دباؤ کی صورت حال سے بچا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کی صلاحیتیں زیادہ بیدار نہیں ہوتیں۔

اس فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹے یا کمزور گروہ کی تخلیقیت (creativity) بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ مسلسل طور پر غیر تخلیقیت (uncreativity) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ

عمل خاموشی کے ساتھ اور مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ ایک گروہ پورے معنوں میں تخلیقی گروہ (creative group) بن جاتا ہے، اور دوسرا گروہ پورے معنوں میں غیر تخلیقی گروہ (uncreative group) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ایک فطری حقیقت کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فئۃ قلیلۃ (غیر محفوظ گروہ) مسلسل اپنی اہلیت کو بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تعداد کی قلت کے باوجود اپنی برتر صفات کی بنا پر عملاً غالب حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس فئۃ کثیرۃ (محفوظ گروہ) مسلسل طور پر انحطاط کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ وہ باہمی اتحاد، گہری سوچ اور دوررس عمل جیسی صلاحیتوں سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ آخرکار اپنی ہی دنیا میں عملاً مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

معاملہ کی کتابت

قرآن کے مطابق، درست معاملہ کی بے حد اہمیت ہے۔ درست معاملہ کسی انسان کے حق پرست ہونے کی پہچان ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو، جب تم کسی مقرر مدت کے لیے اُدھار کا لین دین کرو تو اُس کو لکھ لیا کرو۔ اور اُس کو لکھے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اُس کو سکھایا، اسی طرح اُس کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے۔ اور وہ ڈرے اللہ سے جو اُس کا رب ہے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے سمجھ ہو یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ اُس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ کر لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اُس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ انکار نہ کریں جب وہ بلائے جائیں۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اُس کو لکھنے میں کاہلی

نہ کرو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کا طریقہ ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہہ میں نہ پڑو۔ لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں لین دین کیا کرتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں کہ تم اُس کو نہ لکھو۔ مگر جب یہ سودا کرو تو گواہ بنالیا کرو، اور کسی لکھنے والے کو یا گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہارے لیے گناہ کی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔(البقرہ ۲۸۲)

یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ لمبی آیت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہمی معاملہ میں کتابت کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ معاملات میں ہمیشہ شکایت اور اختلاف کا امکان رہتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ معاملہ کے وقت اُس کو باقاعدہ صورت میں لکھ لیا جائے۔ کتابت معاملہ کا ایک ایسا مستند ریکارڈ ہے جو کسی امکانی اختلاف کو طے کرنے کے لیے ایک یقینی ذریعہ ہے۔ معاملہ کو باقاعدہ تحریر میں لانا سماج کے باہمی اختلاف کو ختم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ عورت اور مرد کے ذہن کی بناوٹ میں فرق ہے۔ اس فرق کی بنا پر ایسا ہے کہ مرد کے اندر کسی ایک چیز پر فوکس کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ جب کہ عورت کا فوکس پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ امکان ہے کہ ایک عورت کسی معاملہ کو پوری طرح اپنی ذہنی گرفت میں نہ لے سکے۔ اس فرق کے پیش نظر یہ احتیاطی تدبیر بتائی گئی کہ گواہ اگر عورت ہے تو دو عورتوں کو گواہ بنالو تاکہ ایک عورت دوسری عورت کی تلافی کر سکے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ: واتقوا اللہ و یعلمکم اللہ (اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو علم دیتا ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اور صحت فکر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ آدمی کے پاس اگر علم یا معاملات کا ذخیرہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ درست فکر یا صحیح سوچ کا بھی حامل ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ علومِ قطعیہ (exact sciences) میں ریاضیات اور تجربات کے ذریعہ حتمیت

پیدا ہو سکتی ہے۔مگر جہاں تک علوم ظنّی (especulative sciences) کا تعلق ہے، اُن میں اس قسم کی حتمیت ممکن نہیں۔ اس دوسری قسم کے علوم میں صحت فکر کے لیے سنجیدگی (sincerity) لازمی طور پر ضروری ہوتی ہے۔تقویٰ آدمی کے اندر یہی سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ سنجیدگی اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ آدمی کا علم اُس کو بھٹکنے سے بچا لے۔

تقویٰ (خوف خدا) کبر و غرور کا قاتل ہے۔تقویٰ آدمی کے اندر انانیت(egoism) کا خاتمہ کر دیتا ہے۔تقویٰ آدمی کو عُجب اور خود پسندی سے بچالیتا ہے۔تقویٰ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ بے لاگ طور پر سوچے اور کسی آمیزش کے بغیر اپنی رائے قائم کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کو علم صحیح کا ذریعہ بتایا گیا۔

اجتماعی احتساب

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں بتایا گیا ہے کہ کسی معاشرہ کی صلاح و فلاح کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے۔فرمایا— و لتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئك ھم المفلحون ۔

''اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے اور بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے''۔(آل عمران ۱۰۴)

قرآن کی اس آیت میں معاشرہ کی فلاح کے لیے جس اہتمام کا تذکرہ کیا گیا ہے اُس کو اجتماعی احتساب کا نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ اجتماعی احتساب تمام تر ایک غیر سیاسی ادارہ ہے، اُس کا کوئی تعلق حکومت سے نہیں۔حکومت قائم ہو یا قائم نہ ہو، ہر حال میں اجتماعی احتساب کا یہ کام غیر حکومتی اداروں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

ہر سماج میں ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے بعض افراد ایسے کام کرتے ہیں جس سے لوگوں کے اندر اشتعال پھیلے اور فساد کی نوبت آجائے۔ اس کے روک کی تدبیر یہ ہے کہ سماج کے اندر ایسے افراد اور ایسی تنظیمیں ہوں جو ہر ایسے موقع پر حرکت میں آجائیں۔ وہ بُرائی کرنے والوں کی مذمت کریں۔ وہ

سماج کو تیار کریں کہ وہ ایسے افراد کی براہِ راست یا بالواسطہ حمایت نہ کرے۔ وہ نصیحت اور تذکیر کے تمام ذرائع کو استعمال کر کے برائی میں ملوث ہونے والے افراد کی اصلاح کی مہم چلائیں۔ وہ ایسا ماحول پیدا کریں کہ بُرے افراد کے لیے سماج میں باعزت طور پر رہنا ناممکن ہو جائے۔

یہی اجتماعی احتساب کا نظام ہے۔ یہی نظام کسی سماج کی فلاح کا ضامن ہے۔ جس سماج میں ایسا ہو کہ سماج کے سربرآوردہ لوگ بُرے افراد کی مذمت نہ کریں، وہ ایسے افراد کی حوصلہ شکنی کے لیے کھڑے نہ ہوں، ایسا سماج یقینی طور پر فلاح سے محروم رہے گا۔

آیت میں فرمایا کہ: واولئك هم المفلحون (اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں)۔ یہ کوئی پُراسرار بات نہیں۔ یہ دراصل فطرت کا ایک قانون ہے جس کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی فلاح کا بہت کم تعلق حکومت اور قانون سے ہے۔ اس کا زیادہ تعلق اُن تعمیری سرگرمیوں سے ہے جو غیر حکومتی سطح پر انجام دی جائیں۔ کسی سماج میں یہ ہونا چاہئے کہ اُس کے افراد دوسروں کے معاملہ میں غیر جانبدار بن کر نہ رہیں۔ وہ اپنی ذاتی فلاح کے ساتھ دوسروں کی فلاح بھی دل سے چاہتے ہوں۔ جس سماج کے افراد میں یہ اسپرٹ ہو وہاں یہ ہوگا کہ لوگ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہیں گے۔ وہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کا ساتھ دیں گے۔ وہ کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھیں گے تو وہ اُس پر تڑپ اُٹھیں گے اور اجتماعی زور کے ساتھ اُس کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ یہ چاہیں گے کہ سماج میں برائی دبے اور اچھائی پھیلے۔ اس قسم کا اصلاحی مزاج ہی کسی سماج کی تعمیر و ترقی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ قرآن کی اس آیت میں دراصل اجتماعی ضمیر کی بات کہی گئی ہے، حکومت واقتدار سے اُس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

سازش بے اثر

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں بتایا گیا ہے کہ سازش کا سب سے زیادہ موثر توڑ کیا ہے۔ وہ ہے ــــ صبر اور تقویٰ۔ صبر اور تقویٰ بظاہر کوئی مادی طاقت نہیں، مگر صبر و تقویٰ کے ذریعہ سازش کا کامیاب دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اگر تم صبر کرو اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خدا اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے''۔ (آل عمران ۱۲۰)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں اصل مسئلہ سازش کی موجودگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ سازش کے فطری توڑ کے لیے صبر اور تقویٰ موجود نہ ہو۔ موجودہ دنیا کو چیلنج اور مسابقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس لیے یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے آگے بڑھنے کے لیے سازش کرتا ہے لیکن اگر زیر سازش فریق کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت موجود ہو تو وہ اس کے لیے حفاظت کی گارنٹی بن جائے گا۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ جو کارروائی کی جائے وہ ردعمل کے تحت نہ کی جائے بلکہ مثبت غور وفکر کے ذریعہ ٹھنڈے ذہن کے تحت کی جائے۔ تقویٰ یعنی گاڈ کانشس نس اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی کسی بھی حال میں جسٹس سے نہ ہٹے، وہ جو کارروائی کرے وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر کرے۔ وہ خدا کے احکام کا پابند ہو، نہ کہ خود اپنی خواہشات وترغیبات کا پابند۔

سازش یا تشدد کے مقابلہ میں اگر جوابی سازش اور تشدد کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے فریقین کے درمیان ضد بڑھتی ہے۔ نفرت اور انتقام کی نفسیات جاگتی ہے۔ ایک دوسرے کے درمیان وہ منفی جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کو عام طور پر سبق سکھانا کہتے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں اصل مسئلہ مزید بڑھتا ہے۔ انتقام در انتقام کے نتیجہ میں وہ ایک ایسی برائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

اس کے برعکس صبر وتقویٰ کا طریقہ گویا منفی حالات کا جواب مثبت ردعمل سے دینا ہے۔ یہ تخریب کے جواب میں تعمیر کے اصول پر مسئلہ کو حل کرنا ہے۔ وہ دوطرفہ تشدد کو یک طرفہ بنا دینا ہے۔ جب بھی کوئی فرد یا گروہ اس طرح صبر وتقویٰ کا طریقہ اختیار کرے تو وہ دو بات کو یقینی بنا لیتا ہے — فریقِ ثانی کے حق میں ناکامی اور اپنے حق میں کامیابی۔

حالات یکساں نہیں رہتے

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں ایک صورتِ حال پر تبصرہ ہے۔ پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کو بدر کے

مقابلہ میں اپنے مخالفین پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُحد کے مقابلہ میں اُنہیں اپنے مخالفین سے شکست ہوگئی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

''اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو دشمن کو بھی ویسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں''۔ (آل عمران ۱۴۰)

قرآن کی اس آیت میں قوموں کے بارہ میں ایک تاریخی قانون کو بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم ہمیشہ غالب رہے یا ہمیشہ فتح حاصل کرتی رہے۔ اس بنا پر حالات ہمیشہ کسی ایک قوم کے موافق نہیں ہوتے۔ حالات کا فیصلہ کبھی ایک گروہ کے حق میں ہوتا ہے اور کبھی دوسرے گروہ کے حق میں۔ ایسی حالت میں لوگوں کو چاہئے کہ وہ تاریخ کے فیصلہ کو قبول کریں۔ وہ شکایت اور احتجاج کے بجائے از سرِ نو اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کو مسابقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی ایک گروہ کو جیت حاصل ہوتی ہے اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ مقابلہ آرائی کا یہ ماحول قوموں کو مسلسل طور پر بیدار رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ترقی کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔

ایسی حالت میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ ہارنے والے اور جیتنے والے دونوں اپنی ہار اور جیت کو وقتی سمجھیں۔ نہ ہارنے والا پست ہمت ہو اور نہ جیتنے والا فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اس معاملہ میں معتدل رویّہ پر قائم رہنا گویا قدرت کے فیصلہ کو تسلیم کرنا ہے۔ اس کے برعکس معتدل رویّہ سے ہٹنا گویا قدرت کے فیصلہ پر راضی نہ ہونا ہے۔ مگر جو لوگ اس معاملہ میں قدرت کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں وہ خود اپنا ہی نقصان کریں گے، نہ کہ کسی اور کا۔

یہ معاملہ پوری طرح فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ وہ کسی کے لیے اور کسی کی وجہ سے بدلنے والا نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی فریق اگر اس کو قبول نہ کرے تو اُس کا یہ عدمِ قبول ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے پھول کے ساتھ کانٹا مطلوب نہیں یا کوئی شخص اس بات پر احتجاجی مہم چلائے

کہ دنیا کے نظام کو اس طرح بدل جانا چاہیے کہ یہاں صرف میرے لیے موافق موسم ہو، اور جو موسم میرے خلاف ہو وہ کبھی زمین پر نہ آئے۔

عالمی نظام کے بارہ میں اس قسم کی شکایت و احتجاج جتنی بے معنیٰ ہے اُتنا ہی بے معنیٰ وہ شکایت واحتجاج بھی ہے جو سیاسی تبدیلی یا قوموں کے عروج وزوال پر کی جائے۔

کائنات معرفت کا خزانہ ہے

قرآن میں سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ تدبّر اور تفکر ہے۔قرآن کے مطابق، ہماری گرد وپیش کی دنیا حقائق کا خزانہ ہے۔اُس میں غور وفکر کے ذریعہ آدمی زندگی کی حقیقتوں کو دریافت کرسکتا ہے۔اس سلسلہ میں قرآن کی کچھ آیتیں یہ ہیں:

''آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اُٹھتے ہیں کے اے ہمارے رب، تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا''۔ (آل عمران ۱۹۱)

قرآن کی ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے اُس کو سائنس آف ٹروتھ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کائنات کے سائنسی مطالعہ کا مقصد صرف ٹیکنکل ترقی نہیں ہے اس سے بڑھ کر اُس کا ایک اور مقصد ہے، اور وہ ہے خالق کی تخلیقات میں خالق کو دریافت کرنا۔تخلیقات کا گہرا مطالعہ کرکے زندگی کے راز کو معلوم کرنا۔مادّی کائنات کی تحقیق کرکے یہ جاننا کہ اُس کے نقشہ کے مطابق، انسانی ترقی کا قانون کیا ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ کائنات میں کوئی خلل نہیں (الملک ۳) اس طرح کائنات کا مطالعہ انسان کے لیے اس میں مددگار ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر وتشکیل بھی کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے اپنی زندگی میں جو نقشہ مطلوب ہے وہ وہی ہے جو بقیہ کائنات میں بالفعل قائم ہو۔چنانچہ آدمی جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اُس میں ایک طرف خالق کی تجلیّات کو پالیتا ہے اور

دوسری طرف اُس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو اپنی زندگی کی کامیاب تعمیر کن خطوط پر کرنا چاہئے۔

خواہش کے خلاف

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ شوہر اور بیوی میں اگر اختلاف ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کو ناپسند کرنے لگیں تو دونوں کو ٹکراؤ کے بجائے موافقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ:

''اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو'' (النساء ۱۹)

میاں اور بیوی کے تعلقات میں جب بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کے ناپسندیدہ پہلو کو مبالغہ آمیز انداز میں دیکھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اُسی وقت اُس کے اندر کسی اور اعتبار سے پسندیدہ پہلو موجود ہوتا ہے۔ مگر غصہ کی وجہ سے دونوں پسندیدہ پہلو کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی آدمی صرف برا نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کی زندگی کا کوئی مثبت پہلو ہوتا ہے اور کوئی منفی پہلو۔ اگر منفی پہلو کو نظر انداز کر کے معاملہ کیا جائے تو اس کے زبردست فائدے دونوں فریق کو حاصل ہوں گے۔

ازدواجی زندگی میں جب ایک مرد اور عورت دونوں اپنے آپ کو شامل کرتے ہیں تو یہ دونوں کے لیے سب سے زیادہ قریبی تعلق کے ہم معنٰی ہوتا ہے۔ اس قسم کا قریبی تعلق بے حد مفید ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس قسم کے قریبی تعلق میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان فرق کی بنا پر اختلافات پیدا ہو جائیں اور پھر کسی ایک فرق کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کو مطلوب سے کم سمجھنے لگیں۔ مگر یہ سرتاسر نادانی ہے۔ عقلمندی یہ ہے کہ قریبی تعلق کے تعمیری پہلوؤں کو دھیان میں رکھا جائے اور اُن سے بھرپور طور پر فائدہ اُٹھایا جائے۔ جہاں تک ناپسندیدہ پہلوؤں کی بات ہے تو اس معاملہ میں حقیقت پسندانہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے اُس کو نظر انداز کر دینا چاہئے، یہی مرد کو بھی کرنا ہے اور یہی عورت کو بھی۔

دوررس کلام

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں کامیاب کلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ بظاہر انکار کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں اُن کو کس طرح اقرار کی روش پر لایا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

''پس تم ان سے اعراض کرو اور اُن کو نصیحت کرو اور اُن سے ایسی بات کہو جو اُن کے دلوں تک پہنچنے والی ہو''۔ (النساء ۶۳)

جب کوئی شخص کسی بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو اُس کا یہ انکار سادہ طور پر محض انکار نہیں ہوتا بلکہ اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اپنے ذہنی ڈھانچہ کی بنا پر وہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لمبی مدت تک ایک خاص فکری ماحول میں رہنے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو ایک خاص زاویہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس لیے وہ چیزوں کو کسی اور زاویہ سے دیکھ نہیں پاتا۔ اکثر حالات میں کسی انسان کا انکار اُس کی فکری مجبوری کی بنا پر ہوتا ہے، نہ کہ دانستہ سرکشی کی بنا پر۔

ایسی حالت میں ضرورت ہوتی ہے کہ صبر آزما کوشش کے ذریعہ اُس کے اندر نئی سوچ لائی جائے۔ اُس کے ذہن کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا دیا جائے۔ مصلح کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی منفی روش کو نظر انداز کرتے ہوئے خیر خواہانہ طور پر اُن کو سمجھانے بجھانے کا طریقہ جاری رکھے۔ وہ اُن کے ذہن پر پڑے ہوئے پردوں کو اس طرح ہٹائے کہ سچائی کی بات کسی رکاوٹ کے بغیر اُس کے ذہن تک پہنچ جائے۔ جب ایسا ہوگا تو اُس کے لیے سچائی کا اعتراف اُسی طرح آسان بن جائے گا جس طرح کسی باپ کے لیے اپنے بیٹے کو پہچاننا آسان ہوتا ہے۔

ٹائم مینجمنٹ

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں نماز کا حکم بتایا گیا ہے جو اسلام میں اہم ترین عبادت ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں'' (النساء ۱۰۳)

نماز اسلام کی ایک بنیادی عبادت ہے۔ اُس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر ہر روز کے لیے فرض ہے۔ وہ رات اور دن کے درمیان پانچ بار مقرر اوقات پر ادا کی جاتی ہے۔ جس طرح نماز کی ادائیگی ضروری ہے اُسی طرح اُس کے اوقات کی پابندی بھی ضروری ہے۔

نماز اصلاً ایک عبادت ہے۔ مگر اُس کی ادائیگی میں اوقات کی پابندی کو شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح نماز گویا وقت کی پابندی کا ایک سبق ہے جو ہر دن لازمی طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ نماز عبادت کے ساتھ ٹائم مینجمنٹ (time management) کی ایک لازمی تربیت ہے۔ اس طرح نمازی کے رات اور دن کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے— (۱) فجر سے لے کر ظہر تک (۲) ظہر سے لے کر عصر تک (۳) عصر سے لے کر مغرب تک (۴) مغرب سے لے کر عشاء تک (۵) عشاء سے لے کر فجر تک۔

انسان کے پاس سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وقت کے صحیح استعمال کا انجام کامیابی ہے اور وقت کے غلط استعمال کا انجام ناکامی ہے۔ نماز کی صورت میں ٹائم مینجمنٹ کا سبق جو ہر روز دیا جاتا ہے وہ اس دنیا میں کامیاب زندگی کو یقینی بناتا ہے۔ آدمی اگر اپنے رات اور دن کے اوقات کو اس طرح پانچ خانوں میں تقسیم کر لے اور روزانہ اُس کی پابندی کرے تو وہ اپنی پوری زندگی کو بھرپور طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ اور اس دنیا میں جو آدمی اپنے ملے ہوئے اوقات کو منظّم طور پر اور بھرپور طور پر استعمال کرے اُس کو کوئی بھی چیز اعلیٰ کامیابی تک پہنچنے سے روکنے والی نہیں۔

ٹائم مینجمنٹ کا مطلب، دوسرے لفظوں میں لائف مینجمنٹ ہے۔ زندگی کو درست طور پر کیسے گذارا جائے، اس کا بہت گہرا تعلق اس سے ہے کہ آدمی اپنے اوقات کو کس طرح استعمال کرے۔ جس آدمی کے اندر وقت کے درست استعمال کا مزاج پیدا ہو جائے وہ اسی کے ساتھ دوسری بہت سی برائیوں سے بچ جائے گا۔ وقت کا صحیح استعمال آدمی کو اس قابل بنائے گا کہ وہ اپنے حاصل شدہ ذرائع کو درست طور پر استعمال کرے۔

مثلاً ٹائم مینجمنٹ کا مزاج آدمی کو سادہ زندگی پر مجبور کر دیتا ہے۔ کیوں کہ سادہ زندگی اختیار نہ

کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک معاملہ میں ضرورت سے زیادہ توجہ دینا، دوسرے معاملہ میں کمی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اسی طرح تفریح کا مزاج آدمی کو یہ نقصان پہنچاتا ہے کہ اُس کے پاس دوسرے زیادہ ضروری کاموں کے لیے وقت ہی نہ رہے۔ اسی طرح لذیذ کھانوں کا شوق آدمی کے لیے اس نقصان کا سبب بنتا ہے کہ وہ زندگی کے دوسرے ضروری پہلوؤں کے بارہ میں غافل ہوجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹائم مینجمنٹ اپنے اوقات کی درست تقسیم کا دوسرا نام ہے۔ جب آدمی کے اندر صحیح معنوں میں ٹائم مینجمنٹ کا احساس پیدا ہوجائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بہت سی غیر ضروری یا غیر اہم چیزوں سے بچ جائے گا۔ مثلاً فضول خرچی، مصنوعی تکلفات، غیر حقیقی مشاغل، وقتی تفریحات، وغیرہ۔

زندگی میں ساری کی بے حد اہمیت ہے۔ سادگی با مقصد انسان کا کلچر ہے۔ تاہم سادگی کے اصول پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے جو ٹائم مینجمنٹ کی اہمیت کو سمجھ لے، وہ اپنے اوقات کے بارہ میں پوری طرح حسّاس ہوجائے۔ ایسا آدمی جب بھی سادگی کے خلاف کوئی کام کرے گا تو اُس کی یہ حسّاسیت اُس کو فوراً روک دے گی۔ وہ محسوس کرے گا کہ وہ سادگی کے خلاف طریقہ استعمال کرکے اپنے آپ کو اس ہلاکت میں ڈال رہا ہے کہ اُس کے پاس زیادہ اہم کاموں کے لیے نہ پیسہ رہے اور نہ وقت۔

صُلح بہتر ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں شوہر اور بیوی کے درمیان نزاع کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس مسئلہ کا حل کس طرح تلاش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:

> اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رُخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں صُلح کرلیں اور صُلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کروگے اللہ اُس سے باخبر ہے۔ (النساء ۱۲۸)

قرآن کی اس آیت میں صُلح کو بہتر بتایا گیا ہے۔ یہ بات بظاہر خاندانی نزاع کے بارہ میں ہے

مگر اُس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔ صُلح ایک اعلیٰ تدبیر ہے جو ہر نزاعی مسئلہ کا واحد کامیاب حل ہے، خواہ وہ نزاعی مسئلہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خواہ وہ قومی ہو یا بین اقوامی۔

جب بھی دو آدمیوں یا دو فریقوں کے درمیان کوئی نزاع پیش آتی ہے تو اس نزاع کو حل تک نہ پہنچنے کا سبب صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ حرص ہے۔ اس موقع کے لحاظ سے حرص کا مطلب یہ ہے کہ عملاً جو کچھ مل رہا ہے اُس پر راضی نہ ہونا اور اُس سے زیادہ چاہنا۔ یہی حرص یا زیادہ چاہنے کا مزاج نزاع کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ وہ آخر کار بڑھ کر باقاعدہ ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں صُلح یہ ہے کہ بروقت جو کچھ عملی طور پر مل رہا ہے اُس پر راضی ہو کر معاملہ کو ختم کر دینا۔ جب ایک شخص صُلح کے اس طریقہ کو اختیار کرے تو اپنے آپ نزاع کی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد یہ نوبت ہی نہیں آتی کہ نزاع بڑھ کر ٹکراؤ بن جائے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو حرص کا طریقہ ہمیشہ مزید نقصان کا سبب بنتا ہے، اور صلح کا طریقہ کام کے مواقع کھولتا ہے جس کو استعمال کر کے مزید ترقی حاصل کر لی جائے۔

صُلح کوئی سادہ بات نہیں۔ صُلح کوئی انفعالی روش نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صُلح اپنے آپ میں سب سے بڑا عمل ہے۔ صُلح بظاہر میدانِ مقابلہ سے واپسی ہے۔ مگر عملاً وہ اقدام کی سب سے بڑی تدبیر ہے۔ جب کوئی فرد یا گروہ صُلح کرلے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے لیے ایک ایسا ماحول پالیا جس کے اندر وہ ٹکراؤ میں وقت ضائع کیے بغیر اپنے پورے وقت اور طاقت کو اپنے تعمیری منصوبہ میں لگائے۔

غیر مصالحانہ طریقہ زندگی کے سفر کو روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس مصالحانہ طریقہ زندگی کے سفر کو رُکے بغیر دوبارہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری کر دیتا ہے۔

انتہا پسندی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں جو احکام دیے گئے ہیں اُن میں سے ایک حکم یہ ہے کہ لوگ غلو یا انتہا پسندی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ غلو یا انتہا پسندی ہر حال میں بُری چیز ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اے اہل کتاب، تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارہ میں تم کوئی بات حق کے سوا نہ کہو (النساء ۱۷۱)

اس آیت میں جس روش کو غلو کہا گیا ہے وہ وہی ہے جس کو انتہا پسندی (extremism) کہا جاتا ہے۔ انتہا پسندی بظاہر اچھی نیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُس کے پیچھے یہ جذبہ ہوتا ہے کہ کسی مقصد کو مزید قوت کے ساتھ حاصل کیا جائے۔ انتہا پسندی دراصل اعتدال پسندی کی ضد ہے۔

انتہا پسندی کی روش بظاہر اچھی نیت کے ساتھ کی جاتی ہے مگر عملی نتیجہ کے اعتبار سے وہ سخت نقصان دہ ہے۔ اس دنیا میں کوئی صحیح یا مثبت نتیجہ ہمیشہ اعتدال کی روش کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ انتہا پسندی کی روش صرف نقصان پہنچاتی ہے وہ کسی فائدہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کام خارجی اسباب کی رعایت کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ خارجی اسباب کا لحاظ نہ کرتے ہوئے جو اقدام کیا جائے گا وہ صرف تباہی کا سبب بنے گا۔

انتہا پسندی اور اعتدال پسندی میں یہی فرق ہے۔ انتہا پسند لوگ صرف اپنی خواہش کو جانتے ہیں وہ خارجی اسباب سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اعتدال پسند آدمی اپنی خواہش کے ساتھ خارجی اسباب کو بھی اپنے دھیان میں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہا پسند آدمی ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور اعتدال پسند آدمی ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

غلو یا انتہا پسندی ایک ایسی روش ہے جو فطرت کے قوانین کے خلاف ہے۔ کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فطرت ہمیشہ اعتدال اور تدریج کے اصول پر کام کرتی ہے۔ یہ اُصول جو خارجی دنیا میں عملاً قائم ہے وہی اُصول انسان کے لیے بھی مفید ہے۔ فطرت کا نظام عمل کی زبان سے انسان کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہو تو غلو کو چھوڑ دو اور اعتدال کا طریقہ اختیار کرو۔

سچائی کی دریافت

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ایک واقعہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: اور جب وہ اس کلام کو سنتے

ہیں جو رسول پر اُتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ اُن کو حق کا عرفان حاصل ہو گیا (المائدہ ۸۳) ایک اور موقع پر اسی قسم کی بات اس طرح کہی گئی ہے:

ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ اُن کا ایمان بڑھا دیتی ہیں (الانفال ۲)

ان آیتوں سے ایک اہم حقیقت واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ سچائی سب سے بڑی طاقت ہے۔ کوئی انسان جب سچائی کو دریافت کرتا ہے تو اُس کی پوری شخصیت ہل جاتی ہے۔ اُس کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ روحانیت کے سمندر میں نہا اُٹھتا ہے۔ اُس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اُس کی اندرونی شخصیت کو آخری حد تک منور کر دیتی ہے۔ سچائی کی دریافت کسی انسان کے لیے سب سے بڑا تجربہ ہے، اس سے زیادہ بڑا تجربہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس آدمی کے پاس سچائی ہو وہ سب سے زیادہ طاقتور انسان ہے۔ وہ ایک تسخیری طاقت کا مالک ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں کو جیت سکتا ہے۔ وہ ہتھیار کے بغیر فاتح بن سکتا ہے۔ بظاہر کوئی مادی طاقت نہ رکھتے ہوئے بھی وہ سب سے بڑی طاقت کا مالک ہے۔ سچائی پانے والے کے لیے سچائی ایک انقلاب ہے۔ اور سچائی رکھنے والے کے لیے سچائی ایک طاقت کا خزانہ ہے۔

کسی شخص کی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ ہلچل پیدا کرنے والی ہے وہ سچائی کی دریافت ہے۔ کسی آدمی کا یہ احساس کہ میں نے سچائی کو اُس کی بے آمیز صورت میں دریافت کر لیا ہے، اُس کے اندر فکر و خیال کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اس قسم کا واقعہ کسی آدمی کے پورے اندرونی وجود کو متحرک کر دیتا ہے۔ وہ اُس کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے۔

خدا کا کلام صرف یہ نہیں کرتا کہ وہ انسان کو کچھ باتوں کی خبر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگاتا ہے۔ وہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود چراغ کو روشن کر دیتا ہے۔ وہ انسان کے داخلی شعور کو خارجی حقیقت سے جوڑ دیتا ہے۔

انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر معرفت کا احساس رکھ دیا گیا ہے۔ مگر اس خفتہ احساس کو متحرک (activate) کرنے کے لیے خارجی مدد کی ضرورت ہے۔ خدا کا کلام یہی خارجی روحانی مدد فراہم کرتا ہے۔ خدا کے کلام سے رہنمائی پانے کے بعد انسان کا حال یہ ہوتا ہے جیسے اندھیرا گھر روشن ہو جائے یا سوکھا ہوا باغ لہلہا اُٹھے۔

زمین میں فساد نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق رہے، وہ اس سے انحراف نہ کرے۔ مذکورہ قرآنی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

پس ناپ اور تول پوری کرو۔ اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں۔ اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد (الاعراف ۸۵)

خدا نے اس زمین کو ایک اصلاح یافتہ زمین کے طور پر پیدا کیا ہے۔ یہاں ہر چیز اپنی معیاری صورت میں ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے سوا جو دنیا ہے وہاں عدل اور پوری ادائیگی کا اصول قائم ہے۔ یہ گویا ایک اصلاحی نظام ہے جو خدا کی زمین پر قانونِ فطرت کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اسی اصلاحی اصول کو اختیار کرنا ہے۔ اس کے خلاف چلنا گویا زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ بناؤ میں بگاڑ کو داخل کرنا ہے۔

اس معاملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ زمین میں ہر چیز کو نہایت متناسب انداز (right proportion) میں رکھا گیا ہے۔ سورج کی روشنی، بارش اور ہوا ہر چیز میں ایک خاص تناسب قائم ہے۔ زمین کی سطح پر سبزہ اور جنگلات سوچے سمجھے اندازہ کے مطابق اُگائے گئے ہیں۔ انسان کے لیے بقا اور ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ فطرت کے اس اصلاحی نقشہ کو برقرار رکھے۔

زمین کے اندر فطرت کا جو نظام ہے وہ گویا ایک ماڈل ہے۔ انسان کو بھی اسی ماڈل پر اپنی زندگی کی تشکیل کرنی ہے۔ انسان اگر ایسا کرے کہ وہ فطرت کے اس ماڈل کو اپنی زندگی میں اختیار نہ کرے، اسی کے ساتھ وہ مزید یہ سرکشی کرے کہ وہ فطرت کے نظام کو بدل دے، مثلاً ہوا میں گیسوں کے فطری

تناسب کو بگاڑ دے تو گویا وہ دوہرا جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ خدا کے غضب کا شکار ہو کر رہ جائیں گے، وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

اعراض کا طریقہ

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں چند اخلاقی نصیحتیں کی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک نصیحت یہ ہے کہ باہمی معاملات میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ قرآن کی مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور نادانوں سے اعراض کرو (الاعراف ۱۹۹)

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے درمیان بحث اور تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر درست طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر فریقِ ثانی سنجیدہ ہو، وہ مسئلہ کو حقیقی طور پر سمجھنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں دلیل کے ذریعہ اُس کے سامنے اپنا موقف رکھنا چاہئے۔ اور اگر وہ سنجیدہ نہ ہو تو ایسی حالت میں دلیل اور منطق اُس کو متاثر نہ کر سکے گی۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں کچھ خود ساختہ الفاظ بول دے گا اور پھر یہ سمجھے گا کہ اُس نے پیش کردہ دلیل کو رد کر دیا ہے۔

اس دوسری صورت میں درست طریقہ یہ ہے کہ اعراض (avoidance) کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اعراض کا مقصد دراصل یہ ہے کہ آدمی کو اُس کے ضمیر کے حوالہ کر دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ جو مقصد دلیل کے ذریعہ پورا نہیں ہوا وہ ضمیر کی خاموش آواز کے ذریعہ پورا ہو جائے۔

عملی نزاع کو ختم کرنے کے لیے بھی سب سے زیادہ موثر ذریعہ اعراض ہے۔ عملی نزاع کے وقت اگر اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو نزاع اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جائے گی۔ جب کہ اعراض نہ کرنے کا نقصان یہ ہے کہ نزاع بڑھتی رہے، یہاں تک کہ چھوٹی برائی (lesser evil) کی جگہ بڑی برائی (greater evil) کا سامنا کرنا پڑے۔

اعراض کوئی سادہ چیز نہیں، وہ ایک اعلیٰ اخلاقی روش ہے۔ وہ ایک اعلیٰ انسانی طریقہ ہے۔ کوئی شخص جب اشتعال کی صورت پیش آنے پر بھڑک اُٹھے تو وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک پست انسان

ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اشتعال کی صورت پیش آنے پر نہ بھڑکے وہ ایسا کرکے یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ بلند انسانی مرتبہ پر ہے، وہ صحیح معنوں میں اعلیٰ انسان کہے جانے کا مستحق ہے۔

یقین واعتماد

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں اُن کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس کے بعد وہ ۶۲۲ء میں مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ یہ ایک بے حد خطرناک سفر تھا۔ دو ہفتہ کے اس سفر کے دوران ایک بار وہ ایک غار (ثور) میں چھپے ہوئے تھے۔ آپ کے مخالفین جو آپ کی تلاش میں نکلے تھے، وہ تلوار لیے ہوئے غار کے منھ تک پہنچ گئے۔ اُس وقت آپ کے واحد ساتھی ابوبکر صدیق تھے۔ اُنہوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ تو یہاں بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد قرآن کا بیان یہ ہے — **اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا:**

جب پیغمبر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ ۴۰)

موجودہ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے یارومددگار سمجھنے لگتا ہے۔ اس حالت میں اُس کو ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی ذات ہو جس پر وہ یقین کر سکے۔ جو اُس کے عجز کی تلافی بن جائے۔

خدا کی ذات پر یقین آدمی کو یہی اتھاہ سہارا دیتا ہے۔ خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ اس لیے خدا پر یقین آدمی کو ایک ایسی ہمت دیتا ہے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ خدا کا عقیدہ کسی آدمی کے لیے حوصلہ کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ جس آدمی کو خدا کی ذات پر پورا یقین ہو جائے وہ کسی بھی حال میں بے حوصلہ نہیں ہوگا۔ وہ کسی بھی حال میں اس احساس سے دوچار نہیں ہوگا کہ اُس کا راستہ بند ہے۔ وہ ہر حال میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ زندگی کی آخری منزل تک پہنچنے میں کوئی بھی چیز اُس کے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔

خدا کا یہ عقیدہ انسان کی اپنی صلاحیتوں کو جگا دیتا ہے۔ وہ انسان کے اندر ایک نیا عزم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اس کی داخلی قوتوں کو متحرک کر کے ایک بے حوصلہ انسان کو باحوصلہ انسان بنا دیتا ہے۔

برائی اور بھلائی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۱ میں زندگی کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کا تعلق ہر فرد سے ہے، مرد سے بھی اور عورت سے بھی۔ عام انسان سے بھی اور خاص انسان سے بھی۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔ (ھود ۱۱۴)

انسان پتھر نہیں ہے۔ انسان سے مختلف قسم کی غلطیاں پیش آتی ہیں۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد یا ایک عورت سے ایک واقعہ سرزد ہو گیا۔ بعد کو اُنہیں احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس غلطی کی تلافی کس طرح کی جائے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں غلطی کی تلافی کے اسی اُصول کو بتایا گیا ہے۔

آدمی جب کوئی غلطی کرتا ہے تو اُس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کے دل کے اندر اچھے اور برے کے بارہ میں حساسیت (sensitivity) کم ہو جاتی ہے۔ اور اگر آدمی بار بار وہی برائی کرتا رہے تو اُس کی حساسیت پوری طرح ختم ہو جائے گی۔ جب کہ یہی حساسیت بُرائی کے خلاف سب سے بڑا چک ہے۔ ایسی حالت میں حساسیت کا ختم ہونا انسان کا گویا حیوان بن جانا ہے۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی برائی کرنے کے بعد بھلائی کرے — وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرے۔ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ وہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ جو آدمی ایسا کرے وہ اپنے دل کو دوبارہ پاک کر لے گا۔ اُس کے دل کی حساسیت دوبارہ اُس کی طرف لوٹ آئے گی۔

بُرائی کا دوسرا اثر وہ ہے جس کا تعلق سماج سے ہے۔ سماج کے ایک فرد کا برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے پُرسکون پانی میں پتھر پھینکنا۔ چنانچہ ایک فرد کا برائی کرنا پورے سماج کو متاثر کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اپنی برائی کی تلافی کرنا گویا پورے سماج کو بگاڑ سے بچانا ہے۔ یہ فرد کے اوپر ایک سماجی فرض ہے کہ وہ اپنی برائی کے انجام سے سماج کو بچائے۔

نفس امّارہ، نفس لوّامہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کے اندر دو مختلف قسم کی صلاحیتیں (faculties) ہیں۔ ایک نفس امّارہ (یوسف ۵۳) اور دوسرے نفس لوّامہ (القیامہ ۲) انسان کے اکثر اعمال انہی دونوں صلاحیتوں کے تحت انجام پاتے ہیں، خواہ وہ فرد سے تعلق رکھتا ہو یا جماعت سے۔

قرآن کی اس آیت میں نفس امّارہ سے مراد برائی کا حکم دینے والا نفس ہے۔ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو انانیت (ego) کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نفس لوّامہ سے مراد ملامت کرنے والا نفس ہے۔ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی کا اصول یہ ہے کہ جب دو آدمیوں یا دو پارٹیوں کے درمیان کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس وقت سارا فیصلہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ آدمی کے ایگو (ego) کو جگایا گیا ہے یا اس کے ضمیر کو جگایا گیا ہے۔ اگر آپ آدمی کے ایگو کو جگائیں تو اس کا نتیجہ بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

When one's ego is touched it turns into
super ego and the result is breakdown.

اس کے برعکس اگر آدمی کے ضمیر کو ٹچ (touch) کیا جائے تو اس کے اندر اعتراف اور شرمندگی کا جذبہ جاگ جائے گا اور فیصلہ انصاف کے مطابق ظاہر ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی آپ کا معاملہ کسی شخص سے پیش آئے یا اُس کے ساتھ کوئی نزاع قائم ہو جائے تو اُس وقت گویا نتیجہ مکمل طور پر خود آپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنی کسی اشتعال انگیز کارروائی سے فریقِ ثانی کے ایگو (نفس امّارہ) کو بھڑکا دیں تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فریقِ ثانی آپ کے لیے مخالف کے روپ میں اُبھرے گا۔ وہ آپ کی اشتعال انگیزی کا جواب نفرت اور تشدد کی صورت میں دے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ اختلاف و نزاع کے موقع پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ایسی صورت میں فریقِ ثانی کی طرف سے آپ کو بالکل مختلف قسم کا تجربہ پیش آئے گا۔ اب ایسا ہوگا کہ بظاہر جو آدمی آپ کا حریف بنا ہوا تھا وہ آپ کے لیے ایک بے ضرر انسان بن جائے گا۔

اس کے بعد آپ اور فریقِ ثانی کے درمیان ایسی معتدل فضا قائم ہو جائے گی جس میں آپ کوئی نیا مسئلہ پیدا کیے بغیر اپنے آپ کو حل کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں دشمن اور دوست دونوں خود آپ کی پیداوار ہیں۔ آپ کا خود اپنا رویہ کسی کو اپنا دشمن بنا دیتا ہے۔ اسی طرح خود آپ کا دوسرا رویہ اُس کو آپ کا دوست بنا دیتا ہے۔ اب یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ فریقِ ثانی کو اپنا دشمن بناتے ہیں یا اپنا دوست۔

انتظار کی پالیسی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں ایک پیغمبر کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اُن کے اوپر بہت سے سخت حالات پیش آئے۔ مگر وہ تقویٰ اور صبر پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اُن کو سرفرازی عطا فرمائی۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

جو شخص ڈرے اور صبر کرے تو اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (یوسف ۹۰)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شام کے بعد صبح آتی ہے۔ ایسا ہونا لازمی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جب اُس پر اندھیری رات آئے تو گھبرا نہ اُٹھے بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو جلد ہی وہ دیکھے گا کہ اُس کے اوپر سورج طلوع ہوا اور ہر طرف اُجالا پھیل گیا۔

تقویٰ یہ ہے کہ آدمی خدا کے مقرر کیے ہوئے نظام پر راضی رہے۔ اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ یہی اِس دنیا میں کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں جس پر چل کر آدمی اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہو۔

قانونِ فطرت کے مطابق، اس دنیا میں کوئی ناکامی ابدی ناکامی نہیں۔ ہر ناکام حال کے ساتھ ایک کامیاب مستقبل جڑا ہوا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ بے صبری کر کے اس نظام کو نہ بگاڑے۔ وہ صبر کی پالیسی اختیار کر کے قدرت کے اگلے فیصلہ کا انتظار کرتا رہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کے لیے یہی پالیسی مفید بھی ہے اور یہی پالیسی ممکن بھی۔

فطرت کے اسی اُصول کو ایک مشہور مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے — انتظار کرو اور دیکھو (wait and see) یہ ایک عالمی تجربہ ہے جو اس مقولہ کی صورت میں ڈھل گیا ہے۔ اس معاملہ میں یہی مذہبی تعلیم بھی ہے اور یہی فطرت کا تقاضا بھی۔

قوموں کا عروج وزوال

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں بتایا گیا ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا قانون کیا ہے۔ یہ فطرت کے ایک اُصول پر مبنی ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے — **ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم:**

بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اُس کو نہ بدل ڈالیں جو اُن کے جی میں ہے (الرعد ۱۱)

قرآن کی اس آیت میں **ما بقوم** سے مراد کسی قوم کی اجتماعی حالت ہے اور **ما بأنفس** سے مراد کسی قوم کی انفرادی حالت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی ترقی کا راز یہ ہے کہ اُس کے افراد کے اندر انسانی صفات (human qualities) اعلیٰ درجہ میں موجود ہوں۔ اس کے برعکس کسی قوم کا اجتماعی زوال اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُس کے افراد کے اندر اعلیٰ انسانی صفات باقی نہ رہیں۔ فرد کی حالت ہی پر ترقی کا انحصار بھی ہے اور تنزّل کا انحصار بھی۔

فطرت کا یہ قانون بتاتا ہے کہ کوئی قوم اگر گراوٹ کا شکار ہو جائے تو اُس کو دوبارہ اُٹھانے کا عمل کہاں سے شروع کرنا چاہئے۔ اس کا واحد کارگر طریقہ یہ ہے کہ افراد کے اندر پھر سے شعوری بیداری لائی جائے۔ افراد کے سیرت و کردار کو بُلند کیا جائے۔ افراد کے اندر اتحاد اور انسانیت کی روح کو جگایا جائے۔

قومی اصلاح کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے برعکس اگر قومی اصلاح کے نام پر عمومی تحریک (mass movement) چلائی جائے، جلسوں اور عوامی تقریروں کے ذریعہ بھیڑ کو مخاطب کیا جائے تو ایسے عمل کا کوئی مطلوب نتیجہ ہرگز نکلنے والا نہیں۔ اس قانون کے مطابق، کسی قوم کی خارجی حالت ہمیشہ

اس کی داخلی حالت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کسی قوم کے زوال کے وقت اُس کی اصلاح کا آغاز داخلی محنت سے ہوگا، نہ کہ خارجی کارروائیوں سے۔

استحکام کا راز

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں اس قانون فطرت کو بتایا گیا ہے جس کے تحت اس دنیا میں کسی کو قیام اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔ یہ نفع بخشی (giving spirit) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

> اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھالیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی اُبھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے (الرعد ۱۷)

اس آیت میں فطرت کی دو مثالوں کے ذریعہ ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ سماجی اور قومی زندگی میں ایک کے مقابلہ میں دوسرے کے لیے قیام اور استحکام کا راز کیا ہے۔ وہ راز صرف ایک ہے اور وہ نفع بخشی ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جو گروہ دینے والا گروہ (giver group) ہو اس کو دوسروں کے مقابلہ میں جماؤ اور ترقی حاصل ہو اور جو گروہ لینے والا گروہ (taker group) بن جائے وہ دوسروں کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہ جائے۔

اس قانون کی روشنی میں دیکھا جائے تو محرومی کے وقت مطالبہ کی مہم سراسر بے معنیٰ ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں کسی کو مطالبہ سے کچھ نہیں مل سکتا۔ اس دنیا میں جب بھی کسی کو کچھ ملے گا تو وہ صرف دینے کی قیمت پر ملے گا۔ اس معاملہ میں موجودہ دنیا کا قانون ایک لفظ میں یہ ہے — جتنا دینا اُتنا پانا۔

شکر سے اضافہ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۴ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون

کے مطابق، اس دنیا میں شکر کرنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ یہ قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے (ابراہیم ۷)

قرآن کی اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ وہ معلوم اسباب کے تحت پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے، فرد کے لیے فرد کی حیثیت سے اور گروہ کے لیے گروہ کی حیثیت سے۔

شکر دراصل اعتراف (acknowledgement) کا نام ہے۔ انسان کی نسبت سے جس چیز کو اعتراف کہا جاتا ہے اُسی کو خدا کی نسبت سے شکر کہا گیا ہے۔ شکر یہ ہے کہ خدا نے آدمی کو جو کچھ دیا ہے، دل کی گہرائیوں کے ساتھ وہ اس کا اعتراف کرے۔

یہ شکر یا اعتراف کوئی سادہ چیز نہیں۔ اُس کا رشتہ نہایت گہرائی کے ساتھ آدمی کی نفسیات سے جُڑا ہوا ہے۔ شکر کرنے والے آدمی کے اندر تواضع، حقیقت پسندی، اعترافِ حق، سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساسات اُس کے کردار میں نمایاں ہوتے ہیں جو اُس کو ترقی کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس معاملہ ناشکری کا ہے۔ ناشکری سے آدمی کے اندر سرکشی، حقیقت سے اعراض، بے اعترافی، غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری جیسی پست صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کی پست صفات پائی جائیں اُس کی ترقی یقینی طور پر رُک جائے گی۔ حتیٰ کہ ممکن ہے کہ وہ ملے ہوئے کو بھی کھودے۔

سبق لینے والے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۵ میں بعض تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ واقعات قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو بتاتے ہیں۔ ان تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

بے شک اس میں نشانیاں ہیں متوسمین کے لیے (الحجر ۷۵)

عربی زبان میں وسم کے معنٰی علامت کے ہوتے ہیں۔ توسُّم کے معنٰی ہیں، کسی چیز کو علامت

سے پہچاننا۔مثلاً آپ کسی کو دیکھ کر کہیں: توسّمت فیه الخیر یا توسّمت فیه الشر۔یعنی اُس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ اُس کے اندر خیر کا مادہ ہے یا یہ کہ اُس کے اندر شر کا مادہ ہے۔جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو اُس کو متوسّم کہا جاتا ہے۔

یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی آدمی کو صاحب بصیرت بناتی ہے۔جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو وہ ہر مشاہدہ اور ہر تجربہ سے سبق لیتے رہیں گے۔وہ سطور میں بین السطور کو پڑھیں گے۔وہ ظاہری واقعات میں اُس کے معنوی پہلوؤں کو دریافت کریں گے۔ وہ کسی چیز کو صرف اُس کے ظاہر (face-value) پر نہ لیں گے۔ بلکہ وہ اُس کی گہرائی تک اُتر کر اُس کی اصل حقیقت کو معلوم کریں گے۔

یہ صلاحیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ محرومی کے واقعہ کو تجربہ میں ڈھال لے۔ وہ معلومات کو سبق بنا سکے۔ وہ حال میں مستقبل کو دیکھ لے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی آدمی کو مفکر (thinker) بناتی ہے۔یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی آدمی کو مدبّر کا درجہ عطا کرتی ہے۔اس صلاحیت کے بغیر ایک آدمی صرف عالم ہے،مگر اس صلاحیت کے ساتھ وہ ایک تخلیقی عالم بن جاتا ہے۔

منی مینجمنٹ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ تم اپنی کمائی کو کس طرح اور کن مدوں میں خرچ کرو۔ اس سلسلہ میں قرآن کی دو آیتیں یہ ہیں:

> اور رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔
> (بنی اسرائیل ۲۶-۲۷)

قرآن کی اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے اُس کو دوسرے لفظوں میں منی مینجمنٹ کہا جا سکتا ہے۔یعنی اپنی کمائی کو حقیقی ضرورت کے مطابق با اصول انداز میں خرچ کرنا اور بے فائدہ کاموں میں اپنا پیسہ خرچ کرنے سے بچنا۔فضول خرچی کے معاملہ میں قرآن اتنا زیادہ سنجیدہ ہے کہ اُس نے فضول خرچی کو ایک شیطانی فعل قرار دیا ہے۔

پیسہ کمانا جس طرح ایک کام ہے اسی طرح پیسہ کو خرچ کرنا بھی ایک کام ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے پیسے کو درست طور پر خرچ کرے۔ وہ اپنے پیسہ کو ضائع نہ کرے۔ پیسہ کو درست طور پر خرچ کرنا یہ ہے کہ خرچ کی ضروری مَد اور غیر ضروری مَد میں فرق کیا جائے۔ پیسہ کو صرف ضروری مَد میں خرچ کیا جائے اور غیر ضروری مدوں میں پیسہ کو خرچ کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کیا جائے۔

قرآن کی اس آیت میں فضول خرچی کو تبذیر کہا گیا ہے، یعنی پیسہ کو غیر ذمہ دارانہ طور پر بکھیرنا۔ اس قسم کی روش ایک تباہ کُن روش ہے۔ پیسہ کسی کو اس لیے ملتا ہے کہ وہ اُس سے اپنی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرے اور جو پیسہ اپنی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہو اُس کو سماج کی تعمیری مدوں میں خرچ کرے۔ یہی خرچ کی صحیح صورت ہے اور اسی میں فرد اور سماج کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

قرآن میں مال کو قیام (النساء ۵) کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مال زندگی کی تعمیر کے سلسلہ میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مال ہر انسان کے پاس خدا کی ایک امانت ہے۔ جو لوگ مال کو غیر ذمہ دارانہ طور پر خرچ کریں وہ بیک وقت دو سنگین برائیوں میں مبتلا ہیں۔ ایک اعتبار سے وہ ایک مقدس امانت میں خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں اور دوسرے اعتبار سے وہ خود اپنی ذاتی تعمیر کے معاملہ میں بدترین ناعاقبت اندیشی کا شکار ہیں۔

انسانی علم کی محدودیت

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں کچھ لوگوں کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک علمی حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کا متعلقہ بیان یہ ہے:

اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو صرف علم قلیل دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی محدودیت (limitations) کی بنا پر علم کلی تک نہیں پہنچ سکتا۔ علم کلی بطور واقعہ موجود ہے۔ مگر انسان کی ذاتی محدودیت کی بنا پر وہاں تک اُس کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے۔ وہ جزئی علم

کی بنیاد پر کلی علم کے بارہ میں استنباط کرے۔ اگر انسان نے یہ اصرار کیا کہ ہر چیز کو براہِ راست میرے مشاہدہ میں آنا چاہئے تو وہ صرف کنفیوژن کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ کیوں کہ کلّی حقیقت کا بطور مشاہدہ علم میں آنا اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

یہ ایک اہم تعلیم ہے۔ یہی واحد چیز ہے جو آدمی کو کنفیوژن سے بچانے والی ہے۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ ہر چیز اُن کے براہ راست مشاہدہ میں آئے، اُسی وقت وہ اُس کو مانیں گے تو ایسے لوگ ہمیشہ بے یقینی کا شکار رہیں گے۔ اس دنیا میں یقین کے درجہ تک پہنچنا صرف اُس انسان کے لیے ممکن ہے جو حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ایسا کرے کہ وہ جزئی علم تک براہِ راست رسائی حاصل کرنے کے بعد یہ اعتراف کرلے کہ اس کے بعد براہ راست علم کی حد ختم ہوگئی اور بالواسطہ علم کی حد آگئی۔ یہی واحد طریقہ ہے جو کسی آدمی کو یقین کا درجہ عطا کرسکتا ہے۔

یہ عین وہی اُصول ہے جس کو موجودہ سائنس میں اب ایک حقیقت کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ اب اہل علم کے درمیان یہ ایک مسلّمہ اصول بن چکا ہے کہ سائنس ہم کو سچائی کا صرف ایک حصہ عطا کرتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

اطرافِ ارض، مرکزِ ارض

قرآن کی سورہ نمبر ۲۱ میں وقت کے اُن بااقتدار لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے جو پیغمبر کی مخالفت کر رہے تھے اور اُس کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اُس کے اطراف سے گھٹاتے چلے جا رہے ہیں پھر کیا یہی لوگ غالب رہنے والے ہیں (الانبیاء ۴۴)

قرآن کی اس آیت سے فطرت کا ایک اُصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُصول یہ ہے کہ اطراف پر قبضہ کرتے ہوئے مرکز تک رسائی حاصل کرنا۔ یہ کسی کے خلاف عمل کا سب سے زیادہ کامیاب طریقہ ہے۔ مقابلہ کی صورت میں اگر ایسا کیا جائے کہ شروع ہی میں براہ راست اقتدار کے مرکز سے ٹکراؤ شروع کر دیا جائے تو یہ سخت نقصان کا باعث ہوگا۔ اس طریقِ کار میں فائدہ کی امید کم اور نقصان کی امید زیادہ ہے۔

عملی اقدام کی زیادہ مؤثر تدبیر یہ ہے کہ اطراف کے شعبوں سے اپنی جدو جہد کا آغاز کیا جائے۔ اطراف سے چل کر مرکز تک پہنچا جائے۔ غیر سیاسی اداروں میں نفوذ حاصل کرتے ہوئے سیاسی ادارہ پر مؤثر بننے کی کوشش کی جائے۔ یہ طریقہ کامیابی کا یقینی طریقہ ہے۔ اس کے برعکس دوسرا طریقہ نقصان اور ناکامی کا طریقہ۔

اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اکثر حالات میں کسی کے خلاف براہ راست کارروائی مفید نہیں ہوتی۔ اکثر حالات میں زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ بالواسطہ انداز میں اپنی کوشش شروع کی جائے۔ براہِ راست کارروائی کے مقابلہ میں بالواسطہ کارروائی کا انداز اکثر حالات میں زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

ملاقات کا صحیح طریقہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲۴ میں باہمی ملاقات کے آداب بتاتے ہوئے ایک تعلیم یہ دی گئی ہے کہ ملاقات کے لیے پیشگی اجازت کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ مذکورہ قرآنی آیت ہے:

> اے ایمان والو، تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے تا کہ تم یاد رکھو (النور ۲۷)

قرآن کی اس آیت میں ملاقات سے پہلے اپائنٹمنٹ (appointment) لینے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی ایک شخص جب دوسرے شخص سے ملنا چاہے تو اُس کے یہاں جانے سے پہلے پیشگی طور پر وہ باقاعدہ اُس سے اجازت حاصل کرے اور پھر اُس کے یہاں ملنے کے لیے جائے۔ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کسی کے یہاں ملاقات کے لیے اچانک پہنچ جائے۔ اس سے سماجی زندگی میں مختلف قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود ملاقات کا مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض کوئی شخص پیشگی اجازت نامہ کے بغیر کسی کے ہاں ملنے کے لیے پہنچ جائے تو اُس کے اندر یہ حوصلہ ہونا چاہیے کہ اگر متعلقہ شخص اپنے کسی عذر کی بنا پر ملاقات نہ کرسکے یا ملاقات کے لیے بہت کم وقت دے تو فریق اول کو اس پر کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ اُس کو چاہئے کہ وہ اگلی ملاقات کے لیے دوبارہ وقت

لے کر بلا شکایت واپس چلا جائے۔ یہ انسانیت کا اعلیٰ طریقہ ہے اور اعلیٰ طریقہ کے بغیر کبھی انسانیت کی اعلیٰ ترقی نہیں ہوسکتی۔

جس طرح ہر چیز کے آداب ہیں اُسی طرح ملاقات کے بھی آداب ہیں۔ ملاقات کے آداب میں سے یہ ہے کہ متعلقہ شخص سے اُس کی پیشگی اجازت لی جائے۔ گفتگو کے وقت سُنانے کے ساتھ سننے کا بھی مزاج ہو۔ غیر ضروری سوال یا بے فائدہ تفصیل سے بچا جائے۔ تنقید اور تعریف سے بُلند ہو کر بات کو سُنا جائے۔ اپنی رعایت کے ساتھ دوسرے کی رعایت کا بھی پورا لحاظ رکھا جائے۔ گفتگو آہستہ انداز میں کی جائے۔ گفتگو کے وقت زور زور سے بولنا آدابِ کلام کے خلاف ہے۔

ٹکراؤ سے اعراض

قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں قدیم قوم سبا کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس واقعہ سے اجتماعی زندگی کا ایک اہم اُصول معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی متعلقہ آیتیں یہ ہیں:

ملکۂ سبا نے کہا کہ اے دربار والو، میری طرف ایک باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے۔ اور وہ ہے — شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے کہ تم میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس آجاؤ۔ ملکہ نے کہا کہ اے دربار والو، میرے معاملہ میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم لوگ حاضر نہ ہو۔ اُنہوں نے کہا، ہم لوگ زور آور ہیں اور سخت لڑائی والے ہیں۔ اور فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ پس آپ دیکھ لیں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں۔ ملکہ نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو خراب کر دیتے ہیں اور اُس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ (النمل ۲۹ - ۳۴)

اس آیت میں ملکۂ سبا کے حوالہ سے زندگی کا ایک اُصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اقدام ہمیشہ نتیجہ کو دیکھ کر کرنا چاہئے، نہ کہ محض خواہش کی بنیاد پر۔ کسی کے خلاف اقدام کرنا اگر مثبت نتیجہ پیدا کرنے والا ہو تو ایسے اقدام کو درست کہا جا سکتا ہے مگر جو اقدام اُلٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (counter productive) ہو، اُس سے بچنا لازمی طور پر ضروری ہے۔

عملی اقدام آئیڈیلزم کے تحت نہیں ہوتا بلکہ پریکٹکل کے تحت ہوتا ہے۔ اپنا ذاتی معاملہ ہوتو آدمی آئیڈیل بن سکتا ہے مگر اجتماعی معاملہ میں ہر ایک کو پریکٹکل ہی بننا ہے، خواہ وہ کوئی عام آدمی ہو یا کوئی حکمراں ہو۔

قابلِ اعتماد کارکن

قرآن کی سورہ نمبر ۲۸ میں ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس کے ذیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی مقصد کے لیے اچھے کارکن کا انتخاب کرنا ہوتو اس کے اندر کن صفات کو دیکھنا چاہیے۔ قرآن کی متعلقہ آیت یہ ہے: ''ان میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ، اس کو ملازم رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو'' (القصص ۲۶)

قرآن کی اس آیت میں قابل اعتماد کارکن کی صفت کو بتانے کے لیے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک، قوی (Hard worker) اور دوسرے، امین (Honest) یہ دونوں صفتیں ابدی صفتیں ہیں۔ خواہ کسی بھی زمانہ میں اور خواہ کسی بھی کام کے لیے کارکن کا انتخاب کرنا ہوتو انہی دونوں کی حیثیت بنیادی صفت کی رہے گی۔ جو نظام ان دو صفتوں کے حامل افراد کو حاصل کرلے اس کی کامیابی اور ترقی بلاشبہ یقینی ہے۔

قوت کا تعلق کارکن کی جسمانی طاقت سے ہے اور امانت کا تعلق اُس کے مزاج سے۔ یہی دونوں چیزیں کسی کارکن کو اچھا کارکن بناتی ہیں۔ اچھا کارکن وہ ہے جو ایک طرف محنتی ہو اور دوسری طرف اُس کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ ٹائم کی اہمیت کو جانے اور اپنی ڈیوٹی میں کمی کو برداشت نہ کر سکے۔

صبر سے امامت

قرآن کی سورہ نمبر ۳۲ میں ایک گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو خدا نے لیڈرشپ عطا کی۔ وہ اس سرفرازی کے مستحق کیسے قرار پائے اس کا راز صبر تھا۔ قرآن کی مذکورہ آیت یہ ہے:

''اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے'' (السجدہ ۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کامیاب قیادت کا راز صبر ہے۔ صبر کسی آدمی کو دوسروں سے بلند کرتا

ہےاور بلند سوچ اور بلند کردار ہی وہ صفتیں ہیں جو کسی آدمی کو دوسروں کے اوپر سرداری کا مقام دیتی ہیں۔

لوگ اسی شخص یا گروہ کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں جو انہیں اپنے سے بلند دکھائی دے۔ جو اس وقت اصول کے لیے جئے جب کہ لوگ مفاد کے لیے جیتے ہیں۔ جو اس وقت انصاف کی حمایت کرے جب کہ لوگ قوم کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ جو اس وقت برداشت کرے جب کہ لوگ انتقام لیتے ہیں۔ جو اس وقت اپنے کو محرومی پر راضی کر لے جب کہ لوگ پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔ جو اس وقت حق کے لیے قربان ہو جائے جب کہ لوگ صرف اپنی ذات کے لیے قربان ہونا جانتے ہیں۔ یہی صبر ہےاور جو لوگ اس صبر کا ثبوت دیں وہی قوموں کے امام بنتے ہیں۔

دشمن میں دوست

قرآن میں فطرت کے جو قوانین بتائے گئے ہیں اُن میں سے ایک قانون یہ ہے کہ کوئی آدمی کبھی کسی کا پیدائشی دشمن نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کی فطرت وہی ہے جو کسی دوسرے آدمی کی ہے۔ اس لیے کسی کو بھی اپنا ابدی دشمن نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس حقیقت کو قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں اس طرح بتایا گیا ہے:

> ''اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے خدا کی طرف بُلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا''۔ (حٰم السجدہ ۳۳۔ ۳۴)

ہر انسان پیدائشی اعتبار سے فطرتِ صحیح پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر ویسا ہی ایک انسان ہے جیسا کہ کوئی دوسرا شخص۔ دشمنی جیسی منفی چیزیں انسانی شخصیت کا محض اوپری حصہ ہیں نہ کہ اُس کا داخلی حصہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی آپ کو اپنا دشمن نظر آئے تو اُس کو اپنا مستقل دشمن نہ سمجھئے۔ بلکہ اُس کی دشمنی کو ایک وقتی حالت سمجھیے۔ دشمن کے بارہ میں اگر اس قسم کی مثبت سوچ پیدا ہو جائے تو آدمی اس قابل ہو جائے گا کہ وہ تعصب جیسے جذبات سے اوپر اُٹھ کر دشمن کے معاملہ میں

اپنا رویہ متعین کرے۔ جو آدمی اس طرح غیر جذباتی انداز میں اپنے دشمن سے معاملہ کرے تو وہ یقینی طور پر کامیاب ہوگا۔

دشمن کی منفی کارروائیوں کی پروا کیے بغیر اُس کے ساتھ دوستانہ سلوک کرنا دشمن کو بدل دے گا۔ اُس کی شخصیت کے اوپر دشمنی کی جو اوپری تہہ بیٹھ گئی تھی وہ ڈھل جائے گی اور پھر جو شخص بظاہر آپ کا دشمن بنا ہوا تھا وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔

مصیبت کا سبب

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں شکست اور ناکامی کا سبب کیا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ''اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں ہی سے ہے، اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے'' (الشوریٰ ۳۰)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کے مطابق، کسی کی دشمنی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ بلکہ یہ خود انسان ہے جو اپنی کوتاہی کی سزا پا رہا ہے۔ ہر مصیبت کا سبب آدمی کے خود اپنے اندر ہوتا ہے، نہ کہ اُس کے باہر۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی آدمی کسی مصیبت یا کسی نقصان سے دوچار ہو تو اُس کو اُس سے نجات پانے کے لیے خود اپنے اندر عمل کرنا چاہیے۔ اُس کو چاہئے کہ وہ اپنی داخلی کمیوں کو تلاش کر کے اُن کی اصلاح کرے۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے مستقبل کو درست کر سکتا ہے۔ اس کے بجائے جو آدمی یہ کرے کہ وہ اپنی مصیبت کا ذمّہ دار دوسروں کو بتا کر اُن کے خلاف شکایت اور احتجاج میں مصروف ہو جائے، وہ صرف اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ایسی کوشش کبھی کسی مثبت نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

قرآن کی یہ آیت نتیجہ خیز منصوبہ بندی کے اصول کو بتا رہی ہے۔ اُس کا پیغام یہ ہے کہ آدمی بے نتیجہ کارروائیوں سے اپنے آپ کو بچائے اور صرف نتیجہ خیز سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف کرے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کا قانون کبھی کسی کے لیے بدلنے والا نہیں۔

غصہ پی جانا

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں ایک اہم اخلاقی اصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب ایک آدمی کو دوسرے کے اوپر غصہ آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ غصہ کو پی جائے اور اس کو معاف کردے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں'' (الشوریٰ ۳۷)

غصہ ایک غیر فطری حالت ہے۔ جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کا دماغ اپنی فطری حالت پر باقی نہیں رہتا۔ وہ معتدل انداز میں سوچنے پر قادر نہیں رہتا۔ غصہ میں مبتلا انسان نہ درست طور پر سوچ پاتا اور نہ درست طور پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کر سکتا۔ غصہ کسی آدمی کا اعتدال چھین لیتا ہے۔ وہ اس کو غیر معتدل انسان بنا دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو پی جانا خود اپنے آپ کی حفاظت کرنا ہے۔ غصہ کو پی جانا اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچے۔ وہ زیادہ نتیجہ خیز انداز میں اپنی کارروائی کی منصوبہ بندی کرے۔ غصہ کو پی جانا خارجی اعتبار سے ایک اخلاقی سلوک ہے۔ مگر داخلی اعتبار سے وہ اپنی تعمیر کے ہم معنٰی ہے۔ جب کوئی آدمی غصہ کے حالات میں غصہ نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ وہ اپنی قوت کو منفی رُخ پر جانے سے روکتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو بھرپور طور پر صرف اپنی تعمیر میں لگائے۔ دوسرے کی تخریب میں غیر ضروری طور پر وہ اپنے وسائل کا کوئی حصہ ضائع نہ کرے۔

مشورہ مفید ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں جو تعلیمات دی گئی ہیں اُن میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو مشورہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اہل حق کی صفات میں سے ایک صفت اسی مشورہ کو بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

''اور وہ اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں'' (الشوریٰ ۳۸)

مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی معاملہ میں حل تلاش کرنے کے کام کو اجتماعی بنا دیا جائے۔ اپنی سمجھ کے ساتھ دوسروں کی سمجھ کو اُس میں شامل کر لیا جائے۔ مشورہ کا مطلب گویا انفرادی عقل کو اجتماعی عقل بنا دینا ہے۔

مشورہ میں یہ ہوتا ہے کہ کئی آدمی کسی موضوع پر ڈسکشن کرتے ہیں۔ اس طرح کے ڈسکشن کے فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ معاملہ کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مشورہ اگر کھلے ذہن کے ساتھ کیا جائے اور تنقید اور تعریف کے جذبہ سے بلند ہو کر اُس کو سنا جائے تو مشورہ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مشورہ میں جو فائدے ہیں اُن کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ لوگ تحفظ ذہنی کے ساتھ نہ بولیں بلکہ وہ جو کچھ کہیں کھلے ذہن کے ساتھ کہیں اور سننے والے بھی اُس کو کھلے ذہن کے ساتھ سنیں۔

یہ سب مشورہ کے آداب ہیں۔ جس مشورہ میں ان آداب کو ملحوظ رکھا جائے وہ مشورہ بے حد با برکت بن جاتا ہے۔ مشورہ کو اگر حسنِ نیت کے ساتھ کیا جائے تو وہ ایک عبادت ہے۔ مشورہ دین اور دنیا دونوں قسم کے فائدوں کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے اصحاب کے ساتھ کھلا مشورہ کرتے تھے اور لوگ کسی پابندی کے بغیر اپنی رائے دیتے تھے۔

ماننے سے پہلے تحقیق

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں اجتماعی زندگی کے بارہ میں ایک اُصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی بات کو صرف سُن کر نہ مان لیا جائے۔ مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے'' (الحجرات ۶)

لوگ جب مل جُل کر رہتے ہیں تو اجتماعی زندگی کے نتیجہ میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی طرف سے بار بار خبریں پہنچتی ہیں۔ ان خبروں پر سننے والے کا ردعمل کیا ہونا چاہئے اسی کی بابت ایک اصول مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے۔ وہ اُصول یہ ہے کہ سننے والا جب کسی بات کو سُنے تو ماننے سے پہلے اُس کی تحقیق کرے۔ تحقیق کے بغیر صرف سننے کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہ کی جائے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر ایک کی بات دوسرے تک صحیح شکل میں نہیں پہنچتی۔ بات کو پہنچانے والا

درمیانی شخص اکثر بات کو بدل دیتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر بات کا ایک بیک گراؤنڈ یا موقع ومحل ہوتا ہے۔ مگر بات کو نقل کرنے والا اکثر ایسا کرتا ہے کہ وہ بیک گراؤنڈ کو بتائے بغیر مجرّد شکل میں بات کو بیان کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہے اور سننے والے تک پہنچ کر وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر سننے والا آدمی غلط رائے قائم کرتا ہے اور غلط اقدام کر ڈالتا ہے۔ جس کا نتیجہ آخر کار اس صورت میں نکلتا ہے کہ آدمی اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے، حالاں کہ اب وقت اُس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ ہر سماج میں پیش آتا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر یہ مزاج بنائے کہ وہ صرف سن کر کسی بات کو نہ مان لے۔ ماننے سے پہلے وہ ضروری تحقیق کرے۔ اور اگر وہ تحقیق نہیں کر سکتا تو ایسی حالت میں اُس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ سُنی ہوئی بات کو بھلا دے۔ وہ اُس پر نہ کوئی رائے قائم کرے اور نہ اُس کی بنیاد پر کسی اقدام کا منصوبہ بنائے۔

کلام کے آداب

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں کچھ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔ یہ اخلاقی ہدایات کلام کے آداب سے متعلق ہیں۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو''۔ (الحجرات ۱۱)

قرآن کی اس آیت میں اُس اجتماعی مسئلہ کا ذکر ہے جو اکثر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اختلاف پیش آتے ہی دوسرے کو غلط اور اپنے کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ اس نفسیات کے تحت یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ وہ اُس کے خلاف تحقیری الفاظ بولتا ہے۔ وہ اُس کی طعنہ زنی کرتا ہے۔ وہ اُس کو بُرے نام سے پُکارنے لگتا ہے۔ وہ اُس کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیزیں سماج کے اندر آپس کے

تعلقات میں کڑواہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ خوشگوار باہمی تعلقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک سماجی بگاڑ ہے جس کا بُرا نتیجہ ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگ صرف رایوں کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے بارہ میں بُرا گمان قائم نہ کریں۔ اختلاف کے وقت لفظی ریمارک دینے سے مکمل پرہیز کریں۔ اس کے بجائے وہ ایسا کریں کہ جب کسی سے اختلاف پیدا ہو تو سنجیدگی اور غیر جانبداری کے ساتھ اُس پر غور کریں اور پھر اپنی بات کو دلیل کے انداز میں بیان کریں۔ علمی تنقید میں کوئی حرج نہیں مگر ذاتی تنقیص یقینی طور پر بری چیز ہے اور انسان کی اجتماعی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

اجتماعی زندگی میں لوگوں کا سابقہ ایک دوسرے کے ساتھ جس چیز میں پڑتا ہے وہ زبان ہے۔ زبان کا غلط استعمال آپس میں تلخی پیدا کر دیتا ہے اور زبان کا درست استعمال آپس میں محبت کو بڑھاتا ہے۔ زبان سے آدمی صرف کچھ الفاظ بولتا ہے مگر یہ الفاظ عملی اعتبار سے بڑے بڑے نتائج پیدا کرتے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی، خواہ خاندانی زندگی ہو یا وسیع تر معنوں میں سماجی زندگی، ہر جگہ زبان کا استعمال بے حد اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ زبان کے استعمال میں بے حد محتاط رہے۔

ڈی کنڈیشننگ کی ضرورت

قرآن کی سورہ نمبر ۵۰ میں آخرت کا ایک منظر بتایا گیا ہے۔ حق کے منکرین دوبارہ زندہ ہو کر خدا کے سامنے لائے جائیں گے۔ اُس وقت خدا اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے گا

وجاءت كل نفس معها سائق وشهيد، لقد كنت في غفلة من هذا فكشفنا عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد :

''ہر شخص اس طرح آ گیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اس سے غفلت میں رہے، پس ہم نے تمہارے اوپر سے پردہ ہٹا دیا، پس آج تمہاری نگاہ تیز ہے''۔ (ق ۲۱۔۲۲)

قرآن کی ان آیتوں میں جس معاملہ کا ذکر ہے اُس کو انسانی زبان میں کنڈیشننگ اور ڈی

کنڈیشننگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ آدمی اپنے بچپن میں اور جوانی کی عمر میں ذہنی اعتبار سے غیر پختہ (immature) ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں وہ تجزیہ کرنے اور صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے متاثر ذہن بن جاتا ہے۔ اسی کو نفسیات کی اصطلاح میں کنڈیشننگ (conditioning) کہتے ہیں۔ اس کنڈیشننگ کی بنا پر آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ چیزوں کو بے آمیز صورت میں دیکھ سکے۔ وہ چیزوں کو ویسا نہیں دیکھتا جیسا کہ وہ ہیں۔ بلکہ وہ چیزوں کو اُس طرح دیکھتا ہے جیسا کہ اُس کا ذہن اُس کو دکھانا چاہتا ہے۔

اس لیے صحیح طرزِ فکر یا آبجیکٹیو تھنکنگ (objective thinking) کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے ذہن کے اوپر پڑے ہوئے مصنوعی پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹادے۔ خود احتسابی کا یہ عمل ہر آدمی کو لازماً کرنا ہے۔ اس ڈی کنڈیشننگ کے بغیر کوئی آدمی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ حقیقت بیں بنے، وہ چیزوں کے بارہ میں بالکل درست رائے قائم کرسکے۔

لالچ کا نقصان

قرآن کی سورہ نمبر ۵۹ میں ایک ایسی اخلاقی بُرائی کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی کامیابی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں'' (الحشر ۹)

لالچ (شُحّ نفس) کیا ہے۔ یہ دراصل دل کی تنگی ہے۔ یہ دل کی تنگی سے پیدا ہونے والی صفت کا دوسرا نام ہے۔ انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ..... تنگ دل اور فراخ دل۔ تنگ دل انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے دائرہ میں سوچے۔ جس کا مقصد صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا ہو۔ یہی وہ آدمی ہے جو لالچ یا شحِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کوئی شخص جب بھی کوئی فائدہ حاصل کرتا ہے تو وہ سماج کے مجموعی تعاون کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ ایسی حالت میں لالچ یا تنگ دلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے لیے تو سماج سے لینا چاہتا

ہے مگر وہ خود سماج کو دینا نہیں چاہتا۔ اس قسم کی خودغرضی کبھی کسی کے لیے مفید نہیں ہوسکتی، نہ فرد کے لیے اور نہ قوم کے لیے۔

اس دنیا میں کامیابی صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو کھلا دل رکھتے ہوں۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جتنا بڑا دل اُتنی بڑی کامیابی۔ بڑے دل والا آدمی اس بات کا حوصلہ رکھتا ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت کرے۔ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر خوش ہو۔ وہ شکایت کے باوجود دوسروں کے ساتھ بہتر معاملہ کرے۔ وہ معاملات کو بُلند سطح سے دیکھے۔ جس آدمی کے اندر یہ اعلیٰ صفات ہوں وہ لوگوں کے درمیان باعزت درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور جو آدمی دوسروں کے درمیان باعزت درجہ حاصل کرلے اُس کی کامیابی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

ایثارِ نفس

قرآن کی سورہ نمبر ۵۹ میں اعلیٰ انسانوں کی صفات بتائی گئی ہیں۔ ان اعلیٰ صفات میں سے ایک صفت ایثارِ نفس ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں۔ اگر چہ اُن کے اوپر فاقہ ہو'' (الحشر ۹)

ایثارِ نفس ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ ایثارِ نفس کا مطلب ہے، اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا۔ اپنے حق میں کمی کرکے دوسرے کا حق پورا کرنا۔ یہ صفت ایک فرد کے لیے اعلیٰ انسانیت کا مظاہرہ ہے، اور سماجی اعتبار سے وہ سماج کی مجموعی ترقی کا ضامن ہے۔

انسانیت کی مجموعی ترقی کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی صفت ہے۔ جس سماج کے افراد میں یہ مزاج ہو کہ وہ اپنے آپ کو بھلا کر دوسرے کی مدد کریں۔ وہ اپنی سیٹ کو خالی کرکے دوسرے کو بیٹھنے کی جگہ دیں۔ وہ دوسرے کی خوبی کا اعتراف کرکے اُس کو آگے بڑھائیں تو ایسے سماج میں مجموعی ترقی کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

جس سماج میں یہ صفت ہو اُس میں آپس کی محبت بڑھے گی۔ لوگ ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے پر تیار رہیں گے۔ سماج کے لوگوں میں حسد اور بُغض اور خودغرضی جیسی برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ ایسے سماج میں اعلیٰ اخلاقی اوصاف پرورش پائیں گے۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے

کے لیے خیر خواہی ہوگی۔ ایسا سماج گویا ایک خاندان کی مانند ہوگا جس میں لوگ بھائی بہن کی طرح مل کر رہیں گے۔

ایثار نفس بظاہر ایک قربانی ہے۔ مگر اُسی میں ذاتی فائدہ کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ جو آدمی دوسروں کے ساتھ ایثار کا معاملہ کرے وہ دوسروں کے دل کو جیت لیتا ہے، اور جب دلوں کو جیت لیا جائے تو اُس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

اعلیٰ اخلاق

قرآن کی سورہ نمبر ۶۸ میں اعلیٰ اخلاق اور بُلند کردار اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اُس کو انسانیت کا اعلیٰ مرتبہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو'' (القلم ۴)

اس آیت میں بظاہر رسول سے خطاب ہے۔ مگر وہ ہر انسان کے لیے ایک عمومی تعلیم ہے۔ وہ ہر انسان کو اعلیٰ انسان بننے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویّہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اُس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی، بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے۔ خواہ دوسرے اُس کے ساتھ برائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

اعلیٰ انسان کا اخلاق یہی دوسرا اخلاق ہوتا ہے۔ اس قسم کا اخلاق کسی انسان کے بارہ میں یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک با اُصول انسان ہے۔ ایسا اخلاق اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کی شخصیت حالات کی پیداوار نہیں بلکہ وہ خود اپنے اختیار کردہ اعلیٰ اصول کی پیداوار ہے۔ جس انسان کے اندر اس قسم کا اعلیٰ اخلاق ہو وہی حقیقی انسان ہے اور جس آدمی کے اندر یہ اعلیٰ اخلاق نہ پایا جائے وہ انسان کی صورت میں ایک حیوان ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اعلیٰ اخلاق کی صفت انسان کو حیوان سے جُدا کرتی ہے۔ حیوان مساویانہ اخلاق کی سطح پر جیتے ہیں۔ کوئی اُن کو نہ چھیڑے تو وہ بے ضرر رہیں گے اور اگر کوئی اُن کو چھیڑ دے تو وہ اُس کے لیے ضرر

رساں بن جائیں گے۔ اعلیٰ انسانی اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویّہ سے بُلند ہو کر اپنا رویہ بنائے۔ دوسرے لوگ خواہ اُس کے ساتھ اچھے نہ ہوں مگر وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا معاملہ کرے۔

ناپ تول میں فرق کرنا

قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں زندگی کی ایک حقیقت کا بیان ہے۔ قرآن میں اس کو تطفیف کے لفظ میں بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی مذکورہ آیت یہ ہے:

''خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں۔ اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں'' (التطفیف ۱۔۳)

قرآن کی اس آیت میں ناپ اور تول کی مثال سے ایک سماجی بُرائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں اُس کردار کا ذکر ہے جس کا یہ حال ہو کہ اُس کو جب اپنے لیے لینا ہو تو وہ بھرپور طور پر لے۔ اور جب دوسروں کو دینا ہو تو وہ کمی کر کے دوسروں کو دے۔ یہ تفریق ایک ایسی اخلاقی بُرائی ہے جو آدمی کو تباہی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتی۔

اس معاملہ کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ مثلاً خود اپنی تعریف سننے کا حریص ہونا مگر دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں بُخل کرنا۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے خوب ہوشیار ہونا مگر دوسروں کے مفاد کو سمجھنے کے لیے نادان بن جانا۔ معاملات میں اپنے لیے رعایت چاہنا اور دوسروں کو رعایت دینے کے لیے تیار نہ ہونا۔ اپنی ذات کے معاملہ میں حسّاس ہونا اور جب معاملہ دوسروں کا ہو تو بے حس بن جانا۔ اپنے لیے انصاف چاہنا اور دوسروں کے ساتھ بے انصافی پر راضی رہنا۔ یہ تو جاننا کہ مجھے کیا پسند ہے، مگر دوسروں کی پسند اور ناپسند کے بارہ میں بے خبر رہنا۔ اپنی عزت خطرہ میں ہو تو اُس کو برداشت نہ کرنا مگر دوسروں کی عزت پر حملہ ہو تو اُس کے بارہ میں بے حس بن جانا، وغیرہ۔

اپنے اور غیر میں اس قسم کا ہر فرق تطفیف ہے۔ جس آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج ہو وہ کبھی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس قسم کا مزاج آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش رُک جائے اُس کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ

وہ انسانی ترقی کے اعلیٰ مراحل طے کرنے سے محروم رہے اور آخر کار وہ اسی حال میں مر جائے۔

مشقتوں کے درمیان

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، خواہ وہ بظاہر اچھے ہوں یا بُرے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے'' (البلد ۴)

قرآن کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں انسان کے ساتھ بار بار پُر مشقت حالات پیش آئیں، اُس کو مختلف قسم کی مشکلات سے گذرنا پڑے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ کسی بھی تدبیر کے ذریعہ اس قانون کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ہر انسان کو لازماً اس امتحان سے گذرنا ہے۔ مشقتوں سے باہر اپنے سفر کے لیے کوئی آسان راستہ ممکن نہیں۔

زندگی کو اس نہج پر کیوں بنایا گیا۔ یہ خود انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ مشقتیں انسان کو انسان بناتی ہیں۔ مشقتیں انسانی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ مشقتوں کے درمیان انسان کو وہ سبق اور وہ تجربہ حاصل ہوتا ہے جو اُس کے ذہنی ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔

مشکلات انسان کے ذہن کو جگاتی ہیں۔ مشکلات انسان کو سنجیدہ بناتی ہیں۔ مشکلات انسان کو حقیقت پسند بنانے کا ذریعہ ہیں۔ مشکلات سے گذرنے کے بعد انسان کے اندر وہ اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو احتیاط، ضبطِ نفس، ڈسپلن، احساسِ ذمہ داری اور اعتراف کہا جاتا ہے۔ جو لوگ مشقت کے کورس سے نہ گذریں وہ سطحی انسان بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

مشقت اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی مصیبت یا برائی نہیں، مشقت انسانی زندگی کے لیے ایک ترقیاتی کورس ہے۔ جو انسان مشقتوں کا تجربہ نہ کرے وہ زندگی کی گہری حقیقتوں سے بے خبر رہے گا۔ مشقت ایک کورس ہے جو آدمی کو گہری حقیقتوں سے واقف کراتا ہے۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو ظہور میں لاتا ہے۔ وہ کسی آدمی کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ مشقت زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کے ہم معنٰی ہے۔ مشقت ہر قسم کی ترقیوں کا زینہ ہے، جہاں مشقت نہیں وہاں ترقی بھی نہیں۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ نمبر ۹۴ میں فطرت کے ایک اٹل قانون کا بیان ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر خاتمہ ایک نئے امکان کو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کسی کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان یہ ہے:

''پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے'' (الانشراح ۵۔۶)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کے ایک راز کو کھولا گیا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی مسئلہ کبھی اکیلا نہیں آتا۔ وہ اپنا حل بھی اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ اس دنیا میں ہر ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ ایڈوانٹج موجود ہے۔ اس دنیا میں ہر مائنس پوائنٹ کے ساتھ پلس پوائنٹ شامل ہے۔ اس دنیا میں ہر نقصان کے ساتھ فائدہ کا ایک امکان چھپا ہوا ہے۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں کوئی حالت یکساں طور پر باقی نہ رہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر تاریکی اپنے ساتھ روشنی لے آتی ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہئے کہ اُس کو کوئی سٹ بیک (set back) پیش آئے تو وہ نہ گھبرائے اور نہ وہ مایوس ہو۔ اگر وہ اپنے ہوش وحواس کو برقرار رکھے تو بہت جلد وہ دوبارہ اپنے حق میں ایک نیا امکان پالے گا۔ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کر کے دوبارہ ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچ جائے گا۔

انسان کا درجہ

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں انسان کے بارہ میں ایک تاریخی قانون کو بتایا گیا ہے۔ بعض تاریخی شہادتوں کو پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال کیے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے''۔ (التین ۴۔۶)

قرآن کی ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے امکان (potential) کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مخلوق کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر اس امکانی درجہ تک صرف وہ لوگ پہنچیں گے جو اس تخلیقی

اسکیم کو شعوری طور پر سمجھیں اور اُس کے مطابق اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کر سکیں وہ سارے امکان کے باوجود محرومی کا کیس بن کر رہ جائیں گے۔

اپنے امکان کو واقعہ بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی غور و فکر کے ذریعہ اپنے بارہ میں تخلیق کے نقشہ کو سمجھے۔ پھر وہ اس تخلیقی نقشہ سے کامل رعایت کرتے ہوئے اُس کے مطابق اپنی عملی سرگرمیاں جاری کرے۔ وہ حق اور ناحق میں فرق کرنا جانے، وہ ناحق سے دور رہتے ہوئے اپنے آپ کو حق کا پابند بنائے۔

امکان خدا کا عطیہ ہے۔ مگر امکان کو واقعہ بنانا انسان کا ذاتی فعل ہے۔ جو آدمی اپنے ذاتی حصہ کی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا، کوئی دوسری چیز اُس کو اس انجام سے بچانے والی نہیں۔

علم سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۱۰ء میں آپ پر خدا کی طرف سے پہلی وحی اُتری۔ یہ ابتدائی کلام جو خدا کی طرف سے آپ کو ملا وہ یہ تھا:

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا''۔ (العلق ۱۔۵)

قرآن میں اترا ہوا یہ پہلا کلام الٰہی بتاتا ہے کہ کسی حقیقی عمل کا آغاز کیا ہے۔ یہ آغاز علم ہے۔ یعنی انسان کو باشعور بنانا۔ انسان کے اندر ذہنی تبدیلی لانا، انسان کے اندر فکری انقلاب پیدا کرنا۔ یہی انسانوں کے درمیان کسی حقیقی تحریک کا آغاز ہے۔ اس دنیا میں وہی انسانی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے جو شعور کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرے۔

علم طاقت ہے۔ علم اس دنیا میں سب سے بڑا ہتھیار ہے، ایک فرد کے لیے بھی اور پوری انسانیت کے لیے بھی۔ علم کا آغاز مائنڈ سے ہوتا ہے مگر وہ پوری خارجی دنیا کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

علم کسی آدمی کی تکمیل ہے۔ علم کے بغیر کوئی انسان ادھورا انسان ہے۔ علم کے بعد وہ مکمل انسان بن جاتا ہے۔ علم سے خالی انسان صرف اپنی ذات کو جانتا ہے۔ علم کے حصول کے بعد آدمی پورے

کائنات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ علم کسی ناقص انسان کو ایک کامل انسان بنا دیتا ہے۔

کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۳ میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو حقیقی تعمیر کے لیے اُس چیز کی ضرورت ہے جس کو ٹائم مینجمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس ٹائم مینجمنٹ کے بغیر کسی کے لیے حقیقی ترقی کو پانا ممکن نہیں۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

''زمانہ گواہ ہے۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی''۔
(العصر ۱۔۳)

قرآن کی اس سورہ میں زندگی کی ایک اہم حقیقت کے بارہ میں انسان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر لمحہ زندگی سے موت کی طرف جا رہا ہے۔ ہر لمحہ انسان کا کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ یہ فطرت کا ایک لازمی قانون ہے۔ اس قانون کو دوبارہ اُلٹی طرف چلایا نہیں جا سکتا۔

مثال کے طور پر ایک شخص کی مقرر عمر اگر ۸۰ سال ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اُس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ ہر سال اس کی عمر میں ایک سال کی کمی کا اعلان ہے۔ گویا کہ اُس کی عمر کا سفر اس طرح ہو رہا ہے— ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰ الخ۔ اسی کاؤنٹ ڈاؤن کو قرآن کی مذکورہ سورت میں خُسران کہا گیا ہے۔

آدمی ہر لمحہ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی مہلت عمر کو استعمال نہ کرے تو آخرکار اُس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف ہلاکت ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے آدمی کو خود عمل کرنا ہے۔ جب کہ ناکامی کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔

حکمتِ حدیث

001 — علم کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۱۰ء میں جب کہ آپ کی عمر ۴۰ سال کی ہوگئی تو آپ کو خدا نے نبوت عطا فرمائی۔ خدا کی طرف سے پہلی وحی جو آپ پر آئی وہ یہ تھی: پڑھ، اپنے رب کے نام سے جس نے تم کو پیدا کیا۔ انسان کو علق سے پیدا کیا۔ پڑھ، اور تمہارا رب کریم ہے۔ اس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا (العلق)

حقیقت یہ ہے کہ علم تمام انسانی ترقیوں کا آغاز ہے۔ انسان کو خدا نے بظاہر ایک حیوان کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ مگر انسان کو ایک امتیازی صلاحیت دی گئی ہے اور وہ اس کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ میں لامحدود حد تک غیر معمولی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ اس صلاحیت کو بیدار کرنے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ علم کی مدد سے انسانی دماغ ترقی کرتا ہے اور بڑھتے بڑھتے اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔

علم کے ذریعہ آدمی تاریخ کو جانتا ہے۔ وہ فطرت کے رازوں کو دریافت کرتا ہے۔ وہ چیزوں کی ظاہری سطح سے گزر کر ان کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ علم کی یہ اہمیت ایک انسان کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ دوسرے انسان کے لیے۔

002 — علم حاصل کرو

پیغمبر اسلام نے فرمایا: علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔ اس حدیث سے اسلام میں علم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ خدا کی معرفت علم کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس لیے علم سیکھنے کو فرض قرار دیا گیا۔ علم آدمی کے شعور کو بڑھاتا ہے۔ علم سے آدمی کے ذہن کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ علم سے سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ علم کے ذریعہ آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زیادہ گہری حقیقتوں کو سمجھ سکے، وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذہنی معیار کو بلند کرسکے۔

مذہبی اور روحانی ارتقاء کے لئے علم لازمی طور پر ضروری ہے۔ علم کے ذریعہ ذہن میں پختگی آتی ہے۔ علم کے ذریعہ فکری ارتقاء کا عمل جاری ہوتا ہے۔ علم کے بغیر آدمی نہ مقدس کتابوں کو پڑھ سکتا ہے اور نہ تاریخ اور کائنات کے بارے میں زیادہ باخبر ہوسکتا۔ علم آدمی کو حیوان کی سطح سے اٹھا کر انسان کی سطح پر پہنچا دیتا ہے۔

003 — سیکھنے کا مزاج

خلیفہ ثانی عمر فاروق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ملنے والے سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کے اندر سیکھنے کا عمل (learning process) ہمیشہ جاری رہتا تھا۔

ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ وہ اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی جب بھی کسی سے ملے تو کھلے ذہن کے ساتھ ملے۔ وہ اس کو سکھانے سے زیادہ اس سے سیکھنے کی کوشش کرے۔ سیکھنے کے اس عمل کو مفید طور پر جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی متعصّبانہ سوچ سے پاک ہو، وہ بڑائی کے جذبہ میں نہ جیتا ہو۔ اس کی نفسیات یہ ہو کہ جو کچھ مجھے ملے گا اس کو فوراً لے لوں گا۔ جب بھی میری کوئی غلطی مجھ پر واضح کی جائے گی تو میں فوراً اس کا اعتراف کر کے اپنے کو صحیح کر لوں گا۔

سیکھنے کے عمل کو مفید بنانے میں اگر سکھانے والے کا کردار اہم ہے تو اس سے بھی زیادہ اس میں سیکھنے والے کے کردار کا دخل ہے۔ سیکھنے والے میں جتنا زیادہ صحیح مزاج ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ دوسروں سے لینے میں کامیاب رہے گا۔ دنیا میں ہر لمحہ علم اور معرفت کی بارش ہو رہی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے پاس اس کو لینے کا برتن (container) موجود ہو۔

004 — علم کا خزانہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں وہ اس کو پائے تو وہ اسی کا ہے۔ یہ حدیث علم کی آفاقیت کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم خواہ کہیں بھی ہو یا کسی کے پاس بھی ہو وہ یکساں طور پر سارے انسانوں کا حصہ ہے۔

علم ایک مشترک خزانہ ہے۔ علم کسی کی اجارہ داری نہیں، علم ہر قسم کے تعصب سے بلند ہے۔ علم سورج کے مانند ہے جس سے روشنی لینے کا حق جتنا کسی ایک کو ہے اتنا ہی حق دوسرے کو بھی ہے۔

علم کے معاملہ میں آفاقیت کا یہ تصور بے حد ضروری ہے۔ اس تصور کے بغیر علم کی ترقی ممکن نہیں۔ علم کا خزانہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ خواہ اس کو کتنا ہی زیادہ استعمال کیا جائے، اس میں کوئی کمی نہیں

آتی۔ علم ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے جو ہر طالب کی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر اس کا اپنا ذخیرہ اس کے بعد بھی تنا ہی زیادہ باقی رہتا ہے جتنا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔

005 — علم کا حصول

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ علم حاصل کرو، خواہ وہ چین میں ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے حصول میں کسی بھی قسم کے تعصب یا کسی بھی قسم کے عذر کو رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔

قدیم زمانہ میں چین کا سفر ایک مشکل سفر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو، یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر مشکل کو برداشت کر کے علم سیکھو۔ کسی بھی چیز کو اس معاملہ میں رکاوٹ نہ سمجھو۔ علم کے بغیر انسان گویا خام لوہا (ore) ہے۔ یہ علم ہے جو انسان کو اسٹیل بناتا ہے۔ زندگی کے سادہ پہلو کو آدمی علم کے بغیر بھی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن زندگی کی گہرائیوں تک پہنچنا علم کے بغیر ممکن نہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کے لیے سفر کرنا ضروری ہے۔ سفر کے بغیر علم میں کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوسکتا۔ سفر آدمی کے ذہنی افق کو بڑھاتا ہے۔ سفر آدمی کو مقامی علم سے اٹھا کر عالمی علم تک پہنچا دیتا ہے۔

006 — علم کا تحفہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے اچھا تحفہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو تعلیم دے۔ دوسرا کوئی بھی تحفہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے مگر علم کا تحفہ ایک ایسی چیز ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہر آدمی کا پہلا مدرسہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اس مدرسہ کے ٹیچر خود بچے کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس حدیث سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ماں باپ کو سب سے پہلے خود صاحب علم ہونا چاہئے کیوں کہ ماں اور باپ اگر صاحب علم نہ ہوں تو وہ نہ علم کی اہمیت کو سمجھیں گے اور اپنی اولاد کو تعلیم دینے میں صحیح طور پر اپنا حصہ ادا کرسکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ گھر کسی بچے کے لیے صرف پرورش کا مقام نہیں ہے بلکہ وہ اس کی تعلیم و تربیت کا مقام بھی ہے۔ ہر گھر کو تعلیم و تربیت کا ایک ادارہ ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر وہ گھر ایک ادھورا گھر ہے نہ کہ مکمل معنوں میں گھر۔

007 — علم کی برتری

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ شہید کے خون کے مقابلہ میں عالم کے قلم کی روشنائی زیادہ افضل ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کی عظمت تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ علم کا تعلق ذہن سے ہے۔ علم سے ذہن کو تندرستی ملتی ہے، ذہنی سوچ میں اضافہ ہوتا ہے، علم سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ذہن معاملات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھے اور زیادہ بہتر طور پر عمل کی منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جائے۔

کوئی بھی جسمانی عمل ایک محدود عمل ہے۔ ایک مقام تک پہنچ کر جسمانی عمل کی حد آ جاتی ہے مگر علم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جس آدمی کو علم حاصل ہو اس کی شخصیت بے پناہ حد تک وسیع ہو جائے گی۔ وہ ہر قید سے باہر آ کر سوچنے کے قابل ہو جائے گا۔ وہ ایک ایسا انسان بن جائے گا جس کو کوئی زیر نہ کر سکے۔ جس طرح علم کی کوئی حد نہیں اسی طرح اس انسان کی بھی کوئی حد نہیں جو علم کی دولت کا مالک ہو جائے۔

008 — علم کا ریکارڈ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ علم کو کتابت کے ذریعہ محفوظ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو علم تمہارے ذہن میں ہے اس کو کاغذ پر لکھ لو۔ اس طرح وہ اپنی صحیح شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔

اس تعلیم کا ایک استعمال یہ ہے کہ علم کو کتابوں میں منتقل کیا جائے۔ ہر علمی موضوع پر کتابیں لکھ کر تیار کی جائیں۔ علم کو دماغ سے نکال کر لائبریری کی صورت میں ذخیرہ کر دیا جائے۔

اس معاملہ کی ایک صورت وہ بھی ہے جس کو ڈائری کہا جاتا ہے۔ اس طرح اس تعلیم کی ایک پیروی یہ بھی ہو گی کہ ہر آدمی اپنی ایک ڈائری رکھے۔ وہ اپنے روزانہ کے مطالعہ اور تجربہ کو مختصر طور پر اس میں تاریخ وار درج کرتا رہے اس طرح ہر آدمی کے علمی سفر کا ایک روزنامچہ تیار ہوتا رہے گا۔

یہ ڈائری آدمی کے روزانہ ذہنی سفر کا ایک ریکارڈ ہو گی، وہ اپنے احتساب کا ایک مؤثر ذریعہ ہو گی۔ آدمی اپنی ڈائری کے ذریعہ اپنی کامیابی اور ناکامی کو جان کر اپنی اصلاح کرتا رہے گا۔ اس طرح ڈائری اس کی شخصیت کے ارتقاء کا ذریعہ بن جائے گی۔

009 — علم برائے علم

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ علم کو گہوارہ مادر سے لے کر قبر تک حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کسی وقتی نفع یا کسی وقتی جاب کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک مستقل عمل ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک جاری رہتا ہے۔ لہذا علم اپنے آپ میں مطلوب ہے۔ علم کا اصل مقصد انسانی شخصیت کی تعمیر ہے۔ یہ کوئی وقتی کام نہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہر مقام پر جاری رہتا ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی تعلیم وتربیت کا عمل بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

علم یا تعلیم کا اصل مقصد شعور کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو سمجھے۔ وہ کبھی محدود سوچ میں مبتلا نہ ہو۔ اس کا ذہن کبھی جمود کا شکار نہ ہونے پائے۔ علم انسانی شخصیت کی غذا ہے۔ جس طرح جسم مادّی غذا کے بغیر ناکارہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی شخصیت علم کے بغیر ناقص ہو جاتی ہے۔ اور ناقص شخصیت موجودہ دنیا میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کرسکتی۔

010 — غیر مفید علم

پیغمبر اسلام کی ایک دعا یہ تھی: اللهم إني اعوذبك من علم لا ينفع (اے خدا، مجھ کو ایسے علم سے بچا جو بے فائدہ ہو) گویا وہی علم علم ہے جو انسانیت کے لئے مفید ہو، جو علم انسانیت کے لیے مفید نہ ہو وہ کوئی مطلوب علم نہیں۔ ایسے علم کے حصول میں اپنا وقت لگانا جس میں کوئی حقیقی فائدہ نہ ہو، وقت کو ضائع کرنا ہے۔

011 — نمو پذیر شخصیت

قرآن میں سچے انسان کی مثال پودے سے دی گئی ہے۔ جس طرح پودا بڑھ کر درخت بنتا ہے اسی طرح انسان کی شخصیت بھی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ شاداب درخت کی طرح وہ ایک ترقی یافتہ شخصیت بن جاتی ہے۔ انسان چھوٹے بچے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد بڑھتے بڑھتے وہ پورا آدمی بن جاتا ہے۔ یہ معاملہ جسم کی ترقی کا ہے۔ اسی طرح انسان کا ذہن بھی ترقی کرتا ہے۔ یہ ترقی تفکیری عمل (thinking process) کے ذریعہ جاری ہوتی ہے۔ اگر یہ تفکیری عمل

صحت مند انداز میں جاری رہے تو انسان کا ذہن بھی اسی طرح ترقی کے درجہ تک پہنچ جائے جس طرح اس کا جسم ترقی کے درجہ تک پہنچتا ہے۔

یہ تفکیری عمل فطری طور پر ہر انسان کے اندر جاری ہوتا ہے۔ انسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے جو تفکیری عمل میں رکاوٹ ڈالنے والی ہیں۔ اگر تفکیری عمل کو رکاوٹ سے بچایا جائے تو وہ ایک چشمہ کی طرح بہتا رہے گا یہاں تک کہ وہ ایک عظیم دریا بن جائے گا۔

012 — جاننے والے سے پوچھنا

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والے سے پوچھو۔ یعنی نہ جاننے والا جاننے والے سے پوچھے اور اس طرح اپنے نہ جاننے کو جاننا بنائے۔ لوگ عام طور پر پوچھنے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھنے کا مطلب گویا یہ اقرار کرنا ہے کہ تم جانتے ہو، میں نہیں جانتا۔ یہ ایک مہلک عادت ہے۔ صحت مند عادت یہ ہے کہ پوچھنے کو ویسا ہی سمجھا جائے جیسا کہ ڈکشنری یا انسائیکلوپیڈیا کا مطالعہ کرنا۔

کوئی آدمی خود سے ساری باتوں کو جان نہیں سکتا۔ اسی کمی کی تلافی کے لیے وہ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی طرح اس کو یہ عادت ڈالنا چاہئے کہ وہ جاننے والے سے پوچھے۔ جاننے والا اس کے لیے گویا ایک زندہ کتاب ہے۔ اگر کتاب کو پڑھنے میں اسے کوئی احساس نہیں روکتا تو جاننے والے سے پوچھنے میں بھی کسی احساس کو رکاوٹ نہیں ہونا چاہئے۔ جاننے والے سے پوچھنا باہمی تعلقات کو بڑھاتا ہے۔ وہ علم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ انسانی تعلقات میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

013 — خدا کی نعمتوں میں غور وفکر

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ غور وفکر بظاہر دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ وہ ذہن میں ہوتا ہے۔ مگر خدا کی نظر میں اس سے بڑا کوئی عمل نہیں۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں نعمت کا پہلو موجود ہے۔ غور وفکر کر کے ان نعمتوں کو جاننا، چیزوں میں نعمت کے پہلو کو دریافت کرنا، یہی وہ چیز ہے جس کو اس حدیث میں افضل عبادت کہا گیا ہے۔

چیزوں کونعمت کے پہلو سے دریافت کرنا ایک ایسا عمل ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کرتا ہے، جو آدمی کو خدا سے جوڑتا ہے۔ وہ آدمی کے لیے خدا کی معرفت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

014 — غور وفکر کا عمل

ابوالدرداء پیغمبر اسلام کے ایک صحابی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ایک شخص نے ان کی اہلیہ ام الدرداء سے پوچھا کہ ابوالدرداء کا سب سے بڑا عمل کیا ہوتا تھا۔ ام الدرداء نے جواب دیا کہ سوچنا اور عبرت پکڑنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی انسان کا سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے آس پاس کی چیزوں پر غور کرے اور ان سے عبرت کا پہلو اخذ کرتا رہے۔ یہ گویا ذہنی ارتقاء (intellectual progress) اور روحانی ارتقاء (spiritual developement) کا عمل ہے۔ جو سنجیدہ غور وفکر کی صورت میں انسان کے اندر جاری ہوتا ہے۔ وہ موت سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔

015 — علمی تواضع

پیغمبر اسلام کے ایک صحابی عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ جب تم کسی بات کو نہ جانو تو تم یہ کہہ دیا کرو کہ: اللــه أعـلـم (اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے)۔ اس اصول کو دوسرے لفظوں میں، علمی تواضع کہا جا سکتا ہے۔ اور علمی تواضع علمی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔

عربی زبان کا ایک مثل ہے: لاأدری نـصـف الـعـلـم (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے)۔ یہ کہہ سکنا کہ میں نہیں جانتا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اپنے نہ جاننے کو جاننا ہے۔ جب آدمی اپنے نہ جاننے سے باخبر ہو جائے تو اس کے اندر تجسس کی روح (spirit of inquiry) جاگتی ہے جو آخر کار اس کو علم تک پہنچا دیتی ہے۔ جب آدمی ایک بات کو نہ جانے تو اس کو اپنے نہ جاننے کا اعتراف کرنا چاہئے۔ اپنے نہ جاننے کا اعتراف بھی جاننے کی طرح ایک قدم ہے۔ اس مزاج کے بغیر کوئی آدمی علمی ترقی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

016 — تعلیم وتربیت

پیغمبر اسلام کے ایک ساتھی کہتے ہیں کہ ایک چڑیا بھی اگر فضا میں اڑتی ہوئی دکھائی دیتی تو آپ اس سے ہم کو ایک علم کی یاد دہانی کراتے تھے (مامن طائرٍ یطیر بجناحیه إلا و هویذکر لنا منه علماً)

اس حدیث سے تعلیم وتربیت کا ایک توسیعی تصوّر سامنے آتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت کے عمل کا تعلق صرف اسکول اور مدرسہ سے نہیں۔ بلکہ اسکول کے احاطہ سے باہر بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کی دنیا میں ہر چھوٹی بڑی چیز کے اندر کوئی نہ کوئی علم چھپا ہوا ہے۔ معلّم اگر بیدار ذہن رکھتا ہوتو وہ اپنے طلبہ کے لیے اسکول کے اور مدرسہ کے باہر کی دنیا کو بھی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔اسی طرح ایک رہنما اپنے پیروؤں کے لیے ہر منظراور ہر تجربہ سے علم اخذ کرکے ان کی ذہنی اور روحانی تربیت کا سامان کرسکتا ہے۔ ہماری دنیا پوری کی پوری ایک وسیع تعلیم گاہ ہے۔ جوآدمی علم کا سچا طالب ہووہ ہر لمحہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے گا۔اس کا علمی سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔

017 — علم اور سنجیدگی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جوشخص اللہ سے ڈرے، وہ عالم ہے (من یخشی الله فهو عالم)۔ اس حدیث سے علم کا ایک اہم پہلو معلوم ہوتا ہے اور وہ سنجیدگی اور احتیاط ہے۔علم صرف واقفیت کا نام نہیں۔ کسی شخص کو جب گہرائی کے ساتھ علم حاصل ہوتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں وہ محتاط بن جاتا ہے۔ یہ احتیاط اس کے اندر سنجیدگی پیدا کرتی ہے۔ جہاں علم ہو اور سنجیدگی نہ ہوتو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہاں حقیقی معنوں میں وہ چیز نہیں جس کو علم کہا گیا ہے۔

سچا علم آدمی کو ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔ سچے علم والا انسان حقائق فطرت سے باخبر رہتا ہے اور جوآدمی حقائق فطرت سے باخبر ہوجائے وہ اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ تضاد میں جئے۔ وہ غیر محتاط انداز میں کلام کرے، وہ لوگوں کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کرے۔سچا علم آدمی کو ہر قسم کی غیر ذمّہ داری سے بچاتا ہے۔سچا علم آدمی کو پورے معنوں میں سنجیدہ اور ذمّہ دار انسان بنا دیتا ہے۔

018 — علم میں اضافہ

قرآن میں ایک دعا ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: ربِّ زدنی علما (اے میرے رب تو میرا علم زیادہ کردے)۔اس قرآنی دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کے حصول کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت مسلسل اپنے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

دعا دراصل عزم کی ایک صورت ہے۔ دعا کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح ایک مقصد کے حصول میں لگ جائے۔ وہ اپنی حد تک سب کچھ کرتے ہوئے خدا سے یہ دعا کرے کہ وہ اس کی کوششوں کو کامیاب کرے۔ اس طرح دعا خود آدمی کے عمل کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کی کوئی حد نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ کسی مقام پر رکے بغیر علم کے حصول کی کوشش میں لگا رہے۔ وہ اس معاملہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے علم میں اضافہ کے لیے برابر کوشاں رہے۔ علم کی کوئی حد نہیں اس لیے حصول علم کی راہ میں جدو جہد کی بھی کوئی حد نہیں۔

019 — بے جا عذر

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے فریب میں رہتا ہے — صحت اور فرصت۔ یعنی وہ سوچتا رہتا ہے کہ جب صحت ہوگی تب کرلوں گا اور جب فرصت ہوگی تب کرلوں گا، مگر زندگی میں صحت اور فرصت کبھی آتی نہیں۔ چنانچہ وہ اسی دھوکے میں رہتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔

عقل مند آدمی وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ وہ کسی عذر کو عذر نہ بنائے۔ جب بھی کوئی کام سامنے آئے وہ اس کو فوراً کر ڈالے۔ ابھی اور اسی وقت سے بہتر کام کرنے کا کوئی وقت نہیں:

There is no better time to start than this very minute.

020 — دل سے مسئلہ پوچھنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اپنے دل سے فتویٰ پوچھ لو (استفت قلبك) اس حدیث میں قلب سے مراد وہی چیز ہے جس کو کامن سنس کہا جاتا ہے۔

انسان کو بار بار مسئلے پیش آتے ہیں۔ ان مسئلوں میں اس کو ہر بار مفتی سے فتویٰ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آدمی اپنے آپ کو نفسیاتی پیچیدگی سے پاک رکھے تو اس کا کامن سنس اس کے لیے بہترین رہنما بن سکتا ہے۔ اور یہ کامن سنس ایک ایسی چیز ہے جس کو کہیں ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ آدمی کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

021 — حکمت کی بات

مشہور صحابی رسول حضرت عمر فاروق نے کہا: امیتوا الباطل بالصمت عنه (تم باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر)۔ یہ قول خاموشی کی طاقت کو بتاتا ہے۔

مشہور مثل ہے کہ تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ اگر آپ باطل کی طاقت کے بعد خود بھی جوابی کارروائی کریں تو باطل کو اس سے مزید طاقت مل جائے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ خاموشی کا طریقہ اختیار کریں تو باطل کا زور دھیرے دھیرے اپنے آپ ٹوٹ جائے گا۔ آپ کی طرف سے جوابی کارروائی نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فطرت کی طاقتیں آپ کی حمایت میں متحرک ہو جائیں گی۔ وہ آپ کے کام کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیں گی۔

022 — بلند ہمتی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ بلند ہمتی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان آدمی کو سب سے بڑا بھروسہ دے دیتا ہے۔ یہ بھروسہ اس کو بلند ہمت بنا دیتا ہے۔

مگر دنیا میں بار بار آدمی کو ناموافق حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ حالات اس کو مایوسی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر آدمی کو خدا کے اوپر یقین ہو جائے تو وہ آخری حد تک حوصلہ مند بن جائے گا۔ خدا پر یقین اس کو اس وقت بھی بھروسہ دے گا جب کہ بظاہر آدمی کے پاس کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔

023 — باقی رہنے والا عمل

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہو۔ اس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی ہمیشہ دیر میں ملتی ہے۔ اس لیے سب سے بہتر عمل وہ ہے جو قابل بقا (sustainable) ہو۔ اس دنیا میں نتیجہ خیز عمل وہی ہے جو شروع کرنے کے بعد برابر جاری رہے۔ جس پر آدمی اپنی پوری عمر قائم رہ سکتا ہو۔ ایسا ہی عمل فطرت کے قانون کے مطابق ہے۔ ایسا ہی عمل حقیقی معنوں میں عمل ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ عمل شروع کرنے سے پہلے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ وہ تمام متعلق

امور کا جائزہ لے۔ وہ اپنی صلاحیت اور دستیاب وسائل نیز وقت کے حالات، ہر چیز کا بھرپور اندازہ کرے اور پھر سوچے سمجھے نقشہ کے مطابق اپنا کام شروع کرے۔ اور جب وہ کام شروع کردے پھر وہ درمیان میں کبھی اس کو نہ چھوڑے۔ یہی دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔

024 — زمانہ سے باخبر ہونا

پیغمبر اسلام کی ایک لمبی حدیث ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے: عقلمند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا ہو۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان کے علم کی تکمیل کیا ہے۔ علم والا ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ آدمی کتابی معلومات سے واقف ہو۔ اس نے ماضی کی روایتوں کو یاد کر رکھا ہو۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ آدمی جس زمانہ میں ہے اس زمانہ کو جانے۔ وہ ماضی شناس ہونے کے ساتھ حال شناس بھی ہو۔

زمانہ کو جاننے کی اہمیت فکری بھی ہے اور عملی بھی۔ اس کے بغیر آدمی کی سوچ ناقص رہتی ہے۔ وہ باتوں کو آفاقی انداز میں سمجھ نہیں پاتا۔ حقیقت کا گہرا تجزیہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس طرح عملی اعتبار سے وہ ایک ناقص انسان ہوتا ہے۔ وہ یہ جاننے سے محروم رہتا ہے کہ وقت کے حالات میں ابدی سچائیوں کو کس طرح منطبق (apply) کرے۔ ایسا آدمی اپنے عمل کی کامیاب منصوبہ بندی نہیں کرسکتا۔

025 — بامقصد زندگی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ آدمی کے اچھے اسلام پر ہونے کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے۔ پیغمبر اسلام کا یہ قول بتاتا ہے کہ ایک بامقصد انسان کی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں کام زیادہ ہیں اور ایک شخص کی عمر بہت مختصر۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ آدمی اپنی مشغولیتوں میں انتخابی (selective) انداز اختیار کرے۔ وہ صرف ان چیزوں میں مشغول ہو جن کا تعلق براہ راست زندگی کے مقصد سے ہو۔ جو چیزیں اس کے مقصد کے لیے کارآمد نہیں ان سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔ وہ بے فائدہ کام اور فائدے والے کام میں فرق کرنا جانے۔

بے فائدہ کام سے مراد وہ کام ہے جو محض دلچسپی یا وقت گزاری کے لیے ہو، جس سے وقتی تفریح

کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے بے فائدہ کام میں مشغول ہونا ایک ایسا تعیش (luxury) ہے جس کا تحمل ایک با مقصد انسان نہیں کرسکتا۔

026 — نفع بخشی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے۔ یعنی جو شخص دوسروں کو نفع پہنچائے گا اس کو دوسروں سے فائدہ ملے گا۔ جتنا دینا اتنا پانا۔ اس اصول کے مطابق، جب بھی کسی کو محرومی کا تجربہ ہو تو اس کو یہ مان لینا چاہئے کہ ایسا اس لیے ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت نہ کر سکا۔ اس نے دوسروں کو محروم رکھا تھا اس لیے دوسروں نے بھی اس کو محروم کر دیا۔ اگر وہ دوسروں کو دیتا تو ضرور وہ بھی دوسروں سے پاتا۔

نفع بخشی کے اس اصول کا تعلق زندگی کے پورے معاملے سے ہے۔ اس کا تعلق خاندان سے بھی ہے اور سماج سے بھی۔ قومی زندگی سے بھی ہے اور بین اقوامی زندگی سے بھی۔ ہر انفرادی اور اجتماعی معاملے میں یہی اصول کارفرما ہے۔ اس کے مطابق، شکایت اور احتجاج کا طریقہ بالکل بے معنٰی ہے۔ اس دنیا میں ہر شکایت اور ہر احتجاج خود اپنی کوتاہی کے خلاف شکایت اور احتجاج ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع نہ کرے، بلکہ پہلی فرصت میں اپنی کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے آپ کو دوسرے کے لیے نفع بخش بنائے۔ یہی مسئلہ کا واحد حل ہے۔

027 — خاموشی میں نجات

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ جس طرح ایکشن لینا ایک کام ہے اسی طرح ایکشن نہ لینا بھی ایک کام ہے۔ جس طرح آگے بڑھنا ایک کام ہے اسی طرح پیچھے ہٹنا بھی ایک کام ہے۔ جس طرح طاقت کی پوزیشن میں فائدہ ہے اسی طرح تواضع کی پوزیشن میں بھی فائدہ ہے۔ چپ رہنا صرف نہ بولنے کا نام نہیں۔ چپ رہنا ایک تدبیر ہے۔ چپ رہنا خاموش منصوبہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شور کی سیاست کے مقابلہ میں چپ کی سیاست زیادہ نتیجہ خیز ہے۔

چپ رہنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ جب آدمی چپ رہتا ہے تو وہ سوچتا ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہے تو وہ دوسروں سے سیکھتا ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہے تو وہ اپنی اندرونی طاقتوں کو جگاتا ہے۔ یہ بلاشبہہ ضروری ہے کہ آدمی بولے۔ مگر اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ چپ رہنے کی حکمت کو جانے۔ کبھی بات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ آدمی چپ ہو جائے۔ چپ رہنا نظرانداز کرنے کی ایک علامت ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ نظرانداز کرنا ایک انتہائی حکیمانہ عمل ہے۔

028 — دو مختلف صفات

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کے اندر دو مختلف صفات رکھی گئی ہیں۔ ایک نفس امّارہ دوسرے نفس لوّامہ۔ یہ دونوں صفتیں پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر ہوتی ہیں۔ کوئی بھی انسان ان سے خالی نہیں ہے۔ نفس امّارہ سے مراد انانیت ہے اور نفس لوّامہ سے مراد ضمیر ہے۔ یہ دونوں صفتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اگر ان کو نہ جگایا جائے تو وہ سوئی ہوئی رہیں گی۔ اگر کسی آدمی کے خلاف ایسی بات کہی جائے جو اس کو اشتعال دلانے والی ہو تو اس کا نفس امّارہ جاگ پڑے گا اور پھر اس کا انجام وہی ہوگا جیسے کسی سوئے ہوئے سانپ کو جگا دیا جائے۔

اس کے برعکس اگر آدمی سے نرمی کا سلوک کیا جائے تو اس کا نفس لوّامہ جاگے گا۔ پہلے اگر دوسروں کو اس سے کانٹے کا تجربہ ہوا تھا تو اب دوسروں کو اس سے پھول کا تجربہ ہوگا۔ اب دوسروں کو اس سے انسانیت کی خوشبو حاصل ہوگی۔ اب وہ دوسروں کے لیے رحمت کا نمونہ بن جائے گا۔

029 — صبر سے کامیابی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جان لو، کامیابی صبر کے ساتھ ہے۔ صبر کا الٹا عجلت پسندی ہے۔ عجلت کی کارروائی منصوبہ کے بغیر ہوتی ہے اور صبر کی کارروائی منصوبہ کے بعد ہوتی ہے۔ اور اس دنیا میں وہی کارروائی کامیاب ہوتی ہے جو منصوبہ کے ساتھ کی گئی ہو۔

030 — ٹکراؤ سے پرہیز

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مومن کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرے گا۔ آپ نے جواب دیا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ اس حدیث میں زندگی کا ایک حکیمانہ اصول بتایا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ آدمی کی کارروائی ہمیشہ نتیجہ خیز ہونا چاہئے۔ ایک ایسی طاقت جس سے مقابلہ کرنے کا ساز وسامان اس کے پاس نہ ہو، اگر وہ کوئی عذر لے کر ایسی طاقت سے ٹکرا جائے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ ذلت اور ناکامی سے دوچار ہوگا۔ ایسا فعل جو یکطرفہ طور پر خود فاعل کی تباہی میں اضافہ کرنے والا ہو اس میں اپنے آپ کو الجھانا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔

031 — اپنے سے کم کو دیکھو

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مادّی معاملہ میں اپنے سے اوپر کو نہ دیکھو بلکہ اپنے سے نیچے کو دیکھو۔ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔

اس دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ اونچ اور نیچ قائم رہتی ہے۔ کوئی آگے ہوتا ہے اور کوئی پیچھے۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ اس طرح مسابقت (competition) کا ماحول قائم رہتا ہے۔ اس مسابقت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ زندگی کی ترقیاں اور سرگرمیاں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی سے کوئی آگے ہوتا ہے اور کوئی اس سے پیچھے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھے۔ اس تقابل کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو کچھ خدا نے اس کو دیا ہے وہ اس کو زیادہ نظر آئے گا۔ وہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا رہے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ صرف اپنے سے اوپر والے کو دیکھے تو اس کے اندر نفرت اور جھنجھلاہٹ کا مزاج پیدا ہوگا۔

مثبت مزاج آدمی کے ذہنی اور روحانی ارتقاء میں مددگار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس منفی مزاج آدمی کے ذہنی اور روحانی ارتقاء کو روک دیتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے کی خاطر اپنے آپ کو ذہنی ارتقاء سے محروم نہ کرلے۔

032 — گزرتا ہوا زمانہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ گویا انسانی زندگی کی حیثیت برف جیسی ہے۔ جس طرح برف پگھل کر ہر لمحہ گھٹتا جاتا ہے اسی طرح انسان کی عمر بھی ہر لمحہ گھٹ رہی ہے۔ گھٹتے گھٹتے آخرکار وہ وقت آتا ہے جب کہ انسان اپنی عمر پوری کر کے ختم ہو جائے۔

گویا ہر انسان کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن (count down) ہو رہا ہے۔ اگر ایک شخص کے لیے یہ مقدر ہو کہ وہ پیدا ہونے کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے گا تو گویا پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ پہلا سال پورا ہونے پر اس کی عمر انسٹھ سال رہ گئی۔ اس کے بعد اٹھاون، اس کے بعد ستاون، اس کے بعد چھپّن، اس کے بعد پچپن، اس طرح مسلسل ہر آدمی کی الٹی گنتی ہو رہی ہے۔ اس الٹی گنتی کو روکنا کسی بھی شخص کے بس میں نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر لمحہ کو قیمتی سمجھے کیوں کہ جو وقت کھو یا گیا وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔ جس طرح گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا۔ اسی طرح زندگی کے گزرے ہوئے لمحات بھی کسی کو دوبارہ واپس نہیں ملتے۔

033 — مایوسی نہیں

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے خدا کے بندو، مایوس نہ ہو، کیوں کہ خدا کی رحمت بہت وسیع ہے۔ آدمی کو جب بھی مایوسی ہوتی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے امکانات کو دیکھتا ہے۔ اگر اس کی نظر خدائی امکانات پر ہو تو وہ کبھی مایوس نہ ہو گا۔

انسانی امکانات کی حد ہوتی ہے۔ مگر خدائی امکانات کی کوئی حد نہیں۔ انسان اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ کبھی مایوس نہ ہو۔ کیوں کہ جہاں بظاہر انسان کی حد آ گئی ہے عین اسی مقام پر وہ ایک اور امکان کو پالے گا جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ اس کے لیے کوئی رکاوٹ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پر یقین آدمی کو امید کا ایسا خزانہ دے دیتا ہے کہ اس کے بعد وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ کبھی اس احساس سے دوچار نہیں ہوتا کہ آگے اس کے لیے کچھ اور باقی نہیں رہا۔ ایک امکان کا خاتمہ اس کے لیے زیادہ بڑے امکان کا آغاز بن جاتا ہے۔ خدا کا عقیدہ اور مایوسی دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

034 — اعلیٰ اخلاق

پیغمبر اسلام نے اپنے کچھ ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، کیا میں تم کو بہتر اخلاق بتاؤں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو جو تمہیں محروم کرے تم اسے دو۔ جو تمہارے اوپر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔ اس کو ایک لفظ میں یکطرفہ اخلاقیات کہا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق، اعلیٰ اخلاق یہ نہیں ہے کہ جو خود اچھا سلوک کرے اس کے ساتھ آپ بھی اچھا سلوک کریں۔ یہ برابر کا اخلاق ہے۔ اور برابر کا اخلاق اعلیٰ اخلاق نہیں۔ اعلیٰ اخلاق وہ ہے جو خود اپنے اعلیٰ اصول پر قائم ہو۔ جو دوسروں کے عمل کے جواب میں نہ ہو بلکہ خود اپنے اصولی رویہ کے تحت ہو۔

اعلیٰ اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ سے بلند ہو کر یکطرفہ طور پر حسن اخلاق پر قائم رہے۔ وہ ردّ عمل کی نفسیات سے اپنے آپ کو بچائے اور کسی بھی حال میں اپنے مثبت اخلاقی رویہ کو نہ چھوڑے۔ اعلیٰ انسانیت کی سب سے بڑی پہچان اعلیٰ اخلاق ہے۔ اور اعلیٰ اخلاق کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے منفی رویہ کے باوجود آدمی اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھے۔

035 — بےنفس انسان

قرآن میں اعلیٰ شخصیت کو بتانے کے لیے النفس المطمئنہ کا لفظ آیا ہے۔ النفس المطمئنہ کو دوسرے لفظوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی روح (complex-free soul) کہا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ انسان جو ہر قسم کے منفی احساسات اور سطحی جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔

دنیا میں آدمی مختلف حالات کے درمیان رہتا ہے۔ یہ حالات اس کے اندر طرح طرح کے جذبات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً نفرت، بغض، کینہ، حسد، جلن، انتقام، تعصب، خودغرضی، غرور، خودنمائی، جاہ پسندی، بے اعترافی، وغیرہ۔ جو شخص اس قسم کے تمام جذبات سے اپنے آپ کو اوپر اٹھالے اس کو النفس المطمئنہ کہا گیا ہے۔ یہ ایک شعوری عمل ہے۔ کوئی شخص خودبخود النفس المطمئنہ نہیں بن سکتا۔ اس کو شعوری طور پر اپنا نگراں بننا پڑتا ہے۔ وہ بار بار اپنی تطہیر کا کام کرتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی شخص النفس المطمئنہ بن سکے۔

036 — برائی کو مٹانا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سے کوئی برائی ہو جائے تو اس کے بعد تم نیکی کرو۔ اس سے برائی کا اثر ختم ہو جائے گا۔ مثلاً اگر آپ نے کسی شخص کو برا کہہ دیا تو اس کے بعد اس کو اچھا کہیے۔ اگر آپ نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو اس کے بعد اس کو فائدہ پہنچائیے۔ اگر آپ نے کسی کے دل کو دکھایا ہے تو اس سے معافی مانگ لیجئے۔ اگر آپ نے کسی کے خلاف اکڑ دکھائی ہے تو اب اس کے سامنے جھک جائیے۔ اگر آپ نے کسی کے ساتھ بد اخلاقی کا معاملہ کیا ہے تو اس کے بعد اس کے ساتھ خوش اخلاقی کا معاملہ کیجئے۔ اگر آپ نے کسی کو حقیر سمجھ لیا ہے تو اس کے بعد اس کو عزت کا مقام دیجئے۔ اس طرح اپنے آپ برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

037 — گناہ کیا ہے۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور اس کو کرتے ہوئے تم ڈرو کہ لوگ اس سے باخبر نہ ہو جائیں۔ یہ گناہ کی ایک ایسی پہچان ہے جس کو ہر آدمی نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر ضمیر ہے۔ یہ ضمیر اتنا حساس ہے کہ وہ برائی کے وقت آدمی کو فوراً ٹوک دیتا ہے۔ اگر آدمی ضمیر کی آواز کو سنے تو کبھی وہ گناہ نہ کرے۔ اسی طرح جب کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کو چھپا کر کرتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی اسے جاننے نہ پائے۔ جب بھی آدمی کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایک ایسا کام کرنے جا رہا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔

038 — پڑوسی کا حق

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہو۔ آدمی خواہ کہیں بھی ہو ہر وقت وہ کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ساتھی لوگ اس کے پڑوسی ہیں۔ ان پڑوسیوں کا یہ حق ہے کہ آپ سے انہیں کسی برائی کا تجربہ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان کو نو پرابلم انسان بن کر رہنا چاہئے۔ اس کو سخت احتیاط کرنا چاہئے کہ اس کی ذات سے اس کے آس پاس کے لوگوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ تکلیف کا معیار یہ ہے کہ دوسروں کو شکایت کا

موقع نہ ملے۔ اگر آپ کے پاس کے لوگ کسی بات پر آپ سے شکایت کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ دوسروں کی شکایت ہی پر آپ کو ایسے کام سے رک جانا چاہئے۔

039 — چھوٹوں سے شفقت بڑوں کا احترام

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے چھوٹوں کے ساتھ شفقت نہ کرے اور جو شخص ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ شریفانہ اخلاق کیا ہے اور اس کو سماج میں کس طرح قائم کیا جانا چاہئے۔

ہر سماج میں کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور کوئی بڑا۔ عمر کے لحاظ سے بھی اور دوسرے لحاظ سے بھی۔ مثلاً اسکول اور کالج میں استاد کی حیثیت بڑے کی ہے اور طالب علم کی حیثیت چھوٹے کی۔ ایسے فرق والے سماج میں کس طرح اعتدال کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ اس کا سادہ اصول یہ ہے کہ — بڑے لوگ چھوٹوں کے ساتھ رحمت اور شفقت کا معاملہ کریں اور چھوٹے لوگ اپنے بڑوں کے ساتھ عزت اور احترام کا طریقہ اختیار کریں۔ جس سماج میں یہ دونوں اصول پائے جائیں اس سماج کے لوگوں میں ہر ایک خوش ہوگا اور ہر ایک دوسرے کے بارے میں اچھے خیالات کا مالک ہوگا۔

040 — عہد کو پورا کرنا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب عہد کرو تو اس کو پورا کرو۔ عہد کے بارے میں خدا کے یہاں تم سے باز پرس کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہد کا معاملہ صرف دو انسانوں کے درمیان کا معاملہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں خدا بھی تیسرے فریق کی حیثیت سے شامل ہے۔

عہد یا معاہدہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ یا تو کسی سے عہد نہ کرے اور جب عہد کرے تو وہ اس کو ضرور پورا کرے۔ عہد نہ کرنا کوئی جرم نہیں مگر عہد کرنے کے بعد اسے پورا نہ کرنا یقینی طور پر جرم ہے۔ حتیٰ کہ ایک معاہدہ کو توڑنا اتنا بڑا جرم ہے کہ وہ تمام انسانی معاہدوں کو توڑنے کے برابر ہے۔ کیوں کہ معاہدہ توڑنے کا ہر واقعہ معاہدہ کے احترام کی روایت کو توڑنا ہے۔ معاہدہ کے احترام پر سماجی انصاف کا پورا نظام قائم ہے۔ اگر معاہدہ کا احترام ختم ہو جائے تو سماج میں انصاف کے ماحول کا خاتمہ ہو جائے گا۔

041 — احسان کا بدلہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا: جب کوئی شخص تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو تم اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم بدلہ نہ دے سکو تو تم اس کے لیے خدا سے دعا کرو۔

یہ شرافت کا تقاضا ہے کہ جب ایک انسان کے ساتھ دوسرا انسان کوئی بھلائی کا معاملہ کرے تو وہ اس کے بدلہ میں خود بھی اس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اگر وہ آدمی اپنے حالات کے لحاظ سے اس قابل نہ ہو کہ وہ تلافی کا عمل کر سکے تب بھی اس کے لئے تلافی کا ایک کام موجود ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے محسن کے حق میں خدا سے بہترین دعائیں کرے۔

042 — دوسرے کی مصیبت پر خوش نہ ہونا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مصیبت پر خوش نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ خدا اس پر رحم فرمائے اور تم کو مصیبت میں ڈال دے۔ اس حدیث میں لوگوں کو ایک ایسی اخلاقی برائی سے روکا گیا ہے جو خود اپنی ہلاکت کے ہم معنٰی ہے۔ کوئی انسان اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اس کو دیکھ کر آپ کے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ آپ کو چاہئے کہ اس کی مدد کریں یا کم سے کم اس کے لئے دعا کریں۔ اس کے برعکس دوسرے کی مصیبت پر خوش ہونا ایک انتہائی پست بات ہے۔ وہ اخلاقی گراوٹ کی بدترین صورت ہے۔

مزید یہ کہ کوئی آدمی اگر دوسرے کی مصیبت پر خوش ہو تو اس کا یہ فعل خدا کو سخت ناپسند ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا ناراض ہو کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ پہلے شخص کی مصیبت کو اس سے لے کر دوسرے شخص کے اوپر ڈال دی جائے۔ یہ بلاشبہہ کسی انسان کی بدنصیبی کی سب سے زیادہ بری صورت ہے۔

043 — اچھا گمان رکھنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ حسن ظن بھی حسن عبادت کی ایک صورت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے بارے میں اچھا گمان رکھنا اتنا بڑا عمل ہے کہ وہ عبادت کے برابر ہے۔

کسی کے بارے میں اچھا گمان رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ آدمی جب کچھ لوگوں کے

درمیان رہتا ہے تو بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہیں۔ جس کی وجہ سے دوسرے آدمی کی ایک بری تصویر ذہن میں بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خوش گمانی کا معاملہ کوئی آسان معاملہ نہیں۔ وہی شخص دوسروں کے بارے میں خوش گمان رہ سکتا ہے جو بدگمانی کے باوجود خوش گمانی پر قائم رہنا جانتا ہو۔ جس کے اندر یہ بلند ظرفی ہو کہ وہ کسی کے بارے میں بری خبریں سنے تب بھی وہ ایسا نہ کرے کہ اس کے خلاف بدگمان ہو کر بیٹھ جائے۔

044 — احسان ماننا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص انسان کا شکر نہ کرے گا وہ خدا کا شکر بھی نہیں کرے گا۔ احسان کے اعتراف کا نام شکر ہے۔ یہ نفسیات اگر آدمی کے اندر موجود ہو تو اس کا اظہار بندوں کے معاملہ میں بھی ہوگا اور خدا کے معاملہ میں بھی۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی ایک کے اعتبار سے غیر شاکر ہو اور وہ دوسرے کے اعتبار سے شاکر بن جائے۔

احسان کا اعتراف کرنا ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ اس اعتراف کا نام شکر ہے۔ انسان کے اوپر سب سے بڑا احسان خدا کا ہے۔ اس لئے ہر انسان کو سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس شکر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی روزمرہ کی زندگی میں خود اپنے جیسے لوگوں کے احسان کا اعتراف کرتا ہو۔ جس آدمی کے اندر یہ اعتراف نہ پایا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کے احسان کے معاملہ میں بھی شکر کرنے والا نہیں۔ ایک اعتبار سے شکر اور دوسرے اعتبار سے ناشکری دونوں ایک دل کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔ آدمی کے اندر یا تو دونوں کے لیے شکر ہوگا یا دونوں کے لیے نہیں ہوگا۔

045 — غلطی کے بعد نادم ہونا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ ہر انسان خطا کار ہے اور بہتر خطا کار وہ ہے جو غلطی کر کے نادم ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل غلطی غلطی کرنا نہیں ہے بلکہ اصل غلطی غلطی کر کے اعتراف نہ کرنا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو ایسے حالات میں زندگی گزارنا ہوتا ہے جس میں بار بار غلطی کرنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے صحیح انسان کی اصل پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ کبھی غلطی نہ

کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ غلطی پر اصرار نہ کرے۔ غلطی کرنے کے بعد فوراً اس کا ضمیر جاگ اٹھے۔ اپنی غلطی پر اس کے اندر شدید ندامت پیدا ہو جائے۔ غلطی کرنا اس کے لیے احتساب کے جذبہ کو جگانے کا ذریعہ بن جائے۔

046 — ضمیر کی آواز

پیغمبر اسلام سے آپ کے ایک ساتھی نے نیکی اور بدی کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے جواب دیا کہ تم اپنے دل سے فتوی لے لو، یعنی اپنے دل سے پوچھ کر جان لو۔ نیکی وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو اور بدی وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک صفت ہوتی ہے۔ یہ اس کا ضمیر ہے۔ ضمیر گویا سچائی کی عدالت ہے۔ ضمیر فوراً بتا دیتا ہے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز ناحق۔ کون سا رویہ درست ہے اور کون سا رویہ نادرست۔ آدمی اگر صرف یہ کرے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو سنے تو وہ اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہو جائے گا۔

ضمیر ہمیشہ اپنا کام کرتا ہے۔ وہ ہر موقع پر بتاتا رہتا ہے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا ٹھیک نہیں۔ اگر آدمی غفلت نہ برتے تو اس کا ضمیر ہی اس کو سچائی کے راستہ پر قائم رکھنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

047 — امانت ادا کرو

قرآن میں جو احکام آئے ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے کہ اے لوگو، امانت داروں کو ان کی امانت ادا کرو، یہ قرآنی حکم ایک جامع حکم ہے اور اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔

امانت کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی کا مال آپ کے پاس بطور امانت ہو تو اس کو اس کے مالک تک ٹھیک ٹھیک پہنچانا فرض ہے۔ اسی طرح کسی تعلیم گاہ کا ایک معلّم بھی امین ہے اور طلبہ اس کی امانت میں ہیں۔ معلّم کو چاہئے کہ وہ اپنی ذمّہ داری کو سمجھے اور جو انسانی نسلیں اس کی امانت میں دی گئی ہیں ان کے حقوق ادا کرنے میں وہ کوئی کمی نہ کرے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی ملک کا حاکم بنے تو وہ ملک اس کی امانت میں آ گیا اور وہ اس کا امین بن گیا۔ ایسی حالت میں حاکم پر فرض ہے کہ وہ ان امیدوں کو پورا کرے جن کے تحت اس کو یہ امانت دی گئی ہے۔

048 — امن کلچر

اسلام کی ایک تعلیم یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے شخص سے ملے تو دونوں ایک دوسرے کو السلام علیکم کہیں۔ یعنی تمہارے اوپر سلامتی ہو، تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ اسلام دراصل امن کلچر ہے اور السلام علیکم کہنا اس امن کلچر کی ایک علامت۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں دوسرے کے لیے رحمت اور شفقت کے جذبات ہوں۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کے لیے پرامن زندگی کی تمنا رکھتا ہو۔ ہر آدمی کی یہ کوشش ہو کہ اس کا سماج امن اور سلامتی کا سماج بن جائے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن کے اصول پر مبنی ہیں کیوں کہ امن کے بغیر کوئی بھی تعمیری کام نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں امن نہ ہو وہاں ترقی بھی نہ ہوگی۔ امن کسی سماج کی ترقی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پانی زمین کو زرخیز بنانے کے لیے۔

049 — امن پسندی

پیغمبر اسلام نے اپنی ایک نصیحت میں فرمایا: تم دشمن سے مدبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو۔ اس حدیث میں زندگی کا ایک بنیادی اصول بتایا گیا ہے۔ اس اصول کی اہمیت فرد کے لیے بھی ہے اور قوم کے لیے بھی۔ کوئی انسان جب اجتماعی زندگی میں رہتا ہے تو ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ دشمنی کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ طریقہ درست نہیں کہ کوئی شخص دشمن نظر آئے تو آپ اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ دشمن سے بھی ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ امن کے اصول پر چلتے ہوئے اس سے نباہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

پرامن طریقہ ہر حال میں قابل عمل ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آدمی دشمنی کی صورت پیدا ہونے کے بعد منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔

050 — پرامن شہری

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مسلم وہ ہے جس کے ہاتھ سے اور جس کی زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔

ں کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا سچا بندہ وہ ہے جو سماج میں بے تشدد بن کر رہے۔ دوسروں کو نہ اس کی
بان سے کوئی چوٹ پہنچے اور نہ اس کے ہاتھ سے کسی کو تکلیف کا تجربہ ہو۔ یہ انسانیت کا کم سے کم معیار
ہے۔ انسانیت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنے سماج میں اس طرح رہیں کہ ایک سے دوسرے کو
ئدہ پہنچ رہا ہو۔ اور اگر کوئی شخص دوسروں کو فائدہ نہ پہنچا سکے تو اس کو کم از کم یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے
ماج میں بے مسئلہ انسان بن جائے۔ وہ دوسروں کو اپنے ضرر سے بچائے۔

کوئی آدمی جب اپنی زبان یا اپنے ہاتھ سے دوسروں کو نقصان پہنچانے لگے تو وہ اپنی انسانیت
کو کھو دیتا ہے۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آ جاتا ہے۔ انسانیت کا سچا معیار یہ ہے کہ
ٓدمی اتنا حساس ہو کہ وہ دوسروں کے لیے ضرر رساں بننے کا تحمل نہ کر سکے۔

جو آدمی اس معاملہ میں حساس ہو وہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش نہیں ہوگا بلکہ یہ سمجھے گا کہ میں
نے خود اپنے آپ کو انسانیت کی سطح سے نیچے گرا لیا ہے۔ اگر کبھی اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ
جائے تو وہ فوراً شرمندہ ہو جائے گا اور نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کو اس وقت تک
چین نہ آئے گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی سے معافی نہ مانگ لے یا اپنی کوتاہی کی تلافی نہ کر لے۔

051 — نقصان سے بچو

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔ یہ حدیث ایک اہم
جتماعی اصول کو بتاتی ہے۔ اس اصول کا تعلق مرد سے بھی ہے اور عورت سے بھی، فرد سے بھی ہے اور
جماعت سے بھی، وہ قومی زندگی کے لیے بھی ہے اور بین اقوامی زندگی کے لیے بھی۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو مختلف حالات کے درمیان رہنا پڑتا ہے، کبھی موافق حالات اور کبھی
مخالف حالات، کبھی خوشی کے حالات اور کبھی غم کے حالات۔ ایسی حالت میں کوئی مرد یا عورت دنیا میں
کیسے رہے، اس کے لیے یہ ایک جامع اصول ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی ایک طرف اس طرح بے ضرر بن کر
رہے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اور دوسری طرف وہ اتنا ہوشیار رہے کہ کسی دوسرے کو
یہ موقع نہ ملے کہ وہ اس کو نقصان پہنچا سکے۔

052 — زیادہ بڑی طاقت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ ان الفاظ میں قدرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں نرمی اور عدم تشدد سے کام بنے اور سختی اور تشدد سے کام بگڑ جائے۔ نرمی اور عدم تشدد سے مفید نتیجہ نکلے اور سختی اور تشدد کا طریقہ بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

سختی اور تشدد کا طریقہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے مگر وہ کسی تعمیری مقصد کے حصول کے لیے مفید نہیں۔ تعمیر و ترقی کا کام ایک ایسا طریقِ کار چاہتا ہے جو شروع کرنے کے بعد مسلسل جاری رہے۔ پائدار عمل کی یہ صفت صرف غیر متشددانہ طریق کار میں پائی جاتی ہے۔

053 — صلح بہتر ہے

قرآن کی ایک آیت میں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ — صلح بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی نزاعی معاملہ پیش آئے تو اس وقت بہتر یہ ہے کہ لوگ ٹکراؤ کے طریقہ کو اختیار نہ کریں بلکہ مفاہمت کے طریقہ کو اختیار کریں۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی نزاع پیش آجاتی ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کے لیے دو ممکن طریقہ ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ٹکراؤ اور تشدد کے ذریعہ اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسرا یہ کہ پر امن گفت وشنید کے ذریعہ آپس میں مصالحت کر لی جائے اور نزاع کو ابتدائی مرحلہ ہی میں ختم کر دیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مصالحت کا طریقہ ہی دونوں فریقوں کے لیے مفید ہے۔ ٹکراؤ کا طریقہ ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں آپس کی نفرت بڑھتی ہے۔ اور جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے وہ بھی حل نہیں ہوتا۔ اگر لوگ معاملہ کو نتیجہ کے پہلو سے دیکھیں تو وہ کبھی ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہ کریں، کیوں کہ ٹکراؤ کا راستہ آدمی کو تباہی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

054 — سماجی خدمت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کے جو سچے بندے ہیں ان کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہوتا

ہے۔ سائل سے مراد وہ شخص ہے جو بول کر سوال کرے اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خواہ سوال نہ کرے مگر اس کی معذوری اپنے آپ ایک عملی سوال بن گئی ہو۔

خدا کے سچے بندے اپنی کمائی کو اس وقت تک اپنے لئے درست نہیں سمجھتے جب تک وہ اس میں سے سائل اور محروم کو اس کا حصہ نہ دے دیں۔ یہ تعلیم ہر انسان کو اپنے سماج کا خادم بنا دیتی ہے۔ وہ جس سماج سے اپنے لیے لیتا ہے، اس سماج کو دینا بھی وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

سائل سے مراد عام ضرورت مند ہیں۔ محروم سے مراد خاص طور پر وہ لوگ ہیں جو کسی وجہ سے معذور (disabled) ہو گئے ہوں۔ معذور لوگوں کی خدمت کرنا اسلام کے نزدیک صرف سماجی خدمت نہیں ہے۔ یہ خود اپنے آپ کو خدا کی ابدی رحمت کا مستحق بنانا ہے۔

055 — تمام انسان ایک

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سن لو کہ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور سن لو کہ آدم مٹی سے تھے۔ یہ حدیث اس حقیقت کا اعلان ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ان میں کچھ ظاہری فرق ہو سکتے ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔

یہ حدیث انسانی تعلقات کے ایک اہم اصول کو بتاتی ہے۔ اور وہ مساوات کا اصول ہے۔ سارے انسان جب ایک ہی مادّہ سے پیدا ہوئے ہیں اور سب ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہیں تو ان میں تفریق اور امتیاز اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مطابق، تمام مرد ایک دوسرے کے خونی بھائی (blood brothers) ہیں۔ اور تمام عورتیں ایک دوسرے کے لیے خونی بہن (blood sisters) ہیں۔ یہ اصول انسان اور انسان کے درمیان امتیاز کی تمام بنیادوں کو ڈھا دیتا ہے۔

056 — مشورہ کی اہمیت

قرآن میں معاملات پر مشورہ کی تاکید کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ آپ معاملات میں ہمیشہ لوگوں سے مشورہ کرتے تھے۔ مشورہ کیا ہے۔ مشورہ یہ ہے کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ میں ہر ایک کی رائے معلوم کی جائے۔ اس طرح ہر آدمی کا علم اور تجربہ سامنے آجاتا ہے

اور یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ زیادہ بہتر انداز میں معاملہ کو حل کرنے کی تدبیر کی جائے۔ زیادہ صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ کام کا آغاز کیا جائے۔ مشورہ کے بغیر جو کام کیا جائے وہ ایک شخص کی سوچ پر مبنی ہوگا اور مشورہ کے بعد جو کام کیا جائے اس میں کئی لوگوں کی سوچ شامل ہو جائے گی۔

مشورہ دراصل اجتماعی سوچ کا دوسرا نام ہے۔ انفرادی سوچ اور اجتماعی سوچ میں جو فرق ہے وہی فرق مشورہ کے بغیر کام اور مشورہ کے ساتھ کام میں پایا جاتا ہے۔ مختلف اسباب سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا ذہن ہر پہلو کو سمجھ نہیں پاتا۔ مشورہ اسی کمی کی تلافی ہے۔ مشورہ کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ معاملات میں زیادہ درست رائے تک پہنچا جائے۔ پیشگی طور پر غلطیوں سے بچنے کی تدبیر کرلی جائے۔ مشورہ کامیاب منصوبہ بندی کا ایک اہم جزء ہے۔

057 — ترک کلام نہیں

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سے جھگڑا ہو جائے اور ترک کلام کی نوبت آجائے تو زیادہ سے زیادہ اس کو تین دن کی معافی مل سکتی ہے۔ تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھنا کسی حال میں جائز نہیں۔ اس معاملہ میں تین دن کی رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ غصہ زیادہ سے زیادہ تین دن تک رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ انا کا سوال بن جاتا ہے۔ کسی کو غصہ کی معافی مل سکتی ہے مگر اَنانیت کی معافی کسی کے لیے نہیں۔ غصہ ایک فطری کمزوری ہے جو وقتی طور پر پیدا ہوتی ہے مگر انانیت ایک برائی ہے۔ انانیت ایک سرکشی کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غصہ قابل معافی ہے مگر انانیت اور سرکشی قابل معافی نہیں۔ وقتی غصہ کے لئے آدمی کے پاس عذر ہوسکتا ہے مگر انانیت اور سرکشی ایک ایسا جرم ہے جس کے لیے کوئی بھی قابل قبول عذر موجود نہیں۔

058 — ماننے سے پہلے جانچنا

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جب تمہیں کسی کے بارے میں کوئی خبر ملے تو پہلے اس کی تحقیق کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے بغیر کسی خبر کو مان لینا ایک غیر ذمہ داری کا فعل ہے۔

عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ جو سنا یا جو کچھ پڑھا اس کو فوراً مان لیا۔ حالاں کہ تجربہ بتاتا ہے کہ خبر دینے والا اکثر ایسا کرتا ہے کہ وہ ساری بات کو جانے بغیر خبر نشر کر دیتا ہے۔ جب کہ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبر بھی ادھوری تھی اور اس سے جو نتیجہ نکالا گیا وہ بھی ادھورا تھا۔

تحقیق کے بغیر کسی خبر کو مان لینا اکثر حالات میں نقصان کا سبب ہوتا ہے۔ اس سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایک غلط خبر لڑائی اور فساد کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ خبر کی پوری تحقیق کی جائے، تحقیق کے بغیر کسی خبر کو درست نہ مان لیا جائے۔

059 — تمام انسان بھائی بھائی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اے خدا، میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ حدیث انسانی تعلق کی بنیاد کو بتاتی ہے۔ اس کے مطابق، تمام دنیا کے لوگ ایک خاندان کے مانند ہیں۔ ہر ایک کو چاہئے کہ وہ دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ اپنے گھر کے اندر اپنے بھائی سے کرتا ہے۔ یہ اصول عالمی برادری کا اصول ہے۔ یہ اصول اپنے اور غیر کی تقسیم کو مٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد سب اپنے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی کا غیر نہیں رہتا۔ یہ اصول تمام انسانی نسل کو ایک ایسے مضبوط رشتے میں باندھ دیتا ہے جس سے زیادہ مضبوط کوئی اور رشتہ نہیں۔

060 — تین چیزیں حرام

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ ایک انسان پر دوسرے انسان کی تین چیزیں حرام ہیں — اس کا خون اور اس کا مال اور اس کی آبرو۔ یہ اصول ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان آزادی کی حد قائم کرتا ہے۔ ہر انسان آزاد ہے۔ مگر اس کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں وہ دوسرے کی جان مال اور آبرو کے لیے خطرہ بن جائے۔

انسان کو اس دنیا میں آزادی دی گئی ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود۔ کسی آدمی کو اسی وقت تک آزادی حاصل ہے جب تک وہ دوسرے کی

جان مال اور آبرو کو نقصان نہ پہنچائے۔ جیسے ہی کوئی آدمی ان تین چیزوں میں دوسروں کے لیے خطرہ بنے، اس کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ وہ آزادی کے فطری حق سے محروم قرار دے دیا جائے گا۔

061 — ہر شخص ذمہ دار ہے

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سن لو، تم میں سے ہر شخص ایک چرواہا ہے۔ اور تم میں سے ہر شخص سے اس کے گلّہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اس حدیث میں چرواہے اور گلّے کی مثال سے زندگی کی ایک حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ جس طرح چرواہے کا گلّہ ہوتا ہے اسی طرح ہر انسان کا اپنے حالات کے اعتبار سے ایک گلّہ ہے۔ اور اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے اس گلّہ کی چرواہی میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔

مثلاً ایک گھر کا جو بڑا شخص ہے اس کا گلّہ اس کا خاندان ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے۔ اسی طرح ایک اسکول یا کالج کا ایک ٹیچر اپنے طلبہ کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کے حق میں اپنی تعلیمی ذمہ داری کو بھر پور طور پر ادا کرے۔ اسی طرح ایک لیڈر اپنے پیروؤں کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جو لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں وہ پوری طرح ان کا خیر خواہ بنے۔ اسی طرح کسی ادارے کا صدر اپنے ادارے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ان متعلقین ادارہ کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے۔

062 — ہر ایک کی مدد

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے پوچھا کہ مظلوم کی مدد کرنا تو ہم جانتے ہیں مگر ہم ظالم کی مدد کیسے کریں۔ آپ نے فرمایا کہ تم ظالم کو اس کے ظلم سے روکو۔ اسلام ہر انسان کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کا خیر خواہ ہو۔ اسی خیر خواہی کی عملی صورت کا نام مدد ہے۔ مظلوم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے بچایا جائے۔ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو اس کے ظلم سے روکا جائے۔ ظلم سے روکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔ ظالم کی حقیقی مدد یہ ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے دعا کی جائے۔ اس کو خیر خواہانہ

نصیحت کی جائے۔ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ ظلم کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔ ظالم کی مدد ظالم سے نفرت کرنا نہیں ہے بلکہ ظالم کے ساتھ خیر خواہی کرنا ہے۔ نفرت ظلم کو بڑھاتی ہے اور خیر خواہی ظلم کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

063 — نرم سلوک

پیغمبرِ اسلام نے اپنے ساتھیوں کو ایک مہم پر بھیجا اور ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تم دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ اس حدیث کا تعلق ہر شعبہ میں کام کرنے والوں سے ہے۔ اس میں ہر ایک کے لیے نصیحت ہے۔ مثلاً ایک افسر کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ اسی اصول پر کام کرنا ہے۔ ایک ٹیچر کو اپنے طلبہ کے ساتھ یہی معاملہ کرنا ہے۔ ایک منیجر کو اپنی کمپنی والوں کے ساتھ اسی طرح پیش آنا ہے، وغیرہ۔

ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس نصیحت کو دھیان میں رکھے۔ وہ یہ سمجھے کہ وہ جہاں ہے وہاں اس کو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اسے لوگوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا ہے بلکہ ان کے لیے آسانی کا راستہ تلاش کرنا ہے۔

064 — رحم کا فارمولا

پیغمبرِ اسلام نے فرمایا کہ تم زمین والوں کے اوپر رحم کرو، آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے گا۔ یہ ایک سادہ اصول ہے جو ہر مرد اور عورت کے اندر خیر کے کام کا وہ جذبہ ابھارتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہر انسان خدا کی مدد کا محتاج ہے۔ ہر عورت اور مرد کو ضرورت ہے کہ وہ زندگی کے مختلف مراحل میں خدا کی مدد پاتا رہے۔ کوئی بھی شخص اس دنیا میں خدا کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اپنے آپ کو خدا کی مدد کا مستحق بنانے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ آدمی جو کچھ خود اپنے لئے خدا سے چاہتا ہے وہی وہ دوسروں کو دینے لگے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کی مدد کرے تو اس کو بھی چاہئے کہ وہ دوسروں کا مددگار بن جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو وہ بھی دوسروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کی کوتاہیوں سے درگزر کرے تو اس کو

چاہئے کہ وہ بھی دوسروں کی کوتاہیوں سے درگزر کرتا رہے۔

انسان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کرنا گویا ایک عملی دعا ہے۔ یہ عمل کی زبان میں خدا سے یہ کہنا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے بندوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کیا، تو تو بھی میرے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ فرما۔

065 — باہمی احترام

قرآن میں پیغمبر کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ اے لوگو، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ کسی سماج میں جب کئی مذہب کے لوگ رہتے ہوں تو ان کے درمیان معتدل ماحول کس طرح قائم کیا جائے۔ اس کا سادہ فارمولا یہ ہے کہ — ایک کی پیروی کرو اور ہر ایک کا احترام کرو: Follow one and respect all

مشترک مذہبی سماج میں امن قائم کرنے کا یہی واحد اصول ہے۔ یہ دنیا اختلاف کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں اختلافات کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے اور وہ tolerance ہے۔ یعنی ہر ایک کو یہ حق دینا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق، مذہب یا کلچر کو اختیار کرے۔ اختلاف کے موضوع پر ایک دوسرے سے پر امن ڈائیلاگ ہوسکتا ہے مگر اختلاف کو مٹانے کی کوشش صرف مزید اختلاف پیدا کرے گی، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

066 — مذہبی احترام

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں مدینہ میں کچھ یہودی قبیلے آباد تھے۔ ایک دن پیغمبر اسلام نے دیکھا کہ ایک راستے سے ایک جنازہ گزر رہا ہے۔ پیغمبر اسلام اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ایک ساتھی نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا وہ انسان نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان ہر حال میں قابل احترام ہے، خواہ وہ ایک مذہب کا ہو یا دوسرے مذہب کا، وہ ایک قوم کا فرد ہو یا دوسری قوم کا۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس کا احترام ختم نہیں کیا

جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔

067 — دشمن میں دوست

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو اپنا دشمن دکھائی دے تو تم اس سے جوابی دشمنی نہ کرو بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس یک طرفہ سلوک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔ اسلام کی یہ تعلیم بتاتی ہے کہ دشمنی کوئی ابدی چیز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دشمن انسان میں ایک دوست انسان چھپا ہوا ہے۔ اپنے یک طرفہ حسن سلوک سے اس امکان کو واقعہ بناؤ، اپنے دشمن کو اپنے دوست میں تبدیل کرلو۔

جوابی حسن سلوک آدمی کے ضمیر کو جگاتا ہے اور جس آدمی کا ضمیر جاگ اٹھے وہ اس کے سوا کسی روش کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ دشمنی کو چھوڑ کر آپ کا دوست بن جائے۔

068 — نرمی کے بغیر

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ ہر بھلائی سے محروم ہے۔ یہ حدیث ایک جامع اخلاقی اصول کو بتاتی ہے اور وہ بات چیت اور تعلقات میں نرمی ہے۔

جو آدمی نرمی کا انداز اختیار کرے وہ ہر معاملے میں اور ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ کیوں کہ کوئی شخص ایسے آدمی کا دشمن نہیں بنے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی دوسروں سے معاملہ کرنے میں نرمی کا انداز نہ برتے اس کا ہر کام بگڑتا چلا جائے گا کیوں کہ اس سے ہر ایک کو شکایت ہو جائے گی۔ اس کو مخالفوں اور دشمنوں کے درمیان رہنا پڑے گا۔ وہ گھر کے اندر اور باہر دونوں جگہ غیر ضروری مسائل میں الجھا رہے گا۔

069 — سادگی کی عظمت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سادگی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ سادگی کو ایمان کا حصہ بتانا سادگی کی انتہائی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سادگی بامقصد انسان کا طریقہ ہے۔ بامقصد انسان اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ سہولت اور عیش کی چیزوں میں مشغول ہو جائے اور اس طرح اپنے وقت اور طاقت کا ایک حصہ

اس میں لگا دے۔ سادگی کا مطلب ہے — اپنی ضرورت کو بالکل ناگزیر چیزوں تک محدود رکھنا۔ اپنے آپ کو کسی غیر ضروری چیز کا عادی نہ بنانا، اپنے آپ کو آرام والی چیزوں سے دور رکھنا۔ سادگی دراصل ایک اعلیٰ تدبیر ہے۔ سادگی کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو مکمل طور پر صرف اپنے مقصد میں لگائے اس کی زندگی کا کوئی حصہ مقصد کے علاوہ کسی اور چیز میں ضائع نہ ہو۔

کسی انسان کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اس کے اندر سوچنے کا عمل (thinking process) بلا روک ٹوک جاری رہے۔ سادگی اس ذہنی عمل میں بے حد مددگار ہے۔ سادگی آدمی کے ذہن کو ہر دوسری چیز سے فارغ رکھتی ہے۔

070 — صفائی کی اہمیت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ صفائی بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صاف ستھرا رہنا اور اپنے ماحول کو صاف ستھرا بنانا اسلام میں کتنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی اپنے قلب اور روح کو پاک کرے۔ وہ برے خیالات کو چھوڑ کر پاکیزہ خیالات میں جینے لگے۔ وہ اپنے داخلی وجود کو اسی طرح اچھے خیالات سے پاکیزہ بنائے جس طرح کوئی شخص اپنے جسم کو پانی سے دھو کر پاکیزہ بناتا ہے۔

کوئی آدمی جب اپنے داخل کو صاف ستھرا بنائے گا تو فطری طور پر وہ یہ چاہے گا کہ اس کا خارج بھی صاف ستھرا رہے۔ وہ اپنے جسم اور اپنے کپڑے کی صفائی کا اہتمام کرے گا۔ وہ اپنے گھر اور اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرے گا۔ صفائی ایسے انسان کا مستقل مزاج بن جائے گی۔

071 — بیچ کا راستہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سب سے بہتر طریقہ بیچ کا طریقہ ہے (خیر الامور اوسطھا) اس تعلیم کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بہتر راستہ بیچ کا راستہ (middle path) ہے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کو بہت سے لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں بہتر طریقہ وہ ہے جس میں آدمی کا راستہ کسی رکاوٹ کے بغیر طے ہوتا رہے اور کسی سے ٹکراؤ بھی پیش نہ

آئے۔ اسی راستہ کو بیچ کا راستہ کہا جاتا ہے۔ بیچ کا طریقہ ہمیشہ معتدل طریقہ ہوتا ہے۔ معتدل طریقہ ہمیشہ قابل عمل ہوتا ہے۔ ایسے طریقہ میں آدمی اپنے آپ کو کسی بڑے خطرہ میں ڈالے بغیر آگے بڑھ سکتا ہے۔ معتدل طریقہ میں کسی ایسے بڑے نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا جس کے بعد آدمی کا پورا منصوبہ بکھر جائے اور آخر کار وہ مایوسی کا شکار ہو کر بیٹھ جائے۔

072 — تواضع سے بلندی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص تواضع کا طریقہ اختیار کرے خدا اس کو بلندی عطا کرتا ہے۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک قانون ہے۔ اس کے مطابق، تواضع کی روش آدمی کے لیے ترقی کے راستے کھولتی ہے۔ اس کے برعکس گھمنڈ کا طریقہ آدمی کو پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ تواضع کا فائدہ دوطرفہ ہے۔ تواضع کرنے والے کو اس کا یہ فائدہ ملتا ہے کہ اس کے اندر روحانیت جاگتی ہے، اس کے اندر اعلیٰ انسانی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خدا کے فیضان کو وصول کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ چیزوں کو بے آمیز انداز میں دیکھ سکے۔

وہ شخص جس سے تواضع کا معاملہ کیا جائے وہ اپنے ضمیر کی آواز کے تحت تواضع کرنے والے کی عظمت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں سرکشی کرنے کا جذبہ کھو دیتا ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی اخلاقی بڑائی کو مانے۔ وہ اپنے مقابلہ میں اس کو زیادہ بڑا انسانی درجہ دے۔

تواضع صرف ایک روش ہے۔ اس میں آدمی کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ تواضع کر کے اسے کچھ کھونا نہیں پڑتا۔ مگر کچھ نہ کھو کر وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ تواضع کے خلاف روش اگر جھوٹی بڑائی ہے تو تواضع کے مطابق روش سچی انسانیت۔

073 — فضول خرچی نہیں

قرآن میں اسراف (فضول خرچی) سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی حقیقی ضرورت کے بغیر خرچ کرنا۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ یہ بھی اسراف ہے کہ تم ہر وہ چیز کھاؤ جس کو کھانے کی خواہش تمہارے دل میں پیدا ہو۔ (إن من السرف أن تأكل كل مااشتهيت)

آدمی اپنی کمائی کو اگر حقیقی ضرورتوں میں خرچ کرے تو یہ اس کا جائز حق ہے۔ لیکن اگر وہ خواہش اور لذت کی بنا پر خرچ کرنے لگے تو پھر اس کا حق کسی کو نہیں۔ خدا نے اگر کسی کو زیادہ مال دیا ہے تو اس لیے نہیں دیا ہے کہ وہ اس کو صرف اپنے اوپر خرچ کرتا رہے۔ مال خدا کی امانت ہے اور اس کو چاہئے کہ اس امانت کو وہ انھی مدوں میں خرچ کرے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کی ہیں۔ جو آدمی ایسا نہ کرے وہ گویا خدا کی امانت میں پورا نہیں اترا۔

074 — اجتماعی برکت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ ایک شخص کا کھانا دو آدمی کے لیے کافی ہے اور دو آدمی کا کھانا تین آدمی کے لیے کافی ہے۔ اس حدیث میں مل جل کر رہنے اور اجتماعی طور پر عمل کرنے کی برکت کو بتایا گیا ہے۔

اس حدیث میں کھانے کی مثال ایک علامتی مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ لوگ اگر ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کر کے کام کریں اور مل جل کر رہیں تو تھوڑے لوگ بھی زیادہ بڑے بڑے کام کریں گے۔ تھوڑے سرمایہ میں بھی بہت سے لوگوں کو نفع حاصل ہوگا۔ کم وسائل میں بھی زیادہ فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو جائے گا۔ ہر آدمی اگر الگ الگ اپنا کام کرے تو وہ محدود طور پر صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچائے گا۔ لیکن یہی افراد اگر ایک دوسرے کو شریک کر کے کام کرنے لگیں تو مجموعی طور پر سب کو ایک دوسرے سے فائدہ پہنچے گا۔

075 — انصاف کا تقاضا

پیغمبر اسلام نے ایک بار مدینہ کے ایک شخص سے قرض لیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن آیا اور آپ سے قرض کی ادائیگی کے لیے سخت زبان استعمال کی۔ پیغمبر اسلام کے ساتھیوں نے چاہا کہ اس کو اس گستاخی کی سزا دیں۔ مگر آپ نے انہیں روک دیا۔ آپ نے کہا کہ حق دار کو بولنے کا اختیار ہے۔

یہ دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا سبق ہے۔ دوسرا آدمی اگر کسی وجہ سے غصہ میں آجائے یا سخت کلامی کرے تو سننے والے کو اس کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اگر آدمی دوسرے کی سخت کلامی کو سننے کے لیے تیار نہیں تو اس کو چاہئے کہ وہ اس سے قرض جیسا معاملہ بھی نہ کرے۔ قرض

نے کے بعد اس کو بہر حال قرض دینے والے کو یہ حق دینا ہوگا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار جس طرح رنا چاہتا ہے کرے۔ اس طرح کے معاملہ میں قرض لینے والے کو تحمل کی روش اختیار کرنا چاہئے۔ وہ ا نہیں کرسکتا کہ برعکس طور پر وہ قرض دینے والے کو تحمل کی نصیحت کرے۔

076 — حق سے زیادہ نہ لینا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ دو آدمی اگر میرے پاس ایک زمین کا مقدمہ لے کر آئیں۔ ان میں ے ایک شخص زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اگر اپنا مقدمہ پیش کرے اور اس کی وجہ سے زمین اس کو دے ی جائے، جب کہ حقیقت میں وہ زمین اس کی نہ ہو تو گویا کہ اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز آدمی کا واقعی حق نہ ہو، اس کے معاملہ میں اگر وہ کسی تدبیر سے اپنے ِافق عدالتی فیصلہ لے لے تب بھی وہ چیز اس کی نہ ہوگی۔ کوئی عدالتی فیصلہ حقیقت کو نہیں بدل سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز پر ناجائز قبضہ ہر حال میں برا ہے۔ عدالت کا کوئی فیصلہ ناجائز کو جائز یں بنا سکتا۔ اگر آدمی کا ضمیر یہ کہتا ہو کہ فلاں چیز میری نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کے لیے صحیح ریقہ یہ ہے کہ وہ اس چیز کو حق دار کے حوالہ کر دے، نہ کہ غلط تدبیر کے ذریعہ ناجائز طور پر دوسرے کی ز پر قابض ہونے کی کوشش کرے۔ ضمیر سب سے بڑی عدالت ہے۔ سب سے بڑا فیصلہ وہ ہے جو یر کی عدالت سے جاری کیا جائے۔

077 — جو اپنے لیے وہی دوسروں کے لیے

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مومن وہ ہے جو دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ یہ سماجی اخلاق کا ایک نہایت جامع اصول ہے۔ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ دوسروں کی رف سے کون سا رویہ اس کو پسند ہے اور کون سا رویہ ناپسند۔ ایسا ہی وہ دوسروں کے ساتھ کرنے لگے۔ وہ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو سلوک وہ اپنے لیے چاہتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ں سلوک سے بچے جس کو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔

سماجی اخلاق کا یہ اصول اتنا سادہ اور فطری ہے کہ وہ ہر عورت اور ہر مرد کو معلوم ہے۔ ضرورت

صرف یہ ہے کہ ہر آدمی اس معاملہ میں حساس ہو جائے۔ جس حساسیت کا مظاہرہ وہ اپنے بارے میں کرتا ہے اس حساسیت کا مظاہرہ وہ دوسروں کے بارے میں کرنے لگے۔ لوگ اگر اس ایک اخلاقی اصول کو پکڑ لیں تو پورا سماج خیر وامن کا سماج بن جائے۔

078 — معاشی استقلال

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا جب کسی کے لیے رزق کا ایک ذریعہ بنائے تو وہ خود سے اسے نہ چھوڑے، اِلّا یہ کہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے اسے چھوڑنا پڑے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق، رزق کا تعلق خدا سے ہے۔ اس لیے جب کسی انسان کو رزق کا ایک ذریعہ مل جائے تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ اس پر قائم رہے۔ اگر وہ کسی حقیقی سبب کے بغیر اس کو چھوڑے گا تو وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جائے گا۔

معاشی زندگی میں کامیابی کا راز استقامت ہے۔ اس حدیث میں اسی استقامت اور استقلال کی تعلیم دی گئی ہے۔ معاشی زندگی میں کامیابی ہمیشہ لمبی مدت تک محنت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ حال کے بجائے مستقبل پر نظر رکھے۔ اس طرح اس کے اندر استقلال پیدا ہوگا اور وہ ضرور کامیابی کے درجے تک پہنچے گا۔ یہ حدیث گویا اس بات کی تعلیم ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں مستقبل بینی کا مزاج پیدا کرو۔ صرف حال کو دیکھ کر بے حوصلہ نہ ہو جاؤ۔

079 — رزق خدا کی طرف سے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین پر جتنے بھی جاندار ہیں ہر ایک کی روزی خدا کے ذمّے ہے۔ پیغمبر اسلام نے کہا کہ خدا نے کسی مرد یا عورت کا جو رزق لکھ دیا ہے کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔ کوئی شخص نہ اس میں کمی کر سکتا ہے اور نہ زیادتی۔ یہ اعلان ہر مرد اور عورت کو رزق کی گارنٹی دے رہا ہے، جس کو کوئی اس سے چھیننے والا نہیں۔ جس آدمی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے اس کو اس کے ذریعہ دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک طرف اس کو یہ یقین حاصل ہوگا کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ اس کو بہر حال مل کر رہے گا۔ اس عقیدہ کی بنا پر وہ دنیا میں اس بھروسہ کے ساتھ کام کرے گا کہ میری کوششوں کا نتیجہ مجھے ضرور ملنے والا ہے۔ کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ میرے اور میرے رزق کے درمیان حائل ہو سکے۔ رزق میرا ایک

ایسا حق ہے جو خود دنیا کے مالک نے میرے لیے لکھ دیا ہے۔ پھر کون ہے جو اس لکھے کو مٹا سکے۔

یہ عقیدہ آدمی کے اندر سے مایوسی کے احساس کو نکال دیتا ہے۔ وہ عین مسائل کے درمیان کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ — کوئی شخص میرے ایک جاب کو مجھ سے چھین سکتا ہے مگر کوئی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ میری قسمت کو مجھ سے چھین سکے:

One can take away my job. But no one
has the power to take away my destiny.

080 — قناعت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ وہ شخص کامیاب ہوا جس کو خدا نے ضرورت کے بقدر رزق دیا اور وہ اس رزق پر قانع رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی کا راز ملے ہوئے پر قانع رہنا ہے نہ کہ نہ ملے ہوئے کے غم میں پڑے رہنا۔ دنیا میں جب بھی کوئی شخص صحیح اصول کے مطابق کمانے کی کوشش کرے تو وہ ضرور اتنی معاش حاصل کر لیتا ہے جو اس کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔ اگر وہ اس ملے ہوئے پر راضی ہو جائے تو اس کا فائدہ اس کو ذہنی سکون کی صورت میں ملے گا۔ لیکن سکون ہمیشہ قناعت سے ملتا ہے اور قناعت کا مطلب ہے ملے ہوئے پر راضی ہو جانا۔

اس کے برعکس جو شخص ملے ہوئے کو کم سمجھے اور نہ ملے ہوئے کی طرف دوڑتا رہے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ دنیا میں چیزوں کی کوئی حد نہیں۔ آدمی خواہ کتنی ہی زیادہ چیزوں کو اپنے پاس جمع کر لے پھر بھی کچھ چیزیں باقی رہیں گی جو اس کو یہ لالچ دلائیں گی کہ مجھے یہ بھی حاصل کرنا چاہئے۔ اس طرح وہ ہمیشہ اور زیادہ کی لالچ میں پڑا رہے گا۔ وہ اسی طرح بے سکونی کی زندگی جئے گا یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جائے گا۔

081 — کسی سے نہ مانگنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم کسی سے کچھ نہ مانگو۔ کیوں کہ نیچے کے ہاتھ کے مقابلہ میں اوپر کا ہاتھ زیادہ بہتر ہے۔ یہ اعلیٰ انسانیت کی تعلیم ہے۔ اعلیٰ انسانیت یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ پر انحصار

کرے۔ وہ دوسرے سے کوئی چیز نہ مانگے۔

مانگنا کوئی سادہ بات نہیں۔ وہ اخلاقی گراوٹ کی ایک علامت ہے۔ جو آدمی دوسروں سے مانگے وہ گویا آسان رزق پر جینا چاہتا ہے۔ ایسے آدمی کو مانگنے کی عادت کی یہ قیمت دینی پڑے گی کہ اس کی اپنی صلاحیت زیادہ نہ ابھر سکے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی طاقتیں دبی رہ جائیں۔ اس کے اندر محنت کا جذبہ سرد پڑ جائے۔ وہ اس کمزوری کا شکار ہو جائے جس کو تن آسانی کہا جاتا ہے۔ زندگی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ پر بھروسہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو محنت کا عادی بنائے۔ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ وہ دوسروں کو دینے والا بنے نہ کہ دوسروں سے لینے والا۔

082 — تجارت رزق کا بڑا ذریعہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا: تسعة اعشار الرزق فی التجارة (رزق کا نوے فیصد حصہ تجارت میں ہے)۔ اس حدیث میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، تجارت میں رزق کا سب بڑا حصہ رکھا گیا ہے۔

یہ حدیث ہر آدمی کے لیے امید کا خزانہ ہے۔ اگر کسی آدمی کو ملازمت نہ ملے یا وہ وراثتی حقوق کو نہ پائے یا اور دوسرے ذرائع سے وہ کچھ پانے کی امید نہ رکھتا ہو تو اس کو تجارت شروع کر دینا چاہئے۔ تجارت کے ذریعہ وہ اتنا زیادہ پالے گا جو وہ دوسرے کسی ذریعہ سے نہیں پا سکتا تھا۔

083 — محنت کی روزی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اللہ اپنے اس بندہ سے محبت کرتا ہے جو محنت کر کے اپنی روزی کمائے۔ یہ حدیث محنت کی روزی کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ محنت کر کے روزی کمانا کوئی سادہ بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ محنت کی روزی تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ محنت کی روزی سب سے زیادہ جائز روزی ہے۔ محنت سے روزی کمانا آدمی کو حقیقت پسند بناتا ہے۔ محنت کی روزی آدمی کے اندر سادگی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ محنت کی روزی دوسروں کو سمجھنے کا موقع دیتی ہے۔ محنت کی روزی آدمی کو سہولت پسندی سے بچاتی ہے۔ محنت کی روزی شخصیت کی تکمیل کا اہم ذریعہ ہے۔ اگر مجبوری نہ ہو تب بھی آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی

زندگی کے لیے محنت کا طریقہ اختیار کرے، وہ ہر حال میں اپنے آپ کو آرام طلبی سے بچائے۔

084 — زبان پر روک

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو دہرانے لگے۔ یہ حدیث آداب کلام کے ایک اہم اصول کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ سوچے بغیر کبھی نہ بولے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کے خلاف بہت سی باتیں سنتے ہیں۔ یہ تجربہ ہے کہ سنی ہوئی بات جب دہرائی جاتی ہے تو اکثر وہ کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بات اتنی بدل سکتی ہے کہ ایک سچی بات جھوٹی بات بن جائے۔ اس لیے صرف سننے کی بنیاد پر آدمی کو اسے کبھی دہرانا نہیں چاہئے۔ اچھی خبر کو دہرانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر بری خبر ہو تو اس کو اس وقت تک نہیں دہرانا چاہئے جب تک تحقیق کرکے پوری بات معلوم نہ کر لی جائے۔

085 — غیبت کا کفارہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ غیبت کا ایک کفارہ یہ ہے کہ تم اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے۔ غیبت یہ ہے کہ آدمی کی غیر موجودگی میں اس کی کسی برائی کو بیان کیا جائے۔

غیبت ایک بدخواہی کا عمل ہے۔ جب کسی آدمی سے غیبت کی غلطی ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس آدمی کے لیے خیر خواہی کا معاملہ کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ اور خیر خواہی کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اس کے حق میں اچھی دعائیں کرے۔ یہ غیبت کرنے والے کی طرف سے بدخواہی کے بعد خیر خواہی کا ایک معاملہ ہوگا جو اس کے گناہ کو اس سے پاک کر دے گا۔

086 — جامع نصیحت

پیغمبر اسلام نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ کیا میں تم کو ایک جامع نصیحت کروں۔ اس نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی زبان کی حفاظت کرو۔

زبان کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کچھ بولے سوچ کر بولے۔ وہ ایسی بات نہ کہے جو دوسروں کو ستانے والی ہو۔ ایسی بات جس سے سماج میں برائی پھیلے اس سے وہ ہر حال میں اپنے آپ کو بچائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر سماجی برائیاں زبان کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ زبان کو کنٹرول میں رکھنا سماجی برائیوں کا دروازہ بند کرتا ہے اور زبان پر کنٹرول نہ کرنا سماجی برائیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔ یہ سنجیدگی کی پہچان ہے کہ آدمی اپنی زبان کو ہمیشہ محتاط انداز میں استعمال کرے۔ زبان کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی برائی کرے، وہ دوسروں کے ساتھ سخت کلامی کرے۔ وہ دوسروں کے عیب کو ڈھونڈ کر اسے لوگوں میں پھیلائے۔

087 — صبر واعراض

اسلام کی ایک تعلیم صبر ہے۔ قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ مزید فرمایا کہ اپنے رب کے لیے صبر کرو (ولربّك فاصبر) اسی طرح فرمایا کہ صبر کرو اور تمہارا صبر اللہ کے لیے ہے۔ جب ایک آدمی صبر کرتا ہے تو بظاہر اس کا یہ صبر کسی انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ خدا کے تخلیقی نقشہ سے مطابقت کرنے کے ہم معنٰی ہوتا ہے۔

خدا نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر ایک کو آزادی ہو۔ ہر ایک کے لیے مسابقت کا کھلا ماحول ہو۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے نقصان کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ناخوش گوار تجربہ پر صبر کرنا گویا خدا کے تخلیقی نقشہ پر راضی ہونا ہے۔ صبر کی اسی اہمیت کی بنا پر خدا نے صبر کو خود اپنے لیے صبر کرنے کا معاملہ بتایا۔ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ جو آدمی صبر کرے گا اس کو بے حساب انعام دیا جائے گا۔

088 — یکطرفہ برداشت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو تمہارے اوپر ظلم کرے اس کو معاف کر دو۔ یہ نہایت حکمت کی تعلیم ہے۔ ظلم کا خاتمہ ظلم کو معاف کر کے ہوتا ہے۔ ظلم کے خلاف جوابی کارروائی کرنا کبھی ظلم کو ختم نہیں کرتا۔

پیغمبر اسلام کا یہ قول دراصل نتیجہ خیز عمل (result oriented action) کی تعلیم ہے۔ اگر

کوئی شخص ظلم کی کارروائی کرے تو مظلوم کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی کارروائی ایسی ہو جو اس کی مظلومیت کو ختم کرے نہ کہ وہ اس کی مظلومیت کو بڑھا دے۔ جب بھی کوئی مظلوم اس طرح سوچے تو وہ پائے گا کہ ظالم کو معاف کرنا سب سے بڑا انتقام ہے۔ ظالم کے ظلم کو بھلا دینا ظلم کو ختم کرنے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر ہے۔ ظالم کو معاف کرنا کوئی مجبورانہ فعل نہیں، یہ ایک اعلیٰ اخلاقی اصول ہے۔ کوئی آدمی جب ظالم کو معاف کرے تو اس کو آزادانہ اصول کے طور پر ایسا کرنا چاہئے۔ مجبورانہ طور پر معاف کرنا بھی بے قیمت ہے اور معاف نہ کرنا بھی بے قیمت۔

089 — اعراض کا طریقہ

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں اور نادانوں سے اعراض کرو۔ موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کا یہ ایک بے حد اہم اصول ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نباتات کی دنیا میں جس طرح پھول کے ساتھ کانٹے ہیں اسی طرح انسانی دنیا میں دانشوروں کے ساتھ نادان لوگ ہر جگہ کثرت سے موجود ہیں۔ جس طرح نباتات کی دنیا میں آدمی کانٹوں سے الجھے بغیر پھول کو لے لیتا ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسے نادانوں سے الجھے بغیر اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا ہے۔

نادانوں سے الجھ کر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لیے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ جب بھی کسی نادان سے سابقہ پڑے تو اس کو نظر انداز کر کے آدمی آگے بڑھ جائے۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ دنیا سے نادانوں کے وجود کو مٹا دے۔ البتہ یہ ہر ایک کے بس میں ہے کہ وہ نادانوں سے الجھے بغیر اپنی زندگی کی تعمیر جاری رکھے۔ نادانوں سے اعراض میں یہ اندیشہ نہیں کہ وہ دلیر ہو جائیں گے۔ اعراض آگ کو بجھانے والا ہے، وہ آگ کو بھڑکانے والا نہیں۔

090 — صبر میں کامیابی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جان لو کہ صبر کے ساتھ کامیابی ہے۔ اس حدیث میں صبر کی غیر معمولی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔ اس کے مطابق، صبر ہر قسم کی ترقیوں کا زینہ ہے۔ اس دنیا میں صبر کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر آدمی کے ساتھ اتار اور چڑھاؤ کے واقعات پیش

آتے ہیں۔ ہر آدمی کو بار بار کسی ناپسندیدہ صورت حال کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بے ہمت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی کے امکانات اتنے زیادہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ایک ناکامی کے بعد ہمیشہ دوسری کامیابی موجود رہتی ہے۔ صبر کا مقصد گویا اپنے آپ کو بے حوصلگی سے بچا کر اگلے موقع کا انتظار کرنا ہے۔ اگر آدمی پہلی ناکامی کے بعد صبر کا ثبوت دے تو بہت جلد وہ پائے گا کہ دوسری کامیابی اس کے قریب ہی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

091 — چھوٹے شر پر راضی ہونا

پیغمبر اسلام کے ایک صحابی عمیر ابن حبیب بن خماشہ نے کہا کہ جو شخص نادان کے چھوٹے شر کو برداشت نہیں کرے گا اس کو نادان کے بڑے شر کو برداشت کرنا پڑے گا۔

موجودہ دنیا میں جس طرح سمجھ دار لوگ ہیں اسی طرح یہاں نادان لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ نادان لوگ اپنی نادانی کی بنا پر دوسروں کو کچھ نہ کچھ تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ تکلیف ابتدا میں ایک چھوٹی تکلیف ہوتی ہے۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ اس چھوٹی تکلیف کو برداشت کرلیا جائے۔ جو آدمی چھوٹی تکلیف پر نادان سے الجھ جائے تو نادان ضد میں آ کر اس کو اور زیادہ بڑی تکلیف پہنچائے گا۔ ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ چھوٹی تکلیف کو برداشت کرلیا جائے تاکہ بڑی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

092 — تحمل کے ذریعہ دفاع

مشہور صحابی رسول عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ جہالت کرنے والے کی جہالت کا دفاع تم تحمل کے ذریعہ کرو۔ صحابی کے اس قول کے مطابق، دفاع کا ایک مناسب طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے لیے جوابی دفاع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا سابقہ نادانوں سے پڑ جاتا ہے۔ ایسے نادانوں کے شر سے بچنے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ تحمل کا طریقہ ہے۔ تحمل کا طریقہ نادانوں کی کارروائی کو پہلے ہی مرحلہ میں روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر نادانوں کے مقابلہ میں ردّعمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کی برائی بڑھتی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ قابو سے باہر ہو جائے گی۔

093 — غصہ نہیں

ایک شخص پیغمبر اسلام کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے کوئی ایسی نصیحت کیجئے جو میری پوری زندگی کو سدھارنے کا ذریعہ بن جائے۔ آپ نے فرمایا: تم غصہ نہ کرو۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت جامع نصیحت ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو اگر آدمی اختیار کر لے تو اس کی زندگی کے تمام معاملات درست ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان ہمیشہ ایک سماج کے اندر رہتا ہے۔ اس کو بار بار ایسے ناپسندیدہ تجربات پیش آتے ہیں جو اس کو بھڑکا دیں اور اس کے اندر غصہ پیدا کر دیں۔ اور پھر جب آدمی غصہ میں آجائے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ غصہ دلانے والے کے خلاف انتقامی کارروائی کرتا ہے اور پھر ہر انتقام دوبارہ ایک نئے انتقام کو بھڑکاتا ہے۔ اس طرح انتقام در انتقام کا سلسلہ چل پڑتا ہے جو تباہی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

ایسی حالت میں اپنی زندگی کے سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ غصہ جیسے جذبات سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائے۔ وہ منفی حالات کا بھی مثبت انداز میں جواب دے۔

094 — غصہ کا حل

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جب کسی آدمی کو غصہ آئے تو اگر وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے۔ اگر وہ بول رہا ہے تو چپ ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس حالت میں ہے وہ اس حالت کو بدل دے۔ حالت کی یہ تبدیلی اس کے لیے غصہ کو ختم کرنے کا سبب بن جائے گی۔

غصہ ایک آگ ہے جو کسی ناخوشگوار بات پر آدمی کے اندر بھڑکتی ہے۔ غصہ آدمی کو تخریبی طریقہ کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ نقصان میں مبتلا کرنے والا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقلمندی یہ ہے کہ غصہ آتے ہی فوراً اس کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیر کی جائے۔ تدبیر کے ذریعہ آدمی غصہ کو منٹوں میں ختم کر سکتا ہے۔ لیکن اگر غصہ کو باقی رہنے دیا جائے تو وہ آدمی کو ایسے نقصانات پہنچاتا ہے جس کی تلافی پھر کبھی ممکن نہ ہو۔

غصہ آنا ایک فطری بات ہے۔ غصہ آنا بذات خود برا نہیں، بری بات یہ ہے کہ آدمی اپنے غصہ

پر کنٹرول نہ کر سکے۔ غصہ پر کنٹرول نہ کر سکنا خود اپنے آپ سے شکست کھا جانا ہے اور اپنے آپ سے شکست کھانا بلاشبہہ سب سے زیادہ بری شکست ہے۔

095 — شیطان سے پناہ مانگنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ جب بھی تم کو محسوس ہو کہ شیطان تم کو بہکا رہا ہے تو تم کہو: اللهم إني اعوذ بك من همزات الشيطان (اے خدا، میں شیطان کے وسوسوں کے مقابلہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں)۔

شیطان انسان کا دشمن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان کو صحیح راستہ سے بھٹکائے۔ وہ طرح طرح کے وسوسے ڈال کر انسان کو سچائی سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان آدمی کو دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خفیہ طور پر انسان کے اوپر حملہ کرتا ہے۔ انسان اس شیطانی حملہ کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہے۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے، خدا سے مدد مانگنا۔ خدا کا وعدہ ہے کہ جب بھی کوئی آدمی شیطان کے مقابلہ میں خدا سے پناہ مانگے گا وہ ضرور اس کو اپنی پناہ دے گا۔ یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔

096 — طاقت ورکون

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے۔ بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ یہ بلاشبہہ کسی شخص کے طاقت ور ہونے کا سب سے زیادہ اعلیٰ معیار ہے۔ جسمانی مقابلہ میں کسی کو پچھاڑنا کوئی بڑا کارنامہ نہیں، ایسا کارنامہ تو ایک حیوان بھی کر سکتا ہے۔ کسی انسان کے طاقتور ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب اس کو کسی کے اوپر غصہ آئے تو وہ اپنے آپ کو پوری طرح کنٹرول میں رکھے۔ غصہ کے باوجود وہ انسانیت کے دائرہ سے باہر نہ جائے، وہ غصہ کے اوپر غالب رہے نہ کہ غصہ اس کے اوپر غالب آجائے۔

097 — مشکل میں آسانی

قرآن میں فطرت کے جن قوانین کو بتایا گیا ہے ان میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں مشکل کے ساتھ آسانی رکھی گئی ہے (الانشراح) یعنی مشکل کے بعد نہیں بلکہ خود مشکل کے ساتھ ہی آسانی کا پہلو شامل ہے۔ یہ فطرت کا ابدی قانون ہے وہ کبھی بدلنے والا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں مشکل کے مقابلہ میں امکانات کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اگر ایک مشکل پیدا ہو یا ایک بار کوئی نقصان ہو جائے تو آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس کو چاہئے کہ وہ اپنی سوچنے کی صلاحیت کو استعمال کرے۔ جب وہ سوچے گا تو وہ جانے گا کہ عین اسی وقت اور ٹھیک اسی مقام پر اس کے لیے بہت سے نئے امکانات موجود ہیں۔ وہ ایک چانس کو کھو کر وہ دوسرا چانس پا سکتا ہے جس کو استعمال کر کے وہ دوبارہ آگے بڑھ جائے۔ موجودہ دنیا میں زندگی کا بہترین فارمولا یہ ہے کہ ---- مسائل کو نظر انداز کر و اور مواقع کو استعمال کرو۔ ناموافق حالات کو حسن تدبیر سے اپنے موافق بنانے کی کوشش کرو۔ ناکامی کو زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعہ کامیابی میں تبدیل کرو۔

خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنی عقل کو استعمال کر کے اپنے مائنس کو پلس بنا سکے۔ یہ امکان ہر اس شخص کے لیے موجود ہے جو ہمت نہ ہارے جو ناامیدی کے حالات میں بھی پر امید بنا رہے۔

098 — آسان طریقہ کا انتخاب

پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ پیغمبر کی عمومی پالیسی کو بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ جب بھی پیغمبر اسلام کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ مشکل انتخاب کو چھوڑ دیتے اور آسان انتخاب کو لے لیتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو پر تشدد طریق کار اور پر امن طریق کار کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا تو آپ پر تشدد طریقِ کار کو چھوڑ دیتے اور پر امن طریقِ کار کو اختیار کرتے۔ اس طرح جب بھی آپ کو اعراض اور ٹکراؤ کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ ٹکراؤ کے طریقہ کو چھوڑ دیتے اور اعراض کے طریقہ کو اختیار کرتے۔ اسی طرح جب آپ کو جنگ اور صلح کے درمیان انتخاب کا موقع ہوتا تو آپ ہمیشہ جنگ کو چھوڑ دیتے اور صلح کو قبول کر لیتے۔

یہی حکمت ہے۔ اس حکمت کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کسی مزید بگاڑ سے بچ جائے اور اپنے معاملات کو کامیابی کے ساتھ درست کرتا چلا جائے۔ ہر معاملہ میں ہمیشہ دونوں طریقِ کار کا امکان ہوتا ہے۔ مگر عقل مندی وہی ہے جس کا نمونہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہمیں ملتا ہے۔

099 — ناپسندیدگی میں خیر

قرآن میں ایک موقع پر نصیحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار

سمجھو اور وہ تمہارے لیے بھلی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔

اس آیت کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ لوگ عام طور پر چیزوں کو ظاہر کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ وہ ظاہری دلکشی کی بنا پر ایک چیز کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اور جو چیز ظاہر کے اعتبار سے دلکش نہ ہو اس کو ناپسندیدہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقی انجام کے اعتبار سے یہ طریقہ درست نہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر دیکھنے میں اچھی نہیں لگتی مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے انسان کے لیے اسی میں فائدہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک چیز بظاہر دیکھنے میں اچھی لگتی ہے مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ برے انجام کی طرف لے جانے والی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے چیزوں کے بارے میں فیصلہ نہ کرے بلکہ وہ گہری حقیقتوں کے اعتبار سے چیزوں کو دیکھے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے۔

100— ایک دعا

پیغمبر اسلام کی ایک دعا ان الفاظ میں آئی ہے: **اللھم ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه وارنا الاشیاء کما ھی** ۔ (اے خدا مجھے حق کو حق کی صورت میں دکھا اور مجھے اس کی پیروی کی توفیق دے اور مجھے باطل کو باطل کی صورت میں دکھا اور مجھے اس سے بچنے کی توفیق دے اور مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)۔

موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر موضوعی طرز فکر (objective thinking) ہو۔ اس حدیث میں اسی کے لیے دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی ایسے حالات کے درمیان رہتا ہے کہ وہ اکثر حق کو باطل کے روپ میں دیکھنے لگتا ہے اور باطل کو حق کے روپ میں۔ اس دعا میں بندہ اپنے رب سے سوال کر رہا ہے کہ وہ اس کو اس گمراہی سے بچائے۔ وہ اس کے اندر وہ نگاہ پیدا کرے جو چیزوں کو اس کی اصل روپ (as it is) میں دیکھنے لگے۔ صحیح سوچ سے صحیح عمل پیدا ہوتا ہے اور صحیح عمل آدمی کو ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس پیغمبرانہ دعا کے مطابق، ہر انسان اس فکری مسئلہ سے دوچار ہے کہ حق اس کو حق کی صورت میں نہ دکھائی دے اور باطل اس کو باطل کی صورت میں نہ دکھائی دے۔ یہ مسئلہ کنڈیشننگ

(conditioning) کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی پیدائش کے بعد ایک ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ ابتدائی عمر میں وہ ذہنی ناپختگی کی بنا پر ماحول کے اثر کو قبول کرتا رہتا ہے۔ اسی کا نام کنڈیشننگ ہے۔ پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے شعور کو متحرک کرکے اپنی کنڈیشننگ کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے آپ کو مطابق واقعہ سوچ (as it is thinking) کے درجہ تک پہنچائے۔ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو باشعور بنا کر اس کو اس سلف ڈی کنڈیشننگ کے لیے تیار کرے۔ مذکورہ دعا اسی ڈی کنڈیشننگ کے عمل میں یقین کے عنصر کا اضافہ ہے۔

حکمتِ معرفت

مستقبل پکار رہا ہے

درخت کیا ہے۔ درخت خدا کا ایک جادو ہے۔ وہ ایک معجزاتی واقعہ ہے جو خدا اپنی خصوصی قدرت سے زمین پر ظاہر کرتا ہے۔ درخت اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اس کے لئے زندگی اور ہریالی کا ایک نیا امکان کھول دے، کوئی ہے جو خدا کے ساتھ ایک امید قائم کرے تاکہ خدا اس کی امید کو اس کے قیاس وگمان سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں اس کے حق میں پورا کردے۔

جب برسات کا موسم آتا ہے اور پانی سے لدے ہوئے بادل آسمان میں تیرنا شروع کرتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک فضاؤں میں ایک تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بارش کا پیغام لے کر ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں تو یہ سب دراصل خدا کے ایک مطلوب کا اظہار ہوتا ہے، یہ مطلوب کہ خدا اپنی زمین میں کچھ ہرے بھرے درخت اگانا چاہتا ہے۔ اس وقت جو کسان خدا کے اعلان کو سمجھ لے اور ایک بیج لے کر زمین میں ڈال دے تو اس کے فوراً بعد خدا کا جادو ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں خالی زمین تھی وہاں معجزاتی طور پر ایک سرسبز وشاداب کائنات نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے سائے کے نیچے لوگ پناہ لیں۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جو لوگوں کے لئے رنگت اور خوشبو اور لذت کا ایک عظیم خدائی دسترخوان بن جائے۔

دنیا کا معاملہ بھی آج کچھ ایسا ہی ہے۔ موجودہ دنیا کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حد پر پہونچ کر کسی نئے انقلاب کا انتظار کر رہی ہے ــــ خدا کا نام آج لوگوں کے لیے ذاتی کاروبار کا

عنوان بن چکا ہے ۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کو صرف فساد اور بگاڑ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے ۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں لوگوں کے لئے لوٹ کا میدان بنی ہوئی ہیں ۔ خدا کی دنیا میں انسان نے خود اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بیٹھا رکھا ہے ۔ ظلم اور فساد اتنا بڑھ چکا ہے کہ انسانی نسل پر دوبارہ وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو حضرت نوح نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارہ میں کہے تھے: انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا (نوح ٢٧)

بگاڑ کی یہ انتہا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہو۔ وہ وقت آگیا ہے کہ دوبارہ زمین پر ایک طوفان نوح برپا ہو، تاکہ تمام برے لوگ اس میں غرق کر دئے جائیں اور تمام اچھے لوگ اس سے بچا کر خدا کی زمین کے وارث بنا دیے جائیں اور پھر وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کریں جو موجودہ دنیا سے زیادہ بہتر ہوگی اور زیادہ بابرکت ۔

مگر طوفان نوح سے پہلے اعلان نوح کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے اٹھیں اور اپنی صحیح ترین اور کامل ترین صورت میں حق کا اعلان کردیں ۔ خدائی موسم اب آخری طور پر آچکا ہے ۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کوئی کسان اپنا بیج لے کر زمین میں ڈال دے ۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن خدا کا معجزاتی کرشمہ بھی ظاہر ہوجائے گا ۔ خدا کی نصرتیں اس بندہ کے اوپر آسمان کے دروازے پھاڑ کر ٹوٹ پڑیں گی تاکہ جو کچھ بندے کو کرنا ہے بندہ اسے انجام دیدے ۔ اور تاکہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے خدا اس کو ظہور میں لے آئے ۔

اعلان حق کا مطلب حق کو آخری حد تک مبرہن کر دینا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کل خدائی کی سطح پر کھولا جانے والا ہے اس کو آج بندگی کی سطح پر لوگوں کے لئے کھول دیا جائے ۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا تھا ۔ اور وہ لوگ دوسری طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا اور اپنے آپ کو اس کی سمت میں کھڑا نہیں کیا ۔ جب یہ عمل پورا ہوتا ہے تو اس کے فوراً بعد خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے ۔ اس وقت لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ پہلا گروہ جنت کے زینہ پر کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گروہ جہنم کے زینہ پر ۔

انذارِ آخرت

سرونسٹن چرچل نے ۱۹۵۴ میں جنگ کے خلاف چیتاونی دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج ساری دنیا جہنم کے کنارے پر گھوم رہی ہے :

The world is roaming around the brim of hell.

چرچل کے سامنے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے اپنے انتباہ میں "جہنم" کا لفظ مجازی طور پر استعمال کیا تھا۔ مگر ایک باخبر مومن اور داعی کے لیے یہ مجاز نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری دنیا ایک بھڑکتی ہوئی جہنم کے کنارہ کھڑی ہے۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کب وہ اس کے اندر گر پڑے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ٹل سکتا ہے، مگر جہنم کا خطرہ اتنا یقینی ہے کہ اس سے اللہ کے متقی بندوں کے سوا کوئی بھی مامون و محفوظ نہیں۔

تیسری عالمی جنگ کے خطرات سے جو لوگ آگاہ ہیں، وہ اس کو ٹالنے کے لیے رات دن سرگرم عمل ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ جہنم کے شدید تر خطرات سے آگاہ ہیں، ان کو سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ کر سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ آدمی کو اگر اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دن کا سکون اور رات کی نیند اڑ جائے۔ اس کی نفسیات کے اندر ایک ایسا بھونچال آجائے کہ وہ چاہنے لگے کہ کاش میرا ہر بال ایک زبان ہوتا اور میں اپنی ساری قوت کو استعمال کر کے ساری دنیا کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیتا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ آپ لوگوں کو خدا کا مومن بنانے کے لیے اتنا زیادہ بے قرار رہتے تھے گویا کہ آپ اسی غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ (الشعراء ۳)

بخاری و مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی بابت فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر تم کو آگ میں جانے سے روک رہا ہوں اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ تم آگ میں گرے جا رہے ہو (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۳)

جو مسئلہ جتنا زیادہ بڑا ہو اتنا ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے سرگرمی دکھائی جائے۔ مومن کی نظر میں آخرت کا مسئلہ سب سے بڑا ہوتا ہے اس لیے وہ آخرت کے لیے سب سے زیادہ سرگرم ہوتا ہے۔

نازک پارسل

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سامانوں کے بعض پارسل پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ احتیاط سے اٹھاؤ (Handle with care) یہ وہ پارسل ہیں جن میں کوئی نازک چیز (مثلاً شیشہ) پیک ہوتا ہے۔ اس طرح کے پارسلوں کے ساتھ اگر بے احتیاطی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کے اندر کا سامان ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے پارسلوں کے اوپر یہ ہدایت لکھ دی جاتی ہے کہ ان کو اٹھانے اور رکھنے میں احتیاط کرو۔

پارسلوں میں تو ایسے پارسل بہت کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ اِس قسم کا نازک مسئلہ وابستہ ہو۔ مگر آج کل کے انسانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی قسم کے نازک پارسل ہیں۔ ہر آدمی گویا مسٹر پرابلم (Mr. Problem) یا مسٹر ہینڈل وِدھ کیر (Mr Handle with care) بنا ہوا ہے۔

یہ وہ انسان ہیں جن کے ساتھ ذرا سا بھی کوئی خلاف مزاج بات پیش آجائے تو وہ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خلاف اس قسم کی شکایتیں لیے پھرتے ہیں کہ اُس نے یہ کہدیا، اِس نے وہ کہہ دیا۔ ایسے لوگ خدا کی زمین پر بوجھ ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کوئی طاقت ور سماج نہیں بن سکتا۔

بہترین انسان وہ ہے جو لوہے کی مانند ہو۔ جس کو آہستہ رکھیے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے اور اگر زور سے پٹک دیجیے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے۔ وہ جھٹکوں سے غیر متاثر رہ کر جینا جانتا ہے۔ رسول اللہؐ کے اصحاب ایسے ہی لوہا صفت انسان تھے۔ وہ اِس قسم کی باتوں سے بہت اوپر اٹھ گیے تھے۔ عمر فاروقؓ نے خلیفۂ اول ابو بکر صدیقؓ کے ایک فرمان کو کھلے عام پھاڑ ڈالا (مَزَّقَهُ عمر) مگر خلیفہ اول نے اس کو کچھ بھی بُرا نہیں مانا۔ عائشہ صدیقہؓ نے ایک صحابی (ابو ہریرہؓ) کے متعلق کہہ دیا کہ ابو ہریرہ نے جھوٹ کہا (کذب ابو هريرة) مگر صحابی نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا، وغیرہ۔

سیرت کی کتابوں میں اِس طرح کے سیکڑوں واقعات ملتے ہیں۔ ایک صحابی کو دوسرے صحابی سے بار بار ناموافق تجربہ ہوتا تھا مگر وہ لوگ اس کا اثر لیے بغیر آپس میں بھائی بھائی بنے رہتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتوں کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ اصحاب رسول اگر آج کل کے لوگوں کی طرح نازک پارسل ہوتے تو وہ کبھی وہ طاقت ور انقلاب برپا نہیں کر سکتے تھے جس نے تاریخ عالم کے رُخ کو موڑ دیا۔

زندگی کی کھیتی

محمد ابن اسحاق (۱۵۱-۸۵ھ) کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ۴۰ سال پہلے کعبہ کے اندر ایک پتھر پایا تھا۔ اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

مَن یَزرَعْ خَیرًا یَحصِدْ غبطۃً۔ ومَن یَزرَعْ شرًا یَحصِدْ ندامۃ۔ تعملون السیئاتِ وتُجزونَ الحسناتِ۔ اجل۔ کما لا یُجتنیٰ منَ الشَّوكِ العنبُ۔

جو شخص نیکی بوئے گا وہ قابلِ رشک فصل کاٹے گا۔ اور جو شخص برائی بوئے گا وہ شرمندگی کی فصل کاٹے گا۔ تم برائی کروگے اور اچھا بدلہ پاؤگے، ہاں ایسا نہیں ہوسکتا، جس طرح ببول کے پیڑ سے انگور توڑے نہیں جاسکتے۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۱۳)

گمان غالب ہے کہ یہ کسی پیغمبرانہ کلام کا حصہ ہے جس کو عرب کے کسی صالح مرد نے ایک پتھر پر عربی زبان میں لکھا اور اس کو کعبہ کے اندر محفوظ کردیا۔

ان الفاظ میں جو بات کہی گئی ہے، وہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ وہ تمام پیغمبروں کی بات ہے۔ وہ قدیم انسان کے لیے بھی تھی، وہ آج کے انسان کے لیے بھی ہے۔ اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لیے اس کی سچائی باقی رہے گی۔

نباتات کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا یہ ناقابل تغیر قانون نافذ ہے کہ پھول کی کھیتی سے پھول اگتا ہے اور کانٹے کی کھیتی سے کانٹا۔ اس ابدی قانون میں کوئی تبدیلی کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس انتہائی ظاہر اور معلوم قانون کے ذریعہ انسان کو ایک سنگین نوعیت کا عملی سبق دیا ہے۔ وہ یہ کہ نباتات کے لیے جو قانون ہے، وہی قانون انسان کے لیے ہے۔ جو شخص بھلائی کی فصل بوئے گا، وہ لازماً بھلائی کی فصل کاٹے گا۔ اسی طرح جو شخص برائی کی فصل بوئے گا، وہ لازماً برائی کی فصل کاٹے گا۔

انسان کو چاہیے کہ اس معاملہ میں وہ آخری حد تک چوکنا رہے۔ جو آدمی ایسا نہیں کرے گا، وہ ابدی طور پر حسرت اور ندامت کی آگ میں جلتا رہے گا، اور کوئی نہ ہوگا جو اُس کو اِس برے انجام سے بچا سکے۔

فیض بقدرِ استعداد

حدیث میں ہے کہ تمہارے دین کی سب سے بہتر چیز تفقہ ہے (خیر دینکم الفقہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی: اللّٰهم فقّهه في الدّين وعلّمه التاويل (خدایا، اس کو دین کی فہم عطا فرما اور اس کو تاویل کلام کی صلاحیت دے) بخاری و مسلم میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ابي موسىٰ رضي الله عنه عن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال: إنّ مثلَ ما بعثني اللهُ به من الهدىٰ والعلم كمثل غيث اصاب ارضًا، فكانت منها طائفة طيبة قبلت الماء فانبتت الكلأ والعشب الكثير... وكان منها اجادب امسكت الماء فنفع الله بها الناس... فشربوا منها وسقوا وزرعوا.... واصاب طائفة منها اخرىٰ، انّما هي قيعان لا تمسك ماء ولا تنبت كلأ ... فذالك مثل من فقه في دين الله ونفعه ما بعثني الله به فعلم وعلّم، ومثل من لم يرفع بذالك رأسا، ولم يقبل هدى الله الذي ارسلت به۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جس ہدایت اور علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایک بارش کی ہے جو زمین پر برسے۔ اس کا ایک حصہ زرخیز تھا۔ اس نے پانی کو قبول کیا اور خوب گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور اس زمین کا ایک حصہ بنجر زمین ہو۔ اس نے پانی کو روکا تو اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہونچایا۔ اور زمین کا ایک اور حصہ ڈھلوان تھا۔ وہ نہ پانی کو روکتا تھا اور نہ سبزہ اُگاتا تھا۔ پس یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی، اس سے اس کو نفع ہوا۔ اس نے سیکھا اور سکھایا۔ اور (دوسری) مثال اس شخص کی ہے جس کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا اور اس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

زمین کو بارش کا فائدہ اس کی استعداد کے بقدر ملتا ہے، یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ خدا کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ مگر جو شخص جتنی استعداد کا ثبوت دے گا اتنا ہی فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ اور سب سے بڑا فائدہ جو ہدایت الٰہی سے کسی کو ملتا ہے وہ معرفت ہے۔

علم اور تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ تم کو علم دے گا (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ ، البقرۃ ۲۸۲) دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈروگے تو وہ تم کو پہچان دے گا (ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو... وہ تم کو روشنی عطا فرمائے گا جس میں تم چلوگے (... ویجعل لکم نوراً تمشون بہ،

امام مالک نے امام شافعی سے ان کی جوانی کی عمر میں نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: اے لڑکے، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دل کو روشنی سے بھر دیا ہے تو تم اس کو گناہ کی تاریکی سے نہ بجھا ؤ (یا فتی انی اریٰ اللہ قد ملأ قلبک نوراً فلا تطفئہ بظلمۃ المعصیۃ)

امام شافعی نے اپنے استاد وکیع بن الجراح سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر اس طرح اشعار میں کیا ہے:

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فارشدنی الی ترک المعاصی

واخبرنی بان العلم نور ونور اللہ لا یھدیٰ لعاصی

میں نے شیخ وکیع سے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور انھوں نے مجھے بتایا کہ علم روشنی ہے اور اللہ کی روشنی کسی گناہگار کو راستہ نہیں دکھاتی۔

یہاں علم سے مراد معلومات نہیں، معرفت ہے۔ ایک حقیقی معرفت تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کے پاس الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر صحت فکر ہو۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہی صحت فکر پیدا کرتا ہے۔

آدمی جتنا زیادہ سنجیدہ ہو اتنا ہی زیادہ اس کے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور درست طریقہ پر سوچ سکے۔

اللہ کا ڈر آدمی کے الفاظ اور معلومات کے لئے ایسا ہی ہے جیسے سانچہ خام اشیاء کے لئے۔ سانچہ خام اشیاء کو بامعنی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا ڈر الفاظ اور معلومات کو معرفت میں ڈھال دیتا ہے۔

کچھ علوم انسانی مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور کچھ علوم خدا کے مدرسہ میں۔

حسد کے بجائے دعا

لطیفہ ہے کہ ایک غریب دیہاتی تھا۔ وہ معاشی اعتبار سے بہت پریشان رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس سے کہا کہ تم اکبر بادشاہ کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ ہر مانگنے والے کو دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی ضرور دے گا اور تمہارا معاشی مسئلہ حل ہوجائے گا۔ دیہاتی آدمی نے کہا کہ اکبر بادشاہ کو کس نے دیا ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ خدا نے۔ دیہاتی نے کہا کہ پھر ہم خدا ہی سے کیوں نہ مانگیں۔ ہم اکبر سے کیوں مانگیں۔

اس کے بعد وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور سنسان جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہاں جاکر اس نے اپنا میلا کپڑا زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ کر خدا سے دعا کرنے لگا۔ اس نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا: اے اکبر کو دینے والے، مجھے بھی دیدے۔ وہ اسی طرح دعا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوا اور اس نے اپنا کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی موجود تھی۔ یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے دماغ اور اونچے پڑھے لکھے لوگ اپنے شعور اور کردار کے اعتبار سے اس سطح پر بھی نہیں ہیں جہاں مذکورہ دیہاتی آدمی تھا۔

آج یہ حالت ہے کہ جب بھی کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اس سے بڑھ گیا ہے، خواہ یہ بڑھنا مال کے اعتبار سے ہو یا حیثیت کے اعتبار سے، تو فوراً وہ حسد میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس کے سینے میں بڑھنے والے آدمی کے خلاف نفرت اور جلن کی کبھی نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حسد اور جلن میں مبتلا ہونے والے لوگ اگر یہ سمجھیں کہ کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دیئے سے ملا ہے، وہی کم بھی دیتا ہے اور وہی زیادہ بھی دیتا ہے، تو وہ بھی وہی کریں جو مذکورہ دیہاتی نے کیا۔ وہ پانے والے انسان کے بجائے دینے والے خدا کی طرف دوڑیں۔ وہ خدا کو پکارتے ہوئے کہیں کہ جس طرح تو نے میرے بھائی کو دیا ہے اسی طرح تو مجھے بھی دیدے۔ اگر لوگوں میں یہ مزاج آجائے تو سماج کی تمام برائیاں اپنے آپ ختم ہوجائیں۔

کسی کی بڑائی کو دیکھ کر اپنی کمی کا احساس ابھرنا بذات خود ایک فطری جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا رُخ اگر خدا کی طرف ہو تو وہ صحیح ہے اور اگر اس کا رُخ آدمی کی طرف ہو تو غلط۔

موت کے بعد

غزوہ بدر میں ابوجہل جب مہلک زخم کھا کر گرا اور مرنے کے قریب ہوا تو اس نے پوچھا کہ مجھ کو مارنے والا کون ہے۔ کسی نے بتایا کہ انصار کے ایک نوجوان نے اس کو قتل کیا ہے۔ ابوجہل یہ سن کر بولا: لو غیر اکّار قتلنی (کاش کسان کے علاوہ کسی اور نے مجھ کو مارا ہوتا)

ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ ڈنکرک (فرانس) کے ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ اس کا نام جوزف ریڈفورڈ (Joseph Redford) تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس نے مہلک زہر کی خوراک کھالی۔ اس کے بعد وہ مقامی کریکٹ کلب میں گیا تاکہ مرنے سے پہلے اپنے کلب کے ساتھیوں سے آخری مصافحہ کر سکے۔ اس نے کلب کے ممبروں سے کہا:

Give me a whisky, I shall be dead in half an hour.

مجھ کو شراب کا ایک گلاس دو۔ آدھ گھنٹہ کے بعد میں مر جاؤں گا (ہندستان ٹائمس، نئی دہلی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰)

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان موت کو بس "خاتمہ" کا ایک معاملہ خیال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ دن دنیا میں رہ کر ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا نام موت ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جب وہ مرے تو عزت اور سکون کے ساتھ مرے۔ اس کے مردہ جسم کے اوپر مقبرہ کی صورت میں ایک شاندار یادگار قائم ہو جو موجود لوگوں کو ختم ہونے والے انسان کی عظمت یاد دلاتی رہے۔

مگر یہ سخت ترین قسم کی غلط فہمی ہے۔ موت، آدمی کی زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ آدمی کی زندگی کے ایک نئے اور طویل تر دور کا آغاز ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو "قاتل" کا حسب نسب معلوم کرنے کے بجائے وہ خود اپنے اعمال نامہ کو پڑھنے کی کوشش کرے، وہ بےخودی کی خوراک کھا کر بےخبر ہونے کے بجائے یہ چاہے کہ وہ آخری حد تک باہوش ہو جائے تاکہ کم از کم اپنے آخری لمحات کو ضائع ہونے سے بچا سکے۔

کتنا زیادہ فرق ہے بےخبر انسان اور باخبر انسان میں۔

حرص اور قناعت

پاکستان کے ڈاکٹر جاوید نے لکھا ہے کہ وہ امریکہ گیے۔ وہاں وہ ایک کروڑپتی سے ملے۔ کروڑپتی نے ان کو اپنے ایک خاص مکان میں ملاقات کے بلایا۔ یہ مکان سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ جدید طرز کا وسیع مکان، اس کے آگے شاندار لان، اس کے آگے حدنظر تک پھیلی ہوئی سمندر کی لہریں۔ چاروں طرف عیش اور خوبصورتی کے مناظر۔ اس ماحول میں مہمان اور میزبان دونوں مکان کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں کہ میں اس ماحول میں گم تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں جنت کی دنیا میں بیٹھا ہوا ہوں۔ مجھ پر محویت کا عالم طاری تھا۔ امریکی کروڑپتی بھی چپ چاپ کسی سوچ میں مبتلا تھا۔ اچانک امریکی نے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا: مسٹر جاوید، میں چاہتا ہوں کہ امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان چلا جاؤں اور زندگی کے بقیہ دن وہیں گزاروں۔

"کیوں" ڈاکٹر جاوید نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"یہ سب چیزیں مجھے کاٹتی ہیں۔ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی سکون حاصل نہیں"

یہ واقعہ دنیا کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ جو شخص پائے ہوئے نہ ہو وہ سمجھتا ہے کہ پانے کا نام خوشی ہے۔ مگر جو شخص پالے وہ محسوس کرتا ہے کہ پاکر بھی اسے خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ سب کچھ پاکر بھی اس نے خوشی کو نہیں پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہے چاہی ہوئی چیز کو نہ پانے کا۔ جو لوگ اس راز کو جان لیں وہ نہ ملنے پر بھی اس طرح مطمئن رہتے ہیں جیسے کہ انھوں نے سب کچھ پالیا ہو۔ اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہمیشہ اپنی چاہی ہوئی چیز کو پانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی بھی اس کو نہیں پاتے۔ کیونکہ پانے کے بعد جلد ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں جس کو انھوں نے پانا چاہا تھا۔ وہ ایک نہ ملنے والی چیز کے غم میں پڑے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتے ہیں۔

مذہب کی اصطلاح میں پہلی چیز کا نام قناعت ہے اور دوسری چیز کا نام حرص۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کی ساری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

ایمان کا کرشمہ

ابن تیمیہ مشہور حنبلی عالم ہیں وہ شام میں ۶۶۱ ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر دمشق میں ہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد تین سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

اپنے غیر مقلدانہ خیالات کی وجہ سے وہ اکثر حکومت اور علماء کے عتاب کا شکار ہوئے۔ ان کو جلاوطنی اور قید کا سامنا کرنا پڑا ان کی وفات بھی دمشق کے قید خانہ میں ہوئی۔

انھوں نے اپنے بارے میں ایک بار کہا کہ: جنتی فی صدری إن رحت فھی معی لا تفارقنی إن حبسی خلوۃ وقتلی شھادۃ و إخراجی من بلدی سیاحۃ۔ یعنی میری جنت میرے سینے میں ہے جب میں چلتا ہوں تو وہ میرے ساتھ ہوتی ہے وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوتی۔ میری قید میرے لیے تنہائی ہے اور جلاوطنی میرے لیے سیاحت ہے۔ اگر کوئی مجھے قتل کر دے تو وہ بھی میرے لیے شہادت ہوگی۔

ایمان ایک فکری انقلاب ہے۔ وہ آدمی کے طرز فکر کو پوری طرح بدل دیتا ہے۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے آپ میں جینے لگتا ہے۔ حق کی دریافت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ دنیا کا کھونا اور دنیا کا پانا اس کے لیے ایک اضافی چیز بن جائے۔ ایسے آدمی کے لیے قید ایک ایسی تنہائی ہوتی ہے جہاں وہ زیادہ غور و فکر کا موقع پالے اگر اس کو اپنے وطن سے باہر نکلنا پڑے تو وہ اس کے لیے مطالعہ اور مشاھدہ میں توسیع کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اگر اس کو جان و مال کے نقصان سے دوچار ہونا پڑے تو وہ بھی اس کی روحانیت میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے۔

ایمان آدمی کی روحانیت کو جگاتا ہے، وہ اس کے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک صاحب ایمان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ مادی سہاروں سے اوپر اٹھ جائے، وہ ایک بلندتر ربانی سطح میں سانس لینے لگے ایسے آدمی کے لیے کوئی محرومی محرومی نہیں کیونکہ جو اعلیٰ حقیقت اس نے پائی ہے وہ اس وقت بھی بھرپور طور پر اس کو حاصل رہتی ہے۔ جب کہ بظاہر تمام دنیوی چیزیں اس سے چھن چکی ہوں وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو خدائی جنت میں پاتا ہے جب کہ انسانوں نے اپنی بنائی ہوئی جنت سے اس کو باہر نکال دیا ہو۔

ایمان ایک طاقت ہے، بلکہ تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت۔

آخری انجام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور جس دن انکار کرنے والے آگ کے سامنے لائے جائیں گے، تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اسی وجہ سے تم نافرمانی کرتے تھے۔ (الاحقاف ۲۰)

اس آیت میں کفر سے مراد حق کا انکار کرنا ہے۔ اس میں جس کردار کا ذکر ہے وہ دراصل وہ انسان ہے جس کے سامنے حق کھلے دلائل کے ساتھ آیا مگر اس نے ذاتی مصلحتوں کی بنا پر اس کو نہیں مانا۔ وہ ایک ایسی حقیقت کا منکر بن گیا جس کا برسرِ حق ہونا اس کے سامنے واضح ہو چکا تھا۔

اس کردار سے مراد دراصل کسی سماج کے وہ خواص ہیں جو کسی سے اپنے ماحول میں ممتاز درجہ حاصل کئے ہوئے ہوں۔ مثلاً کوئی کسی قدیم گدی پر بیٹھ کر بڑا بنا ہوا ہو۔ کوئی تحفظ قوم کے نام پر قیادت حاصل کئے ہوئے ہو۔ کوئی کسی عوامی کارگزاری کو دکھا کر لوگوں کی نظر میں اونچا بن گیا ہو، وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب خالص حق کی آواز بلند ہوتی ہے تو ایک طرف وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ آواز بلاشبہہ صداقت کی آواز ہے۔ مگر دوسری طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر وہ اس حق کا کھلا اعتراف کریں تو وہ ان کے لئے اپنی حاصل شدہ حیثیت کی نفی کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ احساس ان کے اوپر اتنا زیادہ غالب آتا ہے کہ وہ حق کو حق سمجھتے ہوئے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کا قرآن کی مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ آخرت میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو کھول دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ دنیا میں جب تم نے حق کا اعتراف نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تم چاہتے تھے کہ اپنے ملے ہوئے دنیوی فائدوں کو باقی رکھو۔ تم نے دنیا کے فائدے کی خاطر آخرت کے فائدوں کو نظرانداز کیا۔ پھر جب تم اپنا فائدہ دنیا میں لے چکے تو آخرت کی نعمتوں میں تمہارے لئے کوئی حصہ نہیں۔ یہاں تمہارے لئے صرف محرومی ہے اور ابدی عذاب۔

ایمان بالغیب

ایمان کی ایک صورت یہ تھی کہ خدا ہمارے سامنے عیاناً موجود ہوتا۔ فرشتے ادھر سے ادھر چلتے ہوئے نظر آتے۔ جنت اور جہنم کے مقامات کو دیکھنا اسی طرح ممکن ہوتا جس طرح کوئی شخص دنیا کے شہروں میں داخل ہو کر اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو یقیناً دنیا میں کوئی انکار کرنے والا نہ ہوتا۔ مگر اس کے بعد وہ ربانی شخصیت نہ بنتی جس کو آدمی کے اندر بنانا مقصود ہے۔ لوگ خدائی حقیقتوں کو بس دیکھی ہوئی حقیقت کے طور پر جان لیتے، مگر وہ اس کو خود دریافت کردہ حقیقت کے طور پر نہ پاتے۔ جب کہ خود دریافت کردہ حقیقت کہیں زیادہ بڑی اور گہری ہے، اور وہی مومن سے مطلوب ہے۔

دیکھی ہوئی حقیقت کو جاننا آدمی کے وجود کو زیادہ گہرائی کے ساتھ متاثر نہیں کرتا۔ وہ اوپری علم بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر جب آدمی ایک چیز کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے، وہ اس کو جاننے کی کوشش میں اپنے دل ودماغ کی تمام قوتوں کو لگاتا ہے، اس کے بعد جب وہ چیز اسے ملتی ہے تو وہ اس کی پوری ہستی کو جگادیتی ہے۔ وہ اس کی محبوب ترین چیز بن جاتی ہے۔

جو شخص مومن بالغیب ہو، وہ دنیا میں اسی اعلیٰ ترین لیاقت کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ایسا شخص تھا جو غیر متعلق باتوں میں نہیں الجھا۔ اس نے حقیقت کا اعتراف کیا، اس نے جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے ایک امر واقعہ کو تسلیم کیا۔

نرم زمین پر پانی برستا ہے تو بوند بوند اس کے اندر جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی فرق پہلے شخص اور دوسرے شخص کے درمیان ہے۔ مومن کے لئے ہدایت ملنا گویا نرم زمین پر خدا کا مینھ برسنا ہے، اور غیر مومن تک ہدایت کی آواز پہنچنا ایسا ہے جیسے سخت پتھر پر پانی ڈالنا۔

جنت کا استحقاق

جنت بے حد عظیم نعمت ہے۔ وہ بے حد مہنگی قیمت پر کسی کو ملے گی۔ بہت تھوڑے خوش نصیب لوگ ہوں گے جو جنت کی لطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھہریں۔

جنت میں داخلہ کا پہلا امتحان یہ ہے کہ آدمی معرفت کے درجہ میں اپنے رب کو پائے۔ افکار و خیالات کے جنگل میں وہ سچائی کو دریافت کرے۔ وہ نہ دکھائی دینے والے واقعہ کو دیکھے۔ وہ نہ محسوس ہونے والی چیز کو محسوس کرے۔ وہ ظاہری ہنگاموں سے گزر کر باطن کی دنیا کا مسافر بن جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ آدمی سرکشی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دے۔ خود پرست بننے کے تمام محرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سچا خدا پرست بن جائے۔ کشش اور جاذبیت کے بے شمار مراکز سے منہ موڑ کر وہ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلہ صرف اس شخص کے لئے ممکن ہو گا جو منفی حالات کے درمیان ہمیشہ مثبت ذہن پر قائم رہے۔ جو اپنے سینے میں اٹھنے والے حسد اور گھمنڈ اور انتقام جیسے جذبات کو دفن کر کے یک طرفہ طور پر لوگوں کے لئے شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جائے۔ جو ظلم اور بے انصافی کے مواقع کو پانے کے باوجود انہیں استعمال نہ کرے اور ہر حال میں اپنے آپ کو عدل و انصاف کا پابند بنا لے۔

جنت ایک نفیس ترین خدائی کالونی ہے۔ اس نفیس کالونی میں صرف وہی روحیں داخل ہوں گی جو آخرت میں اس طرح پہنچیں کہ دنیا میں انہوں نے اپنے اوپر تطہیر کا عمل کر لیا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کثیف شخصیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ اب ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی ذات پر خود تطہیری کا ایک مسلسل عمل شروع کرے۔ یہاں تک

کہ اس کی کثیف شخصیت پاک و صاف ہو کر لطیف شخصیت میں بدل جائے۔

جنتی انسان وہ انسان ہے جو کانٹوں کے درمیان پھول بن کر رہے۔ جو اندھیروں کے درمیان روشنی کا مینار بن سکے۔ جو زلزلوں اور طوفانوں کے درمیان سکون کا راز پالے۔ جو نفرتوں کے درمیان محبت کا ثبوت دے۔ جو لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود یک طرفہ طور پر انہیں معاف کردے۔ جو کھونے میں بھی پانے کا تجربہ کرے۔

جنتی انسان وہ ہے جو بظاہر خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی خدا سے قریب ہو گیا ہو۔ جو سورج کی شعاعوں میں خدا کے نور کو دیکھے۔ جو ہواؤں کے جھونکے میں لمسِ ربانی کا تجربہ کرے۔ جو پہاڑوں کی بلندی میں خدا کی عظمت کا تعارف حاصل کر سکے۔ جو دریاؤں کی روانی میں خدا کی رحمت کا مشاہدہ کرے۔ جو مخلوقات کے آئینہ میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ یہ بتا دیا ہے کہ جنتی انسان کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ جو لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے اندر جنتی صفات پیدا کریں، وہ موت کے بعد جنت میں داخلہ کے مستحق قرار پائیں گے۔

جنت میں داخلہ نہ کسی سفارش کی بنیاد پر ہوگا، نہ کسی کے ساتھ نسبت کی بنیاد پر اور نہ کسی پراسرار عملیات کی بنیاد پر۔ جنت میں داخلہ پوری طرح معلوم حقیقت پر مبنی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنے قول و عمل کے اعتبار سے جنتی انسان بن کر رہے گا، وہ آخرت کی جنت میں داخلہ پائے گا۔

قرآن کے مطابق، جنت اہل تزکیہ کے لئے ہے۔ تزکیہ یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زندگی کو ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو حق سے روکنے والی ہیں۔ مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو اس کو نظر انداز کردے۔ نفس کی خواہش ابھرے تو وہ اس کو کچل دے۔ ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو وہ اس کو اپنے اندر دفن کردے۔

ذکرِ خداوندی

انسان کی کامیابی کیا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی قربت نصیب ہو۔ دنیا میں یہ قربت "ذکر" کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں یہ قربت "جنت" کی صورت میں خدا کے ذاکر بندوں کو ملے گی۔

ذکر دراصل خدا سے حیاتی قربت کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کے شعور اور احساس پر جب خدا کا تصور غالب آتا ہے تو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے دل پر خدا کا خیال چھایا رہتا ہے۔ ہر تجربہ اور مشاہدہ میں اس کو خدا کا جمال و کمال دکھائی دیتا ہے۔ اسی یاد خداوندی کا نام ذکر ہے۔

جب آدمی پر یاد کی یہ کیفیت غالب آتی ہے تو اس وقت اس کی زبان سے تسبیح و تحمید کے کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ یہ کلمات رٹے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے۔ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار کو "ذکر" کہنا ذکر کی تصغیر ہے۔ ذکر اس سے زیادہ لطیف حقیقت ہے کہ وہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار میں سما سکے۔ ذکر دراصل اپنے آپ کو اللہ میں گم کر دینے کی ایک حالت ہے، یہ بندہ اور خدا کا وہ آخری ملاپ ہے جو موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے۔

جنت خدا کی نعمتوں کا ابدی باغ ہے۔ یہاں خدا کی نعمتیں اپنی آخری اور معیاری صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یہ جنت انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کو اللہ کے سچے ذکر کی توفیق حاصل ہوئی۔

ذکر خدا کی معرفت میں جینے کا نام ہے۔ اور خدا کی معرفت میں جینے سے زیادہ عظیم کوئی زندگی موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ یہ ذکر کسی آدمی کو کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ قرآن میں غور و فکر بتایا گیا ہے۔ جب ایک انسان کے اندر ربانی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو خدائی زاویہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی پوری کائنات میں خدا کے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر چیز اس کے لئے خدا کا تعارف بن جاتی ہے۔ ان لطیف تجربات کے دوران اس کی زبان سے جو کلمات حمد نکلتے ہیں انھیں کا نام قرآنی اصطلاح میں ذکر ہے۔

ایک کتاب

روحانیت کے موضوع پر ایک کتاب ہے جو ۱۹۹۴ میں امریکہ سے چھپی ہے۔ اس میں فطرت (Nature) کو روحانیت کے حصول کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ۲۸۲ صفحات کی اس کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

This Blue Planet: Finding God in the Wonders of Nature. –Janice Miller

اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہمارے لئے بطن مادر (womb) کی طرح گویا ایک اور بطن ہے (صفحہ ۲۷۹) اس دنیوی بطن میں ہم اس لئے رکھے گئے ہیں کہ یہاں کے واقعاتِ قدرت سے روحانی غذا لے کر اپنی شخصیت کی تعمیر کریں۔ یہاں اس نیلے کرۂ ارض پر ایک ابدی وجود کی حیثیت سے ہماری تشکیل کی جارہی ہے:

Here on this Blue Planet, we are being shaped into eternal beings.(p. 9)

اس طرح موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہمارے اندر وہ شخصیت تیار ہوتی ہے جو آخرت میں بسنے کے قابل ہو۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ جب ہمارا ارتقاء مکمل ہو جائے گا تو ایک معیاری روحانی وجود کی حیثیت سے ایک سچی، روحانی دنیا میں ہم دوبارہ جنم لیں گے، اگر ہم اس دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزاریں:

When we are fully developed, we will be "born" into the true world, the spiritual world, as the perfect spiritual beings we will become if we choose to serve Him (p. 9)

یہ بات اصولی طور پر درست ہے مگر یہاں دو باتوں کا اضافہ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس روحانی سفر کے لئے ایک گائڈ بک درکار ہے اور وہ گائڈ بک صرف قرآن ہے۔ قرآن اپنی اصل حالت میں محفوظ رہنے کی وجہ سے اس روحانی سفر کے لئے واحد اور مستند الہامی گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ دنیا کے بعد دوسری جو معیاری دنیا بننے والی ہے اس میں صرف ان افراد کو جگہ ملے گی جو آج کی دنیا میں اپنی روحانی تطہیر کرلیں۔ جو لوگ آج کی غیر معیاری دنیا میں اپنی روحانی تطہیر کرنے میں ناکام رہیں وہ اگلی دنیا میں صرف وہاں کے کوڑے خانہ میں جگہ پائیں گے۔

عالم فطرت میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی صفاتِ کمال کا مظہر ہے۔ یہاں خالق اپنی تخلیقات میں نمایاں ہوا ہے۔ اس طرح فطرت کی دنیا ہمارے لئے خالق کی معرفت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہم خالق کو نہیں دیکھتے مگر ہم اس کی تخلیقات میں اس کے جلوؤں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس طرح فطرت ہمارے لئے خالق فطرت سے قربت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ایک حقیقی انسان فطرت کے اندر خالق کے پڑوس کا تجربہ کرتا ہے، ہواؤں کے جھونکے اس کو لمس خداوندی کا تجربہ کراتے ہیں۔ روشن آفتاب کی صورت میں وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ خلاء کی وسعتیں اس کو خدا کی بے پناہ عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ دریاؤں کی روانی اس کو خدا کی رحمت سے آشنا کرتی ہے۔ فطرت کے بے پناہ حسن میں وہ خالق کے برتر حسن کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چڑیوں کے نغمے میں اس کو چڑیوں کے خالق کی حیات بخش آواز سنائی دیتی ہے۔ دنیا میں بکھرے ہوئے ہر قسم کے سامانِ حیات اس کو یقین دلاتے ہیں کہ اس کا خالق ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے بے خبر نہیں۔ اس طرح موجودہ دنیا میں زندگی کا ہر تجربہ اس کے لئے خالق کے تعارف کے ہم معنیٰ بن جاتا ہے۔

اس طرح کے لطیف تجربات کے درمیان آدمی کی روحانی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ وہ عام انسان سے ترقی کرکے ایک ربانی انسان بنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے وجود کے اندر وہ کامل انسان بن کر تیار ہو جاتا ہے جو خدا کے پڑوس میں رہنے کے قابل ہو ـــــــ اسی خدائی پڑوس کا دوسرا نام جنت ہے۔

آخرت کی یاد

موجودہ دنیا اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ آدمی کے لئے آخرت کی پیشگی یاددہانی بنے۔ دنیا کا ہر نقصان اس لئے ہے کہ آدمی آخرت کو یاد کرے اور یہ کہے کہ خدایا تو آخرت میں میرے نقصان کی تلافی فرما۔ دنیا کا آرام اس لئے ہے کہ آدمی آخرت کو یاد کر کے یہ کہہ سکے کہ خدایا، دنیا کا آرام وقتی ہے، تو مجھے آخرت کے ابدی آرام سے سرفراز فرما۔ دنیا اس لئے نہیں ہے کہ آدمی اس کو اپنا سب کچھ سمجھ لے۔ بلکہ دنیا اس لئے ہے کہ وہ آدمی کے لئے ایک ربانی تجربہ گاہ بن جائے۔ وہ تخلیق کے ہر مشاہدہ میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔ انسانوں کے ساتھ ہر معاملہ اس کے سینہ میں داخل ہو کر روحانی تجربہ میں ڈھل جائے۔ دنیا اس کے لئے ایک ایسی گزرگاہ بن جائے جہاں اس کا ہر قدم اس کو آخرت کی منزل کی طرف لے جا رہا ہو۔

انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں بظاہر آخرت کا کوئی نشان نہیں۔ مگر انسان کو فہم و بصیرت کی طاقت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ محسوس دنیا میں غیر محسوس آخرت کا مشاہدہ کرے۔ دنیا کے تجربات کو وہ آخرت کے تجربات میں تبدیل کرتا رہے۔ دنیا کی تکلیف میں وہ جہنم کا ادراک کرے۔ دنیا کی راحت اس کے لئے جنت کا ابتدائی تعارف بن جائے۔

آخرت کی کامیابی کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی کلمہ کو صحت تلفظ کے ساتھ دہرا دے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ عقیدہ اس کے لئے ذاتی دریافت بن جائے۔ وہ اس کے شعور کی گہرائیوں میں تیر جائے۔ وہ اس کے لئے مشاہدہ اور تجربہ کا درجہ حاصل کر لے۔

اس دنیا میں آدمی کو نہ دکھائی دینے والی حقیقت کو دیکھنا ہے۔ اس کو نہ سنائی دینے والی آوازوں کو سننا ہے۔ اندھیروں میں چھپی ہوئی حقیقت کو غیر مشتبہ یقین کی صورت میں پالینا ہے۔ ایسا ہی انسان وہ انسان ہے جس نے خدا کو پایا اور یہی وہ انسان ہے جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

زندہ قلب

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه انه قال: اُطلُب قَلْبَكَ فی ثَلاثَة مَواطِنَ. عند سماع القرآن وفی مجالس الذّکرِ و فی اوقات الخلوة. فَان لَم تَجِدْہُ فی هٰذه المَواطِنَ فَسَلِ الله أن یَمُنَّ علیك بقلبٍ فإنَهُ لَا قَلْبَ لَكْ.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تم تین مواقع پر اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت اور خدا کے ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے وقتوں میں۔ اگر ان مواقع پر تم اپنے دل کو نہ پاؤ تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تم کو ایک دل دے دے۔ کیوں کہ تمہارے پاس دل موجود نہیں۔

دل آدمی کے جسم میں کیفیت کا سرچشمہ ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بتاتا ہے کہ ایک مومن سے مختلف احوال میں جو قلبی کیفیات مطلوب ہیں، وہ کیا ہیں۔ مثلاً قرآن سننے کے وقت، خدا کی یاد کی مجلسوں میں اور اسی طرح تنہائی کے لمحات میں، یہ تین مواقع وہ ہیں جب کہ دینی اور ربانی کیفیات خصوصی طور پر آدمی کے اندر جاگتی ہیں۔ ان مواقع پر غافل آدمی بھی چونک پڑتا ہے۔ سویا ہوا آدمی بھی جاگ اٹھتا ہے۔ وہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آدمی کا دل اگر زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوگا کہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھا جائے گا تو اس سے اس کو ربانی غذا ملنے لگے گی۔ جب اس کو خدا کی یاد دلائی جائے گی تو اپنے خالق و مالک کے بارہ میں اس کے اندرونی احساسات جاگ اٹھیں گے۔ جب وہ تنہائی میں ہوگا تو اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت ابھر آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پائے گا۔

اگر کسی آدمی کا حال یہ ہوگا کہ یہ خصوصی مواقع بھی اس کی روح میں ہلچل پیدا نہ کریں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر کی کھیتی ویران ہو گئی ہے۔ اس کے اندر فطرت ربانی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو اس حال میں پائے، اس کو چاہئے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے ایک زندہ قلب اور کیفیت سے بھری ہوئی روح کا طالب بنے۔ کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے بغیر کسی انسان پر سعادتوں کا دروازہ کھلنے والا نہیں۔

ایک تأثّر

ایک مجلس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایک مسلمان شاعر نے اپنے نعتیہ کلام سے حاضرین کی تواضع کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک قطعہ پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ احد اور احمد دونوں ایک ہیں۔ یہ صرف "م" کا پردہ ہے جس کی وجہ سے دونوں بظاہر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ جب حشر برپا ہوگا اور حقیقتیں کھلیں گی تو یہ پردہ ہٹ جائے گا، اور پھر دونوں اس طرح ایک جیسے ہو جائیں گے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہوگا۔ ایک شعر یہ تھا:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے　　خدا کون ہے، مصطفیٰ کون ہے

اسی طرح ایک مسلمان مقرر کا یہ حال تھا کہ جب وہ تقریر کرتے تو اپنی تقریر سے پہلے یہ جملہ کہتے: "سب کا خدا خدا ہے، میرا خدا محمد" یہ دونوں شعر غالی بدعتی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جو لوگ بظاہر اس بدعت سے پاک ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ بڑی بدعت میں مبتلا ہیں۔ بدعتیوں نے پیغمبر کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، اور دوسرے مسلمانوں نے اپنے اکابر کو۔ ایک اگر اپنے اس عقیدہ کو زبان قال سے دہرا رہا ہے تو دوسرا زبان حال سے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ خدا پرست نہیں ہیں بلکہ انسان پرست ہیں۔ ان میں سے کوئی پیغمبر کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہے اور کوئی غیر پیغمبر کو۔ کوئی اپنے اکابر کی عظمتوں میں کھویا ہوا ہے۔ کسی کو اپنے رہنماؤں کا قد اتنا بڑا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے آگے خدائی بلندیاں بھی چھوٹی ہوگئی ہیں۔ کسی کا یہ حال ہے کہ اس کو اپنے بزرگ اتنے زیادہ مقدس نظر آتے ہیں کہ ان پر خالص علمی اور دینی تنقید کرنا بھی کفر وفسق سے کم نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے خلاف زبان کھولنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد آدمی کی جان اور مال اور آبرو سب ان کے لئے مباح ہو جائے۔

اگر حقیقت وہی ہو جو قرآن میں بیان کی گئی ہے تو قیامت لوگوں کے تصور سے کتنا زیادہ مختلف ہوگی۔ لوگ کن کن بڑائیوں میں گم ہیں، مگر جب قیامت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی بڑائی حاصل نہ تھی۔ شاعر کا شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ (بین) درست ہے:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے　　کہ تھی بات کیا اور ہم نے سمجھا تھا کیا

سب سے بڑی بھول

ڈک شان (Dick Shawn) ایک امریکی ایکٹر تھا۔ وہ فلم میں اور اسٹیج پر ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ کی رات کو وہ کیلی فورنیا کے مقام لاجولا (La Jolla) میں ایک تھیٹر ہال کے اندر ایکٹنگ کر رہا تھا اور اپنی تفریحی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا۔ ہال کے اندر چھ سو تماشائی بیٹھے ہوئے اس کی تفریحی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔ اس کی ایکٹنگ جاری تھی کہ اچانک وہ اسٹیج پر منھ کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے جو اس نے اپنی ایکٹنگ کے جز کے طور پر کیا ہے:

People thought it was a joke, part of the act.

ایکٹر اسی حال میں چند منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے لڑکے ایڈم (Adam) کو شبہہ ہوا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور فوراً اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس کے ذریعہ اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے جانچ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ڈک شان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کا سبب غالباً دل کا دورہ (Heart attack) تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۵۷ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ اپریل ۱۹۸۷)

اس دنیا میں کوئی شخص روتے ہوئے مرجاتا ہے اور کوئی شخص ہنستے ہوئے۔ کسی پر اس کی موت بدحالی میں آجاتی ہے اور کسی پر خوش حالی میں۔ کوئی خاک پر بیٹھا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی تخت حکومت پر۔ موت ایک ایسا انجام ہے جو ہر ایک پر آتا ہے خواہ وہ ایک حالت میں ہو یا دوسری حالت میں۔

مگر موت ہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے یہاں رونے والا اور ہنسنے والا دونوں ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، وہ اپنے کل کو نہیں جانتے۔ اگر وہ اپنے کل کو جان لیں تو ہنسنے والے کا حال بھی وہی ہو جائے جو رونے والے کا حال نظر آرہا ہے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔

عاجز انسان

جنرل مانکشا (S.H.F.J. Manekshaw) ہندستان کے پہلے فیلڈ مارشل تھے۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۸۶ میں جنرل کیری اپا (K.M. Cariappa) کو ہندستان کے دوسرے فیلڈ مارشل کا اعزازی خطاب دیا گیا ہے۔ ۳۵ سال پہلے وہ ہندستانی فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انھوں نے ہندستانی فوج میں جو خدمات انجام دیں اس کو انگریزی اخبارات نے شاندار فوجی کردار (Illustrious military career) سے تعبیر کیا ہے اور ان کو ملک کے 'قومی ہیروؤں' میں شمار کیا جاتا ہے۔

اِس موقع پر دہلی میں مختلف فوجی تقریبات ہوئیں جن میں جنرل کیری اپا شریک ہوئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ کو نئی دہلی کے پریڈ گراونڈ میں وہ ہندستانی فوج کا معائنہ کر رہے تھے۔ فوجی جوان پُرعظمت انداز میں ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس دوران ۸۶ سالہ فیلڈ مارشل کیری اپا سے ایک اخبار نویس نے ان کا تاثر پوچھا۔ ان کا فوری جواب یہ تھا:

I envy them. I am not young to march with them.

مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ میں جوان نہیں کہ ان کے ساتھ مارچ کر سکوں (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جنوری ۱۹۸۶)

کیسا عجیب ہے زندگی کا تجربہ۔ انسان فوجی کارنامے انجام دیتا ہے۔ وہ فتوحات کرکے اپنے آپ کو قومی ہیروؤں کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کو سب سے بڑا فوجی اعزار دیا جائے اور اس کو فیلڈ مارشل کے پرعظمت خطاب سے نوازا جائے۔ مگر اس وقت انسان اتنا کمزور ہو چکا ہوتا ہے کہ ملنے والے انعام کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی طاقت اسے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ان فوجیوں کے قدم بقدم چلنے سے بھی عاجز ہوتا ہے جن کو ساتھ لے کر اس نے کبھی معرکے سر کیے تھے اور قلعے فتح کیے تھے۔

انسان ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کا عجز اس کو حادثہ اور بڑھاپا اور موت کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے سبق لے۔ آدمی اس سب سے بڑی حقیقت کو سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے۔ وہ صرف اس وقت جاگتا ہے جب کہ خدا کا آخری فیصلہ ظاہر ہو کر اس کو خدا کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ مگر اس وقت کا جاگنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

ہر ایک کی کہانی

ایک بس میوات کے علاقہ سے گزر رہی تھی۔ وہ اسٹینڈ پر رکی تو کچھ مسافر بس کے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھی "میونی" بھی تھی۔ اپنے سر پر گٹھری لیے ہوئے وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں جاکر بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ مذاق کہا: دیکھو، وہ سیٹ خالی ہے۔ وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔ یہ ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ مگر میونی کو ڈرائیور کی سیٹ اور مسافر کی سیٹ کا فرق معلوم نہ تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ آگے بڑھی اور "خالی سیٹ" پر جاکر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی سیٹ پر میونی کو دیکھ کر بولا: عورت، تو یہاں کیسے بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ کر بس چلاؤں گا۔ میونی نے اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا: میں تو جو کھی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

بس کے اعتبار سے دیکھیے، تو یہ صرف ایک جاہل عورت کی کہانی معلوم ہوگی۔ مگر وسیع تر اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں یہی ہر شخص کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانہ حرص اور حبّ دنیا کا زمانہ ہے۔ آج ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی "سیٹ" پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر آدمی دوسرے کی "سیٹ" پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ آدمی صرف وہاں رکتا ہے جہاں حالات نے اس کو رکنے کے لیے مجبور کر دیا ہو، اگر حالات اجازت دیں تو پہلی فرصت میں وہ دوسرے کی سیٹ پر قبضہ کرنے کا عمل شروع کر دے گا۔

خدا کی دنیا میں ہر چیز اپنی حد کے اندر عمل کرتی ہے۔ آسمانی اجسام اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ جنگل کے جانور اپنے فطری دائرہ میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ خدا کی دنیا میں صرف ایک ایسی مخلوق ہے جو حد بندی کو قبول نہیں کرتی۔ یہ انسان ہے۔ انسان بار بار اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ انسان اس چیز پر قابض ہونے کا منصوبہ بناتا ہے جو باعتبار حقیقت اس کی نہیں۔

بوڑھی میونی کا کیس بیوقوفی کا کیس تھا اور دوسرے لوگوں کا کیس سرکشی کا کیس۔ بیوقوفی قابل معافی ہوتی ہے، مگر سرکشی خدا کے قانون کے مطابق قابل معافی نہیں۔

کہاں سے کہاں

مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا ہندستان کے ایک مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ وہ امریکہ میں کلیو لینڈ (Cleveland) کے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۸۹ کو اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۱۳) میں ان کے حالات درج کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مسٹر بہوگنا نے اپنی زندگی میں غیر معمولی سیاسی شہرت حاصل کی، اور آخر میں تقریباً تنہائی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تمام دوست ایک کے بعد ایک انھیں چھوڑتے چلے گیے۔ ان کے سیاسی شریک کار ان سے جدا ہوگیے۔ اور، ۴۵ سالہ سیاسی زندگی کے آخر میں، انھوں نے اپنے آپ کو تنہائی کے بیابان میں پایا:

> One by one, his friends left him, his political allies deserted him and, at the end of a political career spanning 45 years, he found himself in near wilderness. (p. 13)

تبصرہ نگار نے یہاں مسٹر بہوگنا کا جو انجام بتایا ہے، وہی انجام وسیع تر پیمانہ پر ہر شخص کا ہونے والا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی شاندار "۴۵ سالہ" زندگی گزار رہا ہے، صرف اس لیے تاکہ اچانک اس کی شاندار زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور وہ موت کے دروازہ سے گزار کر خدا کی عدالت میں پہونچا دیا جائے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو "۴۵ سال" ملتے ہیں۔ یہ مدت اس لیے نہیں ہے کہ وہ اپنا شاندار سیاسی کیریر بنائے۔ وہ صرف اس لیے ہے کہ آدمی آنے والے مستقبل کی ابتدائی تیاری کرے۔ جو لوگ اپنے "۴۵ سال" کو تیاری کا ابتدائی وقفہ سمجھیں اور اس کے لیے اسے استعمال کریں وہ آنے والے مستقل مرحلہ میں کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے "۴۵ سال" ہی کو سب کچھ سمجھ لیں، ان کا حال اس انسان کا سا ہوگا جو بیج ڈالنے سے پہلے پھل حاصل کرنا چاہے۔ ایسے شخص کے لیے آنے والی دنیا میں ابدی ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

کیسا عجیب ہے انسان کا شاندار حال، اور کیسا غیر شاندار ہے اس کا آخری مستقبل۔

یہ انسان

پھول کی ایک پنکھڑی یا چڑیا کا ایک چھوٹا پر کتنی حسین چیزیں ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بے حد نازک ہیں۔ ان کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش بھی ان کی حسین ترکیب کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا خالق بے حد لطیف ذوق والی ہستی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آدمی اس کے تخلیقی حسن کو دیکھے مگر وہ اس کو ہاتھ نہ لگائے۔ وہ اس سے اپنی روح کی غذا لے مگر اپنے جسم کی کثافت سے اس کو آلودہ نہ کرے۔

خدا کی دنیا میں ایک چیز ایسی ہے جو چڑیا کے پر اور پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک ہے۔ یہ انسان کا دل ہے۔ ہماری معلوم دنیا میں انسان کے دل سے زیادہ نرم و نازک کوئی چیز نہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص کسی انسان کے دل کو دکھاتا ہے وہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم کرتا ہے۔ کسی آرٹسٹ کے نازک ترین آرٹ کو جو شخص اپنے پیروں سے مسل دے وہ اس آرٹسٹ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ وہ شخص اللہ کی نظر میں مجرم ہے جو ایک نازک دل کو مسلتا ہے۔ جو ایک انسان کے سکون پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ جو ایک انسان کے آشیانہ کو اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے۔

اِس معاملہ میں وہ لوگ اس سے کم مجرم نہیں ہیں جو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر وہ "گُونگے شیطان" بنے رہتے ہیں۔ وہ ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے نہیں اٹھتے۔ وہ اپنی ممکن کوشش اس کو دفع کرنے میں نہیں لگاتے۔ پھر اس سے بھی زیادہ بڑے مجرم وہ لوگ ہیں جو ملت کو مظلومی سے نکالنے کے نام پر قیادت کرتے ہیں مگر جب ملت کا ایک مظلوم فرد ان کے سامنے آتا ہے تو اس کو مظلومی سے نکالنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تقریر میں کہتے ہیں کہ ملت کا یہ حال ہونا چاہیے کہ جب ایک ستم زدہ شخص وامعتصماہ پکارے تو ملت اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے اور اس وقت تک کسی کو چین نہ آئے جب تک اس شخص کو ظلم سے نجات حاصل نہ ہو جائے۔ مگر جب ایک ستم زدہ انسان وامعتصماہ کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کی آواز پر دوڑنے کا کوئی جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

دو گروہ

جنت خدا کے نیک بندوں کی رہائش گاہ ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کے دو بڑے طبقے ہوں گے۔ ایک، السابقون (سبقت کرنے والے) اور دوسرے، اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) پہلے گروہ کے لیے آخرت میں شاہانہ انعامات ہیں، اور دوسرے گروہ کے لیے عام انعامات (الواقعہ، رکوع اول)

درجہ اول اور درجہ دوم میں، یہ فرق کس بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کے مطابق، اس کی وجہ فتح (الحدید ۱۰) ہے۔ جو لوگ فتح سے پہلے کے دور میں حق کو مانیں اور اس کا ساتھ دیں وہ السابقون کا درجہ پائیں گے۔ اور جو لوگ فتح کے بعد کے دور میں حق کو قبول کریں اور اس کے ساتھی بنیں وہ اصحاب الیمین کے گروہ میں جگہ دیے جائیں گے۔ یہ محض زمانہ کا فرق نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ اور نوعیتِ ایمان کا یہی فرق دونوں گروہوں کے انجام میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

حق جب ظاہر ہوتا ہے تو ابتداءً وہ مجرد صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی نظری حقیقت کی ہوتی ہے جس کی پشت پر دلائل کی طاقت کے سوا کوئی اور طاقت موجود نہ ہو۔ بعد کے زمانہ میں جب حق کی دعوت فتح وغلبہ کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس وقت حق کی حیثیت صرف عقلی صداقت کی نہیں ہوتی بلکہ اب اس کی حیثیت مرئی واقعہ کی بن جاتی ہے۔ اب ہر آنکھ والے کو وہ ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

پہلے دور میں حق کو لفظی دلیل سے پہچاننا پڑتا تھا، دوسرے دور میں اس کی اہمیت کو منوانے کے لیے کھلے ہوئے واقعات موجود ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں حق کو مانتے ہی آدمی اپنے ماحول کے اندر اجنبی بن جاتا تھا، دوسرے دور میں حق کے ساتھ وابستہ ہونا آدمی کو عزت اور مقبولیت کا مقام دے دیتا ہے۔ پہلے دور میں حق کا ساتھ دینے والا صرف کھوتا تھا، دوسرے دور میں حق کا ساتھ مزید پانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پہلے دور میں بنیاد کے نیچے دفن ہونا پڑتا تھا، دوسرے دور میں گنبد کی بلندیاں مل جاتی ہیں جن کے اوپر آدمی کھڑا ہو سکے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ اول کا مقام ہے اور دوسرے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ ثانی کا مقام۔

معرفتِ حق

موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ہیں جن کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ حج کے لیے جائیں گے اور واپس آکر نہایت والہانہ اور عاشقانہ انداز میں حج کا سفرنامہ لکھ کر شائع کریں گے۔ دوسری طرف انھیں لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ حقارت کا معاملہ کر رہے ہیں۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کے خلاف بے بنیاد الزام گھڑ کر اس کو زبان و قلم کے ذریعہ پھیلا رہے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو بندۂ مومن کی تحقیر کرتے ہیں۔ اور جب حرم مکی اور حرم مدنی کا ذکر ہو تو وہ غایت درجہ تکریم کے الفاظ بولتے ہیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کا عزت و احترام کعبہ کے عزت و احترام سے بھی زیادہ ہے (المؤمن اکرم حرمۃ من الکعبۃ)

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب ان عاشقین مدینہ کی بے بصیرتی ہے۔ وہ حقائق ظاہری کو تو خوب دیکھتے ہیں مگر حقائق معنوی ان کو دکھائی نہیں دیتے۔ ان کو وہ اسلام نظر آتا ہے جو تاریخی عظمت، مادی شوکت اور انسانوں کی بھیڑ کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہو۔ اور جو اسلام ظواہر سے خالی ہو۔ جس کو جاننے کے لیے جوہر شناسی اور معرفتِ باطنی کی صلاحیت درکار ہو۔ اس کے ادراک سے وہ بے بہرہ رہتے ہیں۔

قدیم عرب کے جن لوگوں کو قرآن میں اندھا اور بہرہ بتایا گیا ان کا معاملہ یہی تھا۔ وہ "حرم مکی" کا تو خوب احترام کرتے تھے مگر انھوں نے رسولؐ اور اصحاب رسول کی بے حرمتی کی۔ کیوں کہ "حرم" کی سطح پر جو دین تھا اس میں ان کو تاریخی عظمتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے برعکس رسول اور اصحابِ رسول کا دین ابھی تاریخی عظمتوں اور مادی شوکتوں سے خالی تھا۔ اس وقت رسول والے دین کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے جوہر شناسی کی صلاحیت درکار تھی جس سے وہ محروم تھے۔ چنانچہ انھیں اندھا اور بہرا قرار دے دیا گیا۔

ایمان معرفت حق کا نام ہے۔ مومن وہ جوہر شناس انسان ہے جو سچائی کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھے، جو ظواہر سے بلند ہو کر حقائق کو دریافت کر لے۔

ایک غلطی

ایک انگریزی میگزین میں ایک لطیفہ نظر سے گزرا۔ پال نام کا ایک بچہ اپنے باپ کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اس نے مختلف قسم کے جانور دیکھے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے لیے ایک جانور خرید دیجیے۔ باپ نے کہا کہ اس کا کھانا ہم کہاں سے لائیں گے۔ بچہ نے جواب دیا کہ ان جانوروں میں سے ایک خرید دیجیے جن کے پنجرہ پر لکھا ہوا تھا کہ کھلانا نہیں ہے:

Paul went to the zoo with his father, "Buy an animal for me," he begged. "Where would we get his food ? asked the father. The boy replied, "Buy one of those where it says on the cage : 'No feeding.'

بچہ کی غلطی کیا تھی۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ پنجرہ کے بورڈ پر جو بات زائرین کی نسبت سے لکھی ہوئی تھی، اس نے اس کو خود جانوروں کی نسبت سے سمجھ لیا۔ اس واقعہ میں یہ ایک نادان بچہ کا کلمہ تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑے بڑے لوگ بھی اسی نادانی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

۳۰ سال پہلے ایک مسلم دانشور نے "اسلامی اشتراکیت" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ اس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ ان الارض للّٰہ (زمین اللہ کی ہے) انھوں نے لکھا کہ زمین اللہ کی ہے، پھر وہ کسی انسان کی ملکیت کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ دلیل مذکورہ قسم کی نادانی پر قائم تھی۔ اللہ کے مقابلہ میں بلا شبہ زمین کا کوئی مالک نہیں ہو سکتا۔ مگر انسان اور انسان کے مقابلہ میں ہر ایک کے مالکانہ حقوق ہیں جو خود شریعتِ الٰہی نے مقرر کیے ہیں۔ آیت میں جو بات خدا کی نسبت سے تھی اس کو مسلم دانشور نے انسان کی نسبت سے سمجھ لیا۔

یہ غلطی بہت زیادہ عام ہے۔ موجودہ دنیا میں بیشتر غلطیاں اور گمراہیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ ایک بات جس پہلو سے کہی گئی ہے اس کو وہاں سے ہٹا کر کسی اور پہلو سے جوڑ لیا جاتا ہے۔ اگر بات کو اس کے اصل مدعا پر رکھ کر اسے سمجھا جائے تو اکثر غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی جڑ کٹ جائے۔

ہر بات کسی خاص مفہوم میں کہی جاتی ہے۔ اگر بات کو اس کے مخصوص مفہوم سے الگ کر دیا جائے تو بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ خدا اور رسول کا کلام بھی۔

شکر نہیں

محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۹۳۶-۱۸۷۵) نے لکھا ہے : " چند سال پہلے انگلستان کے اخباروں میں ایک بحث چلی تھی۔ یہ کہ اگر کوئی حسین اور مشہور اور نادر یونانی مجسمہ کسی کمرہ میں ایک زندہ انسانی بچہ کے ساتھ ہو اور اچانک اس کمرہ میں آگ پھیل جائے۔ اب اگر ایسی صورت حال ہو کہ ان دونوں میں سے صرف کسی ایک کو بچایا جانا ممکن ہو تو دونوں میں سے کس کو بچایا جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بہت سے مشہور اور قابل حضرات نے اس وقت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایسی حالت میں مجسمہ کو بچانا چاہیے اور بچہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ان حضرات کی دلیل یہ تھی کہ بچے تو ہزاروں کی تعداد میں ہر روز پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر قدیم یونانی آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ دوبارہ وجود میں نہیں لایا جاسکتا :

M. M. Pickthal, The Cultural Side of Islam, p.p. 3-4

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں کے بارہ میں انسان کے اندر شکر کا جذبہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ خدا کی نعمتیں انسان کو بے حساب مقدار میں اور ہر آن پہونچتی رہتی ہیں۔ نعمتوں کا بہت زیادہ ہونا اس کے انوکھے پن کو کھو دیتا ہے اور بہت کم آدمی اپنے اندر شکر کا احساس پیدا کر پاتے ہیں (وقلیل من عبادی الشکور)

انسان کا ایک بچہ ایک حیرت ناک معجزہ ہے۔ وہ آرٹ کے تمام انسانی نمونوں سے بے حساب گنا زیادہ قیمتی ہے۔ مگر آرٹ کے اعلیٰ نمونے چند ہیں، جب کہ انسانی بچے مسلسل کروروں کی تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انسانی آرٹ کی یہی ندرت اور انسانی بچوں کی یہی عمومیت ہے جس نے انسانی آرٹ کے بارہ میں لوگوں کے اندر استعجاب (awe) کے احساس کو جگایا، مگر ان کے اندر خدا کے پیدا کیے ہوئے بچوں کے بارہ میں اس احساس کو نہیں جگایا۔

سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر کرے۔ اس کے اندر شکر کے سمندر کا سیلاب امڈ آئے۔ مگر شیطان مختلف طریقوں سے چاہتا ہے کہ انسان کو اس افضل ترین عبادت سے ہٹا دے۔

اس دنیا میں جو شخص اللہ کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہے، اس کو شیطان کے فتنوں کو پہچاننا ہوگا۔ ورنہ وہ شکر گزاری کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

شعوری ایمان

قاضی مجتبیٰ حسن زنجانی (پیدائش ۱۹۱۵) حکومتِ ہند میں جوائنٹ چیف کنٹرولر امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ تھے۔ ۱۴ فروری ۱۹۸۳ کی ملاقات میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ بتایا۔

۱۹۳۵ میں جب کہ الہ آباد میں وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے اصغر گونڈوی بھی وہاں مقیم تھے۔ اصغر صاحب اس وقت ہندوستانی اکیڈمی کے "تماہی رسالہ" کے مدیر تھے۔ جناب زنجانی صاحب اور ان کے کچھ نوجوان ساتھی ایک روز اصغر گونڈوی سے ملنے کیلئے گئے۔ وہاں مجلس میں ایک اور صاحب موجود تھے جو ان طلبہ کے آزادانہ خیالات سے واقف تھے۔ انہوں نے اصغر گونڈوی سے کہا۔

"حضرت یہ لڑکے انگریزی پڑھ کر دہریے ہو گئے ہیں"۔

اصغر گونڈوی یہ سن کر فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ "ان کو دہریہ نہ کہو" انہوں نے کہا۔ "یہ ابھی لَا اِلٰہ کی منزل میں ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اِلَّا اللہ کی منزل میں پہنچیں گے تو وہ تم سے اچھے مسلمان ہونگے"۔

اصغر گونڈوی کے اس جملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ایک واقعہ کے تاریک پہلو کو لینے کے بجائے اس کے روشن پہلو کو لیا۔ خدا اور مذہب کے بارہ میں ایک آدمی کے تشکیکی خیالات کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر خدا و مذہب کا منکر ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہاں دوسرا امکان بھی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی تلاش کے مرحلہ میں ہو۔ اصغر گونڈوی نے نوجوانوں کی "دہریت" کو انکار کے معنی میں لینے کے بجائے اس کو تلاش کے معنی میں لیا۔

اس کے اندر ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ "تلاش" کے مرحلہ سے گذر کر جو شخص "یافت" کے مرحلہ تک پہنچتا ہے" اُس کا ایمان بے حد پختہ ہوتا ہے۔ جو آدمی شعوری طور پر "نہیں" کا انکار کرے اور شعوری طور پر "ہے" کو اختیار کرے اس کے ایمان میں جوش اور یقین اور زندگی ہوتی ہے۔ اس کا ایمان ان لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے جنہوں نے "نہیں" کا تجربہ نہیں کیا۔ جن کو نسلی اور روایتی طور پر ایک عقیدہ مل گیا اور وہ اس سے مانوس ہو کر اس سے وابستہ ہو گئے۔

روایتی ایمان ایک آبائی تقلید ہوتا ہے۔ اور شعوری ایمان ایک ذاتی دریافت۔ اوّل الذکر ایمان آدمی کی زندگی کا بس ایک ضمیمہ ہوتا ہے۔ جبکہ ثانی الذکر ایمان اس کے وجود میں خون اور حرارت بن کر داخل ہو جاتا ہے۔ ایک اگر بے روح ایمان ہے تو دوسرا حقیقی معنوں میں زندہ ایمان۔

روحِ دین

ایک سفر کے دوران مجھے ایک ایسے ملک میں جانا پڑا جہاں پہلے بادشاہی نظام تھا۔ اب بادشاہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہاں صدر راج قائم ہے۔ قدیم شاہی محل کی تمام شان وشوکت باقی ہے۔ البتہ اب اس کو شاہی محل کے بجائے صدارتی محل کہا جاتا ہے۔

میں اور کانفرنس کے دوسرے شرکا، صدر مملکت سے ملاقات کے لیے صدارتی محل میں لے جائے گئے۔ ہم لوگ جب اس پُر ہیبت عمارت میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہر آدمی کا انداز اچانک بدل گیا ہے۔ لوگوں پر خاموشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ محل کی ہر چیز کو وہ پُر رعب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی خدا کا ایک عظیم محل ہے۔ اس میں ہر طرف خدا کی عظمت وقدرت کے جلوے نمایاں ہیں۔ اس خدائی محل کے اندر چلتے ہوئے مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر وہ کیفیت طاری ہونا چاہیے جو کسی شاہی محل کے اندر چلتے ہوئے اس کے اندر طاری ہوتی ہے۔

مگر جب میں دنیا کے راستوں میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کر کے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہاں لوگ اس طرح چل رہے ہیں گویا کہ انھیں اس عظیم حقیقت کی کوئی خبر ہی نہیں۔ لوگوں کے چہروں پر خشوع جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا جو از روئے واقعہ ان کے چہروں پر جھلکنا چاہیے۔

لوگوں کے چہروں پر مجھے احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال تواضع کے بجائے سرکشی کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بے حسی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا سنجیدہ بھی نظر نہیں آتے جتنا کوئی شخص کسی ایوان صدارت یا کسی قصر شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ انسانی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہو مگر خدائی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے آج ہی دور ہو گئے۔

جنّت کی نعمتیں

اُکَیدر بن عبدالملک الکندی (م ۱۲ھ) دومۃ الجندل کا عیسائی حاکم تھا۔ غزوہ تبوک (۹ ھ) میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے مقام کے قریب پہونچے تو وہ آکر آپ سے ملا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد وہ پھر گیا۔ خلیفہ اول کے زمانہ میں حضرت خالد بن الولید رضؓ نے اس سے جنگ کی جس میں وہ مارا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ اُکیدر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آیا تو اس کے جسم پر نہایت شاندار لباس تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں :

رأيت قباء أكيدر حين قدم به على رسول الله صلى الله عليه وسلم فجعل المسلمون يلمسونه بأيديهم ويتعجبون منه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أتعجبون من هذا، فوالذي نفسي بيده لمناديل سعد بن معاذ في الجنة احسن من هذا۔

(البداية والنهاية ۵/ ۱۷)

میں نے اکیدر کی قبا اس وقت دیکھی ہے جب کہ وہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ مسلمان اس کی قبا کو اپنے ہاتھ سے چھونے لگے اور اس پر تعجب کرنے لگے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم لوگ اس پر تعجب کر رہے ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بلاشبہ جنّت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔

جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ابدی ہے اسی طرح آپ کا یہ کلام بھی ابدی ہے۔ آپ کا یہ قول صرف پہلی صدی ہجری کے ایک خوش پوش انسان کے بارے میں نہیں ہے بلکہ قیامت تک کی ان تمام دنیوی چیزوں کے بارہ میں ہے جن کی ظاہری رونق پر لوگ تعجب کریں اور جن کو دیکھنے والے رشک کی نظروں سے انھیں دیکھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی جو چیزیں لوگوں کو آج بہت خوش نما نظر آتی ہیں، جنّت کی چیزیں ان کے مقابلہ میں بے حساب گُنا زیادہ خوش نما اور پُر راحت ہوں گی۔ اس وقت آدمی کو محسوس ہوگا کہ جو کچھ اس نے کھویا وہ کچھ بھی نہ تھا، جب کہ اس نے جو کچھ پایا ہے وہ سب کچھ سے بھی بہت زیادہ ہے

خوش خبری

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب امر حق کا اعلان کیا تو آپ کو وہاں کے لوگوں کی طرف سے سخت اذیت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

آپ کی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد فوراً ہی آپ پر ایمان لے آئیں۔ اب تک وہ آپ کی زندگی میں شریک تھیں، اب وہ آپ کی مصیبتوں میں شریک ہوگئیں۔ مخالفین آپ کے گرد جمع ہو کر شور مچاتے طرح طرح سے آپ کو ستانے کی تدبیریں کرتے۔

یہی حالات تھے کہ ایک روز خدا کے فرشتہ جبریل آپ کے گھر آئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ خدیجہ کو ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد جبریل نے کہا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدیجہ کو ایک ایسے گھر کی خوش خبری دے دوں جو موتیوں کا ہے، وہاں نہ شور ہے اور نہ تکلیف (اُمِرتُ اَنْ اُبَشِّرَ خَدِیجَۃَ بِبَیْتٍ مِن قَصَبٍ لَاصَخَبَ فِیہِ وَلَانَصَبَ) سیرۃ ابن ہشام ۲۵۹/۱

یہ حضرت خدیجہ کے لیے بشارت ہے اور عام اہل ایمان کے لیے نصیحت۔ خدیجہ کے لیے وہ کامیابی کی پیشگی خبر تھی اور دوسروں کے لیے وہ کامیابی کی طرف رہ نمائی۔

مومن کو موجودہ دنیا میں سرکش انسانوں کی طرف سے اذیتیں پیش آتی ہیں۔ ان کا شور اور ان کے اشتعال انگیز الفاظ سننے پڑتے ہیں۔ ایسے موقع پر مومن کو یہ نہیں کرنا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے لڑنے لگے۔ اس کے برعکس مومن کو چاہیے کہ وہ ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ آخرت کی طرف موڑ دے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ خدایا، مجھے ان ناخوش گواریوں پر صبر کی توفیق دے اور میرے لیے جنت میں ایک ایسا گھر بنا دے جہاں نہ کوئی تکلیف ہو اور نہ کسی قسم کا شور وغل۔

دنیا میں ایک آدمی خدا پرستی کا پیغام لے کر کھڑا ہو، اور انسان پرست لوگ اس سے بگڑ کر اس کے خلاف شور وغل کریں۔ وہ اللہ کے لیے عمل کرنے کی طرف پکارے مگر لوگ اس کو ستانے اور پریشان کرنے کے درپے ہو جائیں۔ ان سب کے باوجود وہ صبر کرے تو ایسے شخص کے لیے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کو اگلی دنیا میں قیام کرنے کے لیے ایسا نفیس ماحول دے گا جہاں وہ ابدی طور پر شور اور تکلیف دونوں سے محفوظ رہ کر پُر راحت زندگی گزار سکے۔

آگ سے بچاؤ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہونچے تو وہاں آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد بنائی جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں آپ نے جو پہلا جمعہ پڑھا، اس میں آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

اے لوگو، اپنے لیے کچھ آگے بھیجو۔ جان لو کہ خدا کی قسم تم میں سے ہر شخص موت کا نشانہ بنے گا۔ پھر وہ اپنی بکریوں کو اس حال میں چھوڑ کر چلائے گا کہ ان کا کوئی چرواہہ نہ ہوگا۔ پھر اس کا رب اس سے کلام کرے گا اور وہاں کوئی ترجمان نہ ہوگا۔ اور نہ درمیان میں کوئی پردہ ہوگا۔ وہ فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا جس نے تم کو میرا پیغام پہونچایا۔ اور میں نے تم کو مال دیا اور تمہارے اوپر اپنا فضل کیا۔ پھر تم نے اپنے آگے کے لیے کیا بھیجا۔ بندہ اپنے دائیں اور بائیں دیکھے گا۔ مگر وہ کچھ نہ پائے گا۔ پھر وہ اپنے سامنے دیکھے گا۔ تو وہاں جہنّم کے سوا اور کچھ نہ دیکھے گا۔ پس جو شخص اپنا چہرہ آگ سے بچا سکے وہ بچائے، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (البدایۃ والنہایۃ، ۲۱۴/۳)

آدمی کے اندر موت اور قیامت کے مسٔلہ کا شدید احساس پیدا ہو جائے تو وہ چاہنے لگتا ہے کہ جو بھی قیمت وہ دے سکتا ہے، اس کو دے کر وہ اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچائے۔

رات کے وقت وہ بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ آخرت کے مسٔلہ کو سوچ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اٹھ کر وضو کرتا ہے اور نماز کے لیے کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ خدایا، میری اس نماز کو میری طرف سے قبول کر لے اور مجھے آگ کے عذاب سے بچا لے۔ وہ ایک شخص کو مصیبت میں دیکھتا ہے، وہ اپنی محنت کی کمائی کا ایک حصّہ اس کو دیتا ہے اور اس کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، آج میں نے جس طرح اس کی مدد کی ہے، تو آنے والے سخت تر دن میں میری مدد فرما۔ ایک حق اس کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی پوزیشن کا خیال کیے بغیر اس کا اعتراف کر لیتا ہے اور آنسوؤں کی زبان سے کہتا ہے کہ خدایا، مجھے اپنے ان بندوں میں لکھ لے جنھوں نے دیکھے بغیر تیرا اعتراف کیا۔

ہر عمل "کھجور کا ایک ٹکڑا" ہے، اور جس آدمی کے پاس جو ٹکڑا ہے، اس کو چاہیے کہ اسی ٹکڑے کو وہ اپنی نجات کے لیے پیش کرے۔

رہبانیت

ثم قفینا علیٰ آثارھم برسلنا وقفینا بعیسیٰ ابن مریم وآتیناہ الانجیل وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رأفۃ ورحمۃ ورھبانیۃ نِ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا

(الحدید ۲۷)

پھر ہم نے ان کے نقشِ قدم پر اپنے رسول بھیجے اور انھیں کے نقشِ قدم پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت رکھ دی۔ اور رہبانیت کو مسیحیوں نے خود نکالا، ہم نے اس کو ان پر نہیں لکھا تھا۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی رضا چاہنا فرض کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

اس آیت میں رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ آدمی خدا کے نام پر دنیا کو چھوڑ دے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات وہی تھیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ مگر حضرت مسیح کے دو سو سال بعد ان کے پیرووں میں بگاڑ آ گیا۔ ان کا ایک طبقہ رہبانیت میں پڑ گیا۔ وہ لوگ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گیے اور دنیوی چیزوں سے بے تعلق ہو کر شدید قسم کی مشقت برداشت کرنے لگے۔ (تفصیل کے لیے انسائیکلو برٹانیکا، جلد ۱۲، مقالہ: (Monasiticism)

ان کا یہ ترکِ دنیا مذہب کے معاملہ میں غلو اور تشدد سے پیدا ہوا۔ ان کو زہد کی تعلیم دی گئی تھی جس کا مطلب نفسیاتی زہد تھا۔ مگر انھوں نے نفسیاتی زہد کے حکم کو جسمانی زہد کا حکم قرار دے لیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں مشغول ہو مگر دنیا کو مطلوب و مقصود نہ بناؤ۔ مگر انھوں نے مطلوبیتِ دنیا کی نفی کو مشغولیتِ دنیا کی نفی کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی ہے حکمِ خداوندی کی صحیح رعایت نہ کرنا۔

مومن انسانوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے مگر اس کی توجہ خدا کی طرف لگی رہتی ہے۔ وہ بظاہر مادی کام میں مشغول دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کا ذہن روحانی سطح پر سرگرم رہتا ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو آخرت میں بسیرا لیے ہوئے ہو۔

موت

موت کیا ہے ، موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ ہے ۔ موت " اپنی دنیا " سے نکل کر " دوسرے کی دنیا " میں جانا ہے ۔ کیسا چونکا دینے والا ہے یہ واقعہ ۔ مگر انسان کی یہ غفلت کیسی عجیب ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے ، پھر بھی وہ نہیں چونکتا ۔ حالاں کہ ہر مرنے والا زبان حال سے دوسروں کو بتا رہا ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزرا یہی تمہارے اوپر بھی گزرنے والا ہے ۔

آدمی پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ کامل بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے فرشتوں کے حوالہ کر دے ۔ موت کا واقعہ ہر آدمی کو اسی آنے والے دن کی یاد دلاتا ہے ۔

موت کا حملہ سراسر یک طرفہ حملہ ہے ۔ یہ طاقت اور بے طاقتی کا مقابلہ ہے ۔ اس میں انسان کے بس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کامل عجز کے ساتھ فریق ثانی کے فیصلہ پر راضی ہو جائے ۔ وہ یک طرفہ طور پر شکست کو قبول کرلے ۔

موت انسانی زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدّ فاصل ہے ۔ موت آدمی کو موجودہ دنیا سے اگلی دنیا کی طرف لے جاتی ہے ۔ یہ اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے ۔ یہ امتحان کے بعد اس کا انجام پانے کے دور میں داخل ہونا ہے ۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وہ معقولیت کے آگے جھکنے پر راضی نہیں ہوتا ۔ موت اس لیے آتی ہے کہ اس کو بے یار و مددگار کرکے حق کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے ۔ جس صداقت کو اس نے باعزت طور پر قبول نہیں کیا تھا اس کو وہ بے عزّت ہو کر قبول کرے ۔ جس حق کے آگے وہ اپنے ارادہ سے نہیں جھکا تھا ۔ اس حق کے آگے مجبورانہ طور پر جھکے اور اس کی تردید کے لیے کچھ بھی نہ کرسکے ۔

انسان آج حق کی تائید میں چند الفاظ بولنا گوارا نہیں کرتا ، جب موت آئے گی تو وہ چاہے گا کہ ڈکشنری کے سارے الفاظ حق کی موافقت میں استعمال کر ڈالے ، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے الفاظ کو سنے ۔ انسان آج ڈھٹائی کرتا ہے ، موت جب اس کو پچھاڑے گی تو وہ سراپا عجز و نیاز بن جائے گا ، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے عجز و نیاز کی قدردانی کرے ۔

اہلِ جنّت

جنت خدا کی انتہائی بامعنی تخلیق ہے۔ جنت ان قیمتی انسانوں کو دی جائے گی جو دنیا میں خدا کے سچے بندے بن کر رہے ہوں۔ جو لوگ دار الامتحان میں اعلیٰ زندگی گزاریں وہی دار الجزاء میں اعلیٰ قیام گاہ کے مستحق ٹھہریں گے۔

جنت اس نادر انسان کے لیے ہے جو غیب کی سطح پر حقیقت کا ادراک کرے۔ جو مفادات اور اعزازات سے بلند ہو کر زندگی گزارے۔ جو نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھے۔ جو کھونے میں پانے کا راز دریافت کرے۔ جو ظاہر سے گزر کر باطن کو دیکھ سکے۔ جو اُنا رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے اُنا بنا لے۔

لوگ تعریف میں خوش ہوتے ہیں، جنت والا آدمی تنقید کا استقبال کرتا ہے۔ لوگوں کو اونچے مقام پر بیٹھنے میں لذت ملتی ہے، جنت والا آدمی اپنے آپ کو نیچے بٹھا کر سکون محسوس کرتا ہے۔ لوگ چیزوں کو مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، جنت والا آدمی ہر چیز کو اصول کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لوگ اپنے کو نمایاں کرنے کے شائق ہوتے ہیں، جنت والا یہ چاہتا ہے کہ اپنے کو گمنامی کے گوشے میں چھپا لے۔

لوگ دوسروں کا احتساب کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، جنت والا انسان اپنے احتساب کے لیے فکرمند رہتا ہے۔ لوگ دوسروں کی غلطی بتانے میں مہارت دکھاتے ہیں، جنت والا انسان اپنی غلطیوں کی تلاش میں گم رہتا ہے۔ لوگ ظاہری رونقوں میں جیتے ہیں، جنت والا انسان اندرونی حقائق کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے۔

لوگوں کی دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ وہ بولیں، جنت والا انسان چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ چپ رہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے کارناموں سے واقف ہو، جنت والا انسان چاہتا ہے کہ اس کا ہر کام دنیا کی نظر سے چھپا رہے، لوگ "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم" کے احساس میں جیتے ہیں، جنت والا انسان اس احساس سے تڑپ اٹھتا ہے کہ میں تو کوئی ایسا کام نہ کر سکا جس کو میں رب العالمین کے سامنے پیش کر سکوں۔

اہلِ جنت کا کردار جنتی کردار ہوتا ہے، اہلِ جہنم کا کردار جہنمی کردار۔

رضوانُ اللہ، رضوانُ العباد

قرآن وحدیث میں بار بار مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ آخرت کے اعتبار سے صرف اس عمل کی قیمت ہے جس میں ابتغاء رضوان اللہ (الحدید ۲۷) کی روح پائی جاتی ہو۔ جو عمل اس روح سے خالی ہو وہ آخرت کی میزان میں کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی انسان کے صرف ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے بارہ میں فیصلہ نہیں کرتا۔ وہ اس کی قلبی حالت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرتا ہے جس کو شریعت میں نیت کہا گیا ہے۔ اس پہلو سے تمام انسانی اعمال کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو رضوان اللہ (اللہ کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ دوسرا وہ جو رضوان العباد (بندوں کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، اس کا رخ ہمیشہ اللہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر معاملہ میں اللہ کی پسند اور ناپسند کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنا رویہ ہمیشہ اصولِ حق کی بنیاد پر متعین کرتا ہے۔ وہ وہی بات بولتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور اسی سمت میں چلتا ہے جدھر اللہ نے چلنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنی اس روش پر قائم رہتا ہے، خواہ تمام انسان اس کے مخالف ہو جائیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں وہ خود اپنے لوگوں سے کٹ جائے۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہوتا ہے جو رضوان العباد کا طالب بنا ہوا ہو۔ اس کی توجہ کا مرکز اللہ کے بجائے انسان بن جاتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی قوم، اپنے حلقہ، اپنی پارٹی اور اپنے دنیوی سرپرستوں کی طرف دیکھتا ہے، وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جو اِن انسانوں کو پسند ہوں، وہ ایسے عمل کرتا ہے جو اِن انسانوں کے درمیان اس کو مقبول بنانے والے ہوں۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، وہ اللہ کے معاملہ میں آخری حد تک حساس ہوتا ہے۔ وہ ہر دوسرے پہلو کو نظر انداز کر سکتا ہے مگر اللہ والے پہلو کو نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو لوگ رضوان العباد کے طالب ہوں، وہ انسانوں کے بارہ میں سب سے زیادہ حساس بن جاتے ہیں وہ انسانوں کا اس طرح لحاظ کرنے لگتے ہیں جس طرح خدا کا لحاظ کرنا چاہیے۔

اوّل الذکر لوگوں کا مقام جنّت ہے اور ثانی الذکر لوگوں کا مقام جہنّم۔

ایک تاثّر

جنّت خدا کے محبوب بندوں کی دنیا ہے اور جہنم خدا کے مبغوض بندوں کی دنیا۔ جنت خدا کے انعام یافتہ لوگوں کی بستی ہے اور جہنم خدا کے سزا یافتہ لوگوں کی بستی۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کا اعتراف کریں، جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو سچّائی کی آواز سنیں اور اس کو نظر انداز کر دیں۔ مگر آج وہ روح کہیں نظر نہیں آتی جس کو اعتراف میں لذت ملے۔ ہر آدمی بے اعترافی کی شاخ پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ہر قسم کی ظاہری عظمتوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائیں۔ اور خالص عظمتِ خداوندی میں جینے والے بن جائیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدائی عظمتوں میں جئیں۔ مگر آج کا انسان غیر خدائی عظمتوں میں گم ہے۔ خدائی عظمت میں جینے والا انسان ڈھونڈنے پر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو آخرت کے لیے متحرک ہوں، اور جہنم ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی خاطر حرکت میں آئیں۔ مگر آج لوگوں کا یہ حال ہے کہ صرف دنیا کا مفاد انھیں متحرک کرتا ہے آخرت کا مفاد انھیں متحرک کرنے والا نہیں بنتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جن کا یہ حال ہو کہ خدا و رسول کے حکم کا ایک حوالہ انھیں جھکنے پر مجبور کر دے۔ اور جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا و رسول کے حکم پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ مگر آج یہ حال ہے کہ انسان کے نزدیک خدا اور رسول کے حکم کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ اس کی شخصی یا قومی خواہشیں ہیں۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ربّانی اخلاقیات میں جئیں۔ جنھیں سچ بولنے میں لذت ملے، جن کی روح حق کی ادائیگی میں تسکین پائے۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو جھوٹ میں لذّت پائیں، جو ناانصافی کو اپنی غذا بنائے ہوئے ہوں۔

جہنّم کے دروازہ پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، اور جنّت کی طرف جانے والا راستہ بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ غیر خدائی منظر جو آج خدا کی دنیا میں ہر طرف نظر آتا ہے۔

منصوبۂ تخلیق

قرآن گویا خدا کے تخلیقی منصوبہ کا اعلان ہے۔ قرآن کے ذریعہ خالق نے تمام انسانوں کو بتایا ہے کہ وہ کس خاص منصوبہ کے تحت زمین پر پیدا کیے گئے ہیں۔ اور فکر و عمل کا وہ کون سا طریقہ ہے جس کو انھیں اپنی کامیابی کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ یہ منصوبہ قرآن میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک آیت یہ ہے: اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ عزیز و غفور ہے (الملک ۲)

قرآن کے اس بیان کے مطابق، تخلیق کا کلیدی نکتہ ابتلاء (امتحان) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت اعلیٰ اور معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔ یہ جنت ابدی راحت اور ابدی سرفرازی کی جگہ ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی اس جنت میں داخلہ کا ایک امتحانی مرحلہ ہے۔ جو آدمی یہاں کا مقرر امتحان پاس کرلے اس کے لیے موت کے بعد ابدی جنتوں کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

یہ امتحان کس بات کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیب میں رہتے ہوئے آدمی اپنے خدا کو پہچانے اور اپنے دل و دماغ میں اس کو سب سے اونچی جگہ دے۔ وہ اپنے قول و عمل پر خود اپنے فیصلہ سے خدا کی لگام لگائے۔ بظاہر بااختیار رہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں بے اختیار بنالے۔ وہ خدا کی اس تقسیم پر راضی ہو جائے کہ موجودہ دنیا اس کے لیے ذمہ داریاں ادا کرنے کی جگہ ہے، اور آخرت کی دنیا حقوق اور انعام حاصل کرنے کی جگہ۔

جنت میں داخلہ کا ٹکٹ اس انسان کو دیا جائے گا جو جنت کو دیکھے بغیر جنت کی معرفت حاصل کرلے۔ وہ آخرت کی نعمتوں کی خاطر دنیا کی نعمتوں سے بے رغبت ہو جائے۔ وہ آزادی رکھتے ہوئے اپنے آپ کو پابند بنالے۔ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کو دبائے اور اپنی ضمیر کی آواز کو اپنا رہنما بنائے۔ وہ بے اصولی کی زندگی کو چھوڑ کر ایک بااصول انسان جیسی زندگی اختیار کرے۔

جو لوگ اس امتحان میں پورے اتریں ان کے لیے خدا کے ابدی انعامات ہیں۔ اور جو لوگ اس میں پورے نہ اتریں ان کے لیے خدا کے یہاں نہ رحمت ہے اور نہ انعام۔

توبہ کا کرشمہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ــــــ مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (الفرقان ۷۰)

سیئات کا حسنات بن جانا کوئی پُراسرار واقعہ نہیں، یہ ایک معلوم نفسیاتی حقیقت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو، اس سے جب برائی کا کوئی فعل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کا ضمیر نہایت شدت کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ اس کی روح آخری حد تک تڑپ اٹھتی ہے۔ اس طرح اس کی برائی اس کے لیے بھلائی کا محرک بن جاتی ہے۔ ماضی کی غلطی کو نہ دہرانے کا احساس اس کے مستقبل کو شاندار طور پر درست کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس نفسیاتی معاملہ کی ایک نہایت واضح مثال حضرت عمر بن عبد العزیز رح کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔

۹۳ھ میں عمر بن عبد العزیز اموی حکومت کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ ان کو دمشق سے خلیفہ الولید کی یہ تحریری ہدایت ملی کہ خُبیب بن عبد اللہ بن الزبیر کو پچاس کوڑے مارو اور سخت جاڑے کے موسم میں ان کے سر پر ٹھنڈا پانی بہاؤ اور ان کو مسجد کے دروازہ پر کھڑا کر دو۔ عمر بن عبد العزیز نے اس حکم پر عمل کیا۔ اسی دن خُبیب کا انتقال ہو گیا۔ خبیب کی موت کے بعد عمر بن عبد العزیز کو خوف خدا کا شدید احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ اپنے کو غیر مامون سمجھنے لگے۔ ان کا حال یہ ہو گیا کہ اگر ان کو ان کے کسی کار خیر پر آخرت کے انعام کی بشارت دی جاتی تو وہ کہہ اٹھتے کہ کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے جب کہ خبیب میرے راستہ میں ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق وہ کہتے کہ ایسا تو جب ہو گا جب کہ خبیب میرے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ پھر وہ اس عورت کی طرح چیخ پڑتے جس کا بچہ گم ہو گیا ہو۔ جب ان کی تعریف کی جاتی تو وہ کہتے کہ اگر میں خبیب سے بچ گیا تو میں بھلائی پر ہوں۔ اس واقعہ کے بعد وہ آخر عمر تک غم اور خوف میں مبتلا رہے۔ انھوں نے عبادت اور گریہ وزاری کی انتہا کر دی۔ (البدایہ والنہایہ ۹/۸۷)

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ ان کی طرف سے ایک لغزش تھی۔ مگر اس کے سبب سے ان کو بہت بھلائی ملی۔ یعنی عبادت اور گریہ وزاری اور غم اور خوف اور احسان اور عدل اور صدقہ اور نیکی اور غلاموں کو آزاد کرنا، وغیرہ۔

جنّت کا ٹکٹ

مغربی دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ انھوں نے کہا: مجھ کو تو جنّت کا ٹکٹ چاہیے، مجھ کو آپ صرف یہ بتائیے کہ جنّت کا ٹکٹ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ جنت کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ یہ جنتی ٹکٹ کا معاملہ نہیں، یہ جنتی شخصیت کا معاملہ ہے۔ آخرت کی قیمتی جنت اس آدمی کو ملے گی جس نے اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ جنت میں داخلہ کسی کو "ٹکٹ" کے ذریعہ نہیں ملے گا۔ جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے، اپنے وجود کی قیمت دے کر ہی کوئی شخص جنت کی دنیا میں اپنے لیے داخلہ پا سکتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت تزکیہ کرنے والوں کے لیے ہے (ذٰلک جزاء من تزکّیٰ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ آدمی مزکّیٰ شخصیت لے کر وہاں پہنچا ہو۔ یعنی وہ ایک ایسا انسان ہو جس کے اندر پاک روح بسی ہوئی ہو، جس کا دل اور دماغ آلائشوں سے پاک ہو۔ جس نے اپنے اندر ربّانی شخصیت کا باغ اگایا ہو۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس کے ایک طرف کیچڑ ہے اور دوسری طرف صاف وشفاف پانی۔ آدمی چاہے تو اپنے کو کیچڑ میں گندا کرے، اور چاہے تو صاف پانی میں نہا کر صاف ستھرا بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو گندا کریں، وہ آخرت میں جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو پاک کریں، ان کو جنت کی نعمت گاہوں میں بسایا جائے گا۔

اعتراف کے موقع پر اعتراف کرنا اپنی شخصیت کو پاک کرنا ہے اور اعتراف کے موقع پر بے اعترافی کا رویہ اختیار کرنا اپنی شخصیت کو گندا کرنا۔ اسی طرح ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتا ہے اور دوسرا شخص پست اخلاق کا۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص حق تلفی کرتا ہے اور دوسرا شخص حق رسانی۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص امین ثابت ہوتا ہے اور دوسرا شخص خائن۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص تواضع کے راستہ پر چلتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کے راستہ پر۔

ان میں سے اول الذکر آدمی اپنی شخصیت کو پاک کرنے والا ہے، وہ جنت کی نفیس دنیا میں داخلہ پائے گا۔ ثانی الذکر آدمی اپنی شخصیت کو گندا کرنے والا ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

صحیح رُخ

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما رأیتُ مثلَ النار نام هاربها وما رأیتُ مثلَ الجنة نام طالبها۔ حدیث میں ہارب نار (جہنم سے بھاگنے والا) اور طالب جنت (جنت کا چاہنے والا) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بامعنی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کی تخلیق اس ڈھنگ پر کی گئی ہے کہ وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہارب جہنم اور طالب جنت بنے۔ اگرچہ اپنی فطرت سے انحراف کر کے وہ اس سے مختلف انسان بن جاتا ہے۔

انسان تکلیف کو برداشت نہیں کر پاتا۔ کسی بھی قسم کا دکھ انسان کے لیے آخری حد تک ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کے بجائے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ راحت کو دل و جان سے چاہتا ہے، وہ خوشی اور لذت کا انتہائی حد تک دلدادہ ہے۔ چنانچہ اس کی پوری زندگی انھیں دو چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی مصیبت سے اپنے آپ کو بچانا اور دنیا کی راحت کو اپنے لیے جمع کرنا۔

مگر یہ حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ تکلیف اور مصیبت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچالے۔ اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ راحت اور خوشی کو حقیقی معنوں میں اپنے لیے حاصل کرلے۔ آدمی ساری زندگی اسی کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے۔ مگر آخر کار اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ مصیبتوں سے محفوظ زندگی حاصل کرتا ہے اور نہ آرام و راحت کی دنیا اپنے لیے بنا پاتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ جذبہ ہے اور دوسری طرف موجودہ دنیا میں اس کا ناقابل حصول ہونا، ان دونوں باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس جذبہ کا اصل رخ آخرت کی طرف تھا۔ مگر انسان نے انحراف کر کے اس کو دنیا کی طرف موڑ دیا۔

انسان کی فطرت ہر لمحہ پکار رہی ہے کہ اے شخص تو ہارب جہنم اور طالب جنت بن۔ کامیاب وہ ہے جو اس آواز کو سن کر اس کی پیروی کرے۔ ناکام وہ ہے جو اس آواز کو نہ سنے اور آخر کار ابدی مایوسی کے گڑھے میں جا گرے۔

پاک کو ناپاک سے جُدا کرنا

ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء فآمنوا باللہ ورسلہ وان تومنوا وتتقوا فلکم اجر عظیم (آل عمران ۱۷۹)

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو جس طرح پر تم ہو۔ جب تک جدا نہ کرے ناپاک کو پاک سے۔ اور اللہ یوں نہیں کہ تم کو خبردار کردے غیب کے اوپر۔ بلکہ اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے۔ پس تم یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری کرو تو تم کو بڑا ثواب ہے۔

اللہ کی نظر میں کون اچھا ہے اور کون برا، اس کا حال اسی دنیا میں کھل جاتا ہے۔ مگر اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ غیر معمولی حالات پیش آئیں۔ جب کہ انسان کو اپنے سانچہ کو توڑ کر اور اپنی زندگی کی روش کو بدل کر اس بات کا ثبوت دینا ہو کہ وہ فی الواقع اللہ پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پکڑ سے ڈرنے والا ہے۔ ایک آدمی کے ساتھ جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اللہ اس کو ایک معاملاتی جانچ میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا ہے یا اس کے سینہ میں ایسا دل ہے جو اللہ کے خوف سے خالی ہے۔ معاملہ کے وقت وہ بے انصافی کرتا ہے یا انصاف سے کام لیتا ہے۔ وہ ڈھٹائی کے راستہ پر چلتا ہے یا اعتراف کے راستہ پر۔ وہ گھمنڈ کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا تواضع کا۔ وہ خدا کے حکم کو نظر انداز کرتا ہے یا اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ جب بھی آدمی اپنے آپ کو اس قسم کے دو امکانات کے درمیان پائے تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے رب نے اس کو پل صراط پر کھڑا کر دیا ہے جو بال سے زیادہ باریک ہے۔ ایک طرف اگر وہ جھکتا ہے تو وہ جہنم میں جا گرے گا اور دوسری طرف جھکتا ہے تو جنت میں اپنے آپ کو پائے گا۔

کون خدا کی نظر میں کیا ہے، اس کا اعلان فرشتوں کے ذریعہ نہیں کرایا جاتا۔ اس معاملہ میں اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان انسانوں میں سے ایک انسان کو کھڑا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے حق کی آواز کو بلند کرتا ہے۔ اس آواز کو ماننے یا نہ ماننے میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اپنے جیسے ایک انسان کی بولی میں خدا کی آہٹ کو پا لینا اپنے جیسے ایک انسان کی آواز میں حق کی تجلیات کو پہچان لینا، یہی اللہ کی نظر میں آدمی کا اصل کمال ہے، جو اس کمال کا ثبوت دے وہ اللہ کی نظر میں پاک انسان ہے، اس کے لئے جنت کی سرسبز بستیاں ہیں۔ اور جو لوگ اس جانچ میں ناکام رہیں وہ اللہ کی نظر میں ناپاک لوگ ہیں۔ دنیا میں خواہ وہ کتنے ہی کامیاب نظر آئیں۔ مگر آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا کوئی چیز نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے۔ آدمی صالح ہے یا غیر صالح، اس کا فیصلہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ اس کی انصاف پسندی اس وقت کھلتی ہے جب کہ وہ اپنے مخالف سے معاملہ کر رہا ہو۔ اس کی حق طلبی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کہ حق کی آواز اس کو ایک ایسے گوشہ سے سنائی دے جس طرف اس کا گمان نہیں گیا تھا۔

خدا اور بندہ

علی بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ ان کے پاس سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ جب انھوں نے اپنا پاؤں اس کے رکاب میں رکھا تو کہا بسم اللہ۔ پھر جب وہ ان کی پیٹھ پر بیٹھ گیے تو کہا الحمد للہ، سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ اس کے بعد انھوں نے تین بار اللہ کی حمد کی اور تین بار اللہ کی تکبیر کی۔ پھر کہا: سبحانک لا الٰہ الا انت قد ظلمت نفسی فاغفر لی۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین، آپ اس بات پر ہنسے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے سوار ہوتے ہوئے وہی کہا جو میں نے کہا۔ پھر آپ ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، آپ کیوں ہنسے۔ آپ نے فرمایا:

عجب الربُّ تبارک وتعالیٰ من عبدہ اذا قال ربِّ اغفرلی۔ ویقول علم عبدی انہ لا یغفر الذنوبَ غیری۔

(تفسیر ابن کثیر ۴/۱۲۴)

بندہ جب کہتا ہے کہ اے میرے رب، مجھے بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس پر تعجب کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے اس کو جانا کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

رَبِّ اغْفِرْلی (میرے رب، مجھے بخش دے) کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین دریافت کے نتیجہ میں نکلنے والا کلمہ ہے جو ایک مومن کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔

یہ کلمہ کسی کی زبان سے اس وقت نکلتا ہے جب کہ وہ غیب کے پردے کو پھاڑ کر خدا کی موجودگی کو دریافت کرے۔ یہ آزادی کے باوجود اس بات کا اقرار ہے کہ میں اپنی آزادی کو بے قید استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ حشر کو دیکھے بغیر حشر کے واقعہ پر یقین لانا ہے۔ یہ اعمال کے اخروی نتائج کی حقیقت کا اس وقت اقرار کرنا ہے جب کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ یہ خدا کے ظہور سے پہلے خدا کے جلال و جبروت کے آگے جھک جانا ہے۔ یہ کلمہ معرفت کا کلمہ ہے، اور معرفت بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

لاعیشَ اِلّاعیشُ الآخرۃ

قرآن میں مختلف انداز سے جنّت کی راحتوں سے بھری ہوئی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک مقام پر جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے: نعم الثواب وحسنت مُرتفقا (وہ کیسا اچھا انعام ہے اور کیسی اچھی رہنے کی جگہ) الکہف ۳۱

ہر آدمی خوشی اور آرام کی زندگی چاہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف خوشی اور آرام کے سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری طاقت ان چیزوں کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ مگر جب وہ ان چیزوں کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اب وہ جانتا ہے کہ راحت کے ہر قسم کے سامان کے باوجود وہ راحت کی زندگی سے محروم ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو سامانِ راحت کو تلاش کرنے کی خوشی تو ملتی ہے مگر سامانِ راحت سے متمتع ہونے کی خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں راحت کا صرف تعارف ہے، راحت سے تمتع (enjoyment) ، موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن نہیں۔ راحت سے متمتع ہونے کے لیے ایک کامل دنیا درکار ہے۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہاں راحت سے متمتع ہو سکے۔

آدمی کے اس مطلوب کو پانے کا مقام صرف آخرت ہے۔ آخرت ایک کامل دنیا ہوگی۔ وہاں راحت کے تمام سامان اپنی آخری معیاری صورت میں فراہم کیے جائیں گے۔ یہ دنیا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔ اسی کے ساتھ خود انسان کی وہ تمام محدودیتیں (limitations) ختم کر دی جائیں گی جو سامانِ راحت سے حقیقی تمتع میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ان انتظامات کے بعد پہلی بار انسان کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی کو بھرپور طور پر پا سکے۔

آخرت کے لیے عمل کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اہمیت دے۔ جو دکھائی دینے والی چیزوں سے گزر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں جی لگائے۔ جو آج کے فائدے کے مقابلہ میں کل کے فائدہ کو ترجیح دے۔ جو اپنی ذات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

ایک نشانی

پچھلے روز ایک لیڈر کا انتقال ہوگیا۔ آج ٹی وی پر اس کے حالات دکھائے گئے۔ اتفاق سے مجھے اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کل کے اخبار میں میں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ آج میں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ وہ چل رہا ہے۔ وہ تقریر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے ملاقات اور بات چیت کر رہا ہے۔ اس طرح دیر تک ٹی وی پر اس کی زندگی دکھائی دیتی رہی۔

اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ٹی وی مجھ سے یہ کہہ رہا ہو کہ جس آدمی کو تم نے سمجھا تھا کہ وہ مر گیا، وہ مرا نہیں۔ وہ اب بھی زندہ حالت میں موجود ہے۔ وہ اب بھی ٹھیک اسی طرح زندہ ہے جیسا کہ وہ موت کا واقعہ پیش آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اگر تم کو "ٹی وی" کی نگاہ حاصل ہو جائے تو آج بھی تم اس کو پہلے کی طرح چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہو۔

ٹی وی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں کو دکھا رہا ہے۔ وہ آج محدود طور پر ان چیزوں کو ظاہر کر رہا ہے جو آئندہ مکمل طور پر تمام لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔ وہ گویا کل مشاہدہ سے پہلے حقائق کا جزئی مشاہدہ ہے۔

آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ بچہ سے بڑا ہوتا ہے۔ صبح و شام کی صورت میں اس کے دن گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا آخر وقت آجاتا ہے۔ وہ دنیا کے ماحول سے نکال لیا جاتا ہے تاکہ اس کو آخرت کے ماحول میں بسایا جائے اور اس کے اعمال کے مطابق اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے۔

ہر وہ شخص جو پیدا ہوا ہے، وہ ضرور ایک دن موت سے دوچار ہوگا۔ اور موت کے بعد ضرور وہ آخرت کی دنیا میں داخل کیا جائے گا جہاں اس کو خدا کی عدالت میں اپنا مکمل حساب دینا پڑے۔ جس طرح زندگی یقینی ہے، اسی طرح موت یقینی ہے۔ اور جس طرح موت یقینی ہے، اسی طرح قیامت اور آخرت کا معاملہ بھی یقینی ہے۔ آدمی اس سے بھاگ نہیں سکتا، البتہ وہ تیاری کر کے اس کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دانش مند وہ ہے جو آج کے اندر کل کو دیکھ لے۔ جو آج کے واقعہ میں اپنے کل کے لیے نصیحت حاصل کرلے۔

انسان کدھر

ہندستان کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی (۱۹۴۴-۱۹۹۱) پارلیمنٹ کے دسویں الیکشن (مئی ۱۹۹۱) کی مہم چلا رہے تھے۔ وہ ملک کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے ۲۱ مئی ۱۹۹۱ کو اپنے مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ تامل ناڈو پہونچے۔ وہ ہوائی اڈہ مینم پکم (Meenampakkam) پر اترے۔ یہاں وہ اپنی بلٹ پروف گاڑی میں بیٹھے اور ۳۰ سے زیادہ کاروں کے قافلہ کے ساتھ سری پرم بودور (Sriperumbudur) کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھیں ایک الکشن میٹنگ کو خطاب کرنا تھا۔

رات کو ۱۰ بجے وہ پنڈال کے اندر عوام کی طرف سے گلدستے وصول کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک ۲۵ سالہ عورت اپنے دونوں ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ لیے ہوئے راجیو گاندھی کی طرف بڑھی۔ راجیو بھی احساس فتح کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ کیوں کہ ہر جگہ عوامی استقبال نے انھیں یقین دلایا تھا کہ اس الکشن کے بعد وہ ملک کے وزیر اعظم بننے والے ہیں۔

عورت نے قریب آکر اپنا گلدستہ راجیو گاندھی کی طرف بڑھایا۔ مگر اس عورت کا تعلق خودکُش دستہ (suicide squad) سے تھا اور وہ اپنے جسم پر خطرناک بم باندھے ہوئے تھی۔ راجیو گاندھی نے گلدستہ اپنے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ بم پھٹ گیا۔ راجیو گاندھی پوری طرح اس کی زد میں آگیے۔ ان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اسی لمحہ ان کی موت واقع ہوگئی۔

بظاہر یہ بم کا دھماکہ تھا، مگر حقیقۃً وہ موت کا دھماکہ تھا جو ہر انسان کے لیے مقدر ہے۔ اس اعتبار سے یہ صرف راجیو گاندھی کی کہانی نہیں بلکہ ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر آدمی کا ہاتھ خوشیوں کے گلدستہ پر ہے۔ مگر اصل حقیقت اس کی امیدوں کے بالکل برعکس ہے ——— جس چیز کو آدمی گلدستہ سمجھ کر وصول کر رہا ہے وہ اس کے لیے ہلاکت کا بم ہے۔

اِس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو موت سے پہلے اپنے رب کی معرفت حاصل ہوئی، جنھوں نے اپنی زندگی کو ربِ کائنات کی اطاعت میں گزارا۔ جن کی موت اِس حال میں آئی کہ وہ اپنے پرچۂ امتحان کو کامیابی کے ساتھ حل کر چکے تھے۔

فہرستِ آرزو

کلیری سمپسن (Cleary Simpson) امریکہ کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مختلف قسم کے وقتی جاب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تمناؤں کے مطابق، ان کو امریکہ کے ٹائم میگزین میں اپنی پسند کا کام مل گیا۔ اس وقت وہ ٹائم کے نیویارک کے دفتر میں ڈائرکٹر (Advertising Sales Director) ہیں۔

ٹائم کے شمارہ ۵ اگست ۱۹۹۱ (صفحہ ۴) میں مذکورہ خاتون کا ہنستا ہوا پُر ابتہاج فوٹو چھپا ہے۔ وہ اس عہدہ کے ملنے پر انتہائی خوش ہیں۔ تصویر کے نیچے ان کا پُرمسرت تاثر ان لفظوں میں درج ہے ـــــ ٹائم کے لیے کام کرنا ہمیشہ سے میری فہرست آرزو پر تھا:

Working for *Time* was always on my wish list.

ہر آدمی کسی چیز کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ وہ اس کی تمنا میں جیتا ہے۔ وہ اس کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کے صبح و شام اس کی یادوں میں گزرتے ہیں۔ وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب وہ دن آئے جب کہ وہ اپنی اس محبوب چیز کو پالے۔ یہ چیز اس کی فہرستِ آرزو میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز اس طرح مرکزِ تمنا بنی ہوئی نہ ہو۔

مومن وہ ہے جس نے جنّت کو اپنی فہرستِ آرزو (وِش لسٹ) میں لکھ رکھا ہو۔ ابدی اور معیاری نعمتوں کی وہ دنیا جہاں وہ اپنے رب کو دیکھے گا۔ جہاں سچے انسانوں سے اس کی ملاقات ہوگی۔ جہاں وہ خدا کی رحمتوں کے سایہ میں زندگی گزارے گا۔ وہ دنیا جو "لغو" اور "تاثیم" سے پاک ہوگی۔ جہاں "نصب" اور "نصب" کو ختم کر دیا جائے گا۔ جس کا ماحول چاروں طرف حمد اور سلامتی سے بھرا ہوا ہوگا۔ جہاں خوف اور حزن کو حذف کیا جا چکا ہوگا۔ جہاں ایسی آزادی ہوگی جس پر کوئی قید نہیں۔ جہاں ایسی لذتیں ہوں گی جن کے ساتھ محدودیت شامل نہیں۔

جب کسی شخص پر زندگی کی حقیقت کھلتی ہے تو وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اس کے لیے سب سے بڑی چیز جنّت ہے۔ وہ جنّت کا حریص بن جاتا ہے۔ اور جنّت اسی کے لیے ہے جو حرص کے درجہ میں جنّت کا طلبگار بن گیا ہو۔

صرف ایک بار

موجودہ دنیا میں لذتِ طلب ہے، مگر یہاں لذتِ حصول نہیں۔ یہاں منزل کی طرف دوڑنا ہے، مگر یہاں کسی کے لیے اپنی مطلوب منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

ایک شخص زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوتا ہے۔ وہ کامیاب زندگی حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ مگر کامیاب زندگی پالینے کے باوجود اس کا احساسِ محرومی ختم نہیں ہوتا۔

اپنے نشانہ کے مطابق، جب آدمی قابلِ اعتماد جاب، اچھی کار، فرنشڈ مکان، حاصل کر لیتا ہے تو اس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل نہ کر سکا۔ اب زندگی اس کے لیے "عیش" نہیں رہتی، بلکہ زندگی اس کے لیے صرف "ذمہ داری" بن کر رہ جاتی ہے۔

آدمی سمجھتا ہے کہ وہ پانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف کھونے کی طرف تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ آدمی اس گمان میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو حاصل کر رہا ہے، حالانکہ اس کے برعکس اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے مطلوب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنا سفر برعکس سمت میں جاری کیے ہوئے ہے۔ اور جو شخص جتنا زیادہ تیز رفتار ہے اتنا ہی زیادہ تیزی کے ساتھ وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

آدمی کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو اپنا نشانہ بنایا۔ آدمی کے لیے صحیح بات یہ تھی کہ وہ آخرت کو اپنا نشانہ بنائے۔ آدمی کو جاننا چاہیے کہ دنیا صرف بیج بونے کی جگہ ہے، وہ فصل کاٹنے کا مقام نہیں۔ جو آدمی دنیا کو چاہے، اس نے ایسی چیز کو چاہا جو سرے سے ملنے والی نہیں۔ عقل مند وہ ہے جو آخرت کا طالب بنے۔ کیوں کہ آخرت ہی حقیقی ہے، اور وہی وہ چیز ہے جس کو کوئی پانے والا موت کے بعد کی زندگی میں اپنے لیے پائے گا۔

زندگی کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ یہ زندگی کسی کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ آدمی کو صرف ایک بار عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صرف ابدی انجام ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ صورتِ حال تقاضا کرتی ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے استعمال کے معاملہ میں انتہائی حد تک سنجیدہ اور محتاط ہو، وہ اپنی زندگی کا رخ متعین کرنے میں آخری حد تک باہوش انسان بن جائے۔

سچّی خوشی

الزبتھ ٹیلر (Elizabeth Taylor) جب ۲۸ سال کی عمر کو پہونچی تو وہ امریکہ میں گویا شہزادی بن چکی تھی۔ فوٹو گرافر ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ اور اس کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ اخباروں میں نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اس نے چوتھی بار مئی ۱۹۵۹ میں ایڈی فشر (Eddie Fisher) سے شادی کی۔ مگر اب بھی اسے خوشی نہیں ملی۔ ایک ملین ڈالر سے اس نے اپنی مشہور ترین فلم کلیو پترا (Cleopatra) میں ہیروئن کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ مگر عین شوٹنگ کے وقت وہ بے ہوش ہو گئی اور اس کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

آج کل سب سے زیادہ شہرت ان لوگوں کو ملتی ہے جو سیاست کے اسٹیج پر یا فلم کے اسٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر سیاست اور فلم کے ان ہیرؤوں کے اندرونی حالات نہایت ابتر ہوتے ہیں۔ اخبارات کے صفحات میں یا ٹیلی ویژن کے اسکرین پر تو وہ ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی زندگی اتنی غمزدہ ہوتی ہے کہ انھیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ان میں سے اکثر کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ گولیاں کھاکر سوتے ہیں اور جب گولی سے بھی نیند نہیں آتی تو شراب اور منشیات کے ذریعہ غم غلط کرتے ہیں۔

کسی نے کہا کہ "سب سے زیادہ ہنسنے والے چہرے سب سے زیادہ غم گین چہرے ہوتے ہیں"۔ جو شخص اپنے دل کی کیفیت کے تحت ہنسے اس کا ہنسنا واقعی ہنسنا ہوتا ہے۔ مگر سیاسی لیڈر اور فلمی ہیرو وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں، جو دوسروں کو دکھانے کے لیے بولتے ہیں، ان کا ہنسنا ہمیشہ مصنوعی ہوتا ہے۔

سچی خوشی اس آدمی کے لیے ہے جو خود اپنی ذات میں جینا جانتا ہو۔ جو خود اپنے اندر زندگی کا راز پالے۔ باہر کے لیے جینے والے کبھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔

مصنوعی خوشی اور حقیقی خوشی میں وہی فرق ہے جو پلاسٹک کے بچہ میں اور زندہ بچہ میں۔ مصنوعی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ اور سچی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے اندر۔ آدمی اسی چیز سے خوش ہو سکتا ہے جو اندر سے ملے۔ باہر سے ملنے والی چیز کبھی آدمی کو حقیقی خوشی کی نعمت نہیں دے سکتی۔

پندرہ منٹ میں

ٹائمس آف انڈیا (۲ اپریل ۱۹۹۰) میں اوپی نین Opinion کے کالم میں مسٹر رتن کیسواتی کی تحریر چھپی ہے۔ وہ اوبرائے ہوٹل (نئی دہلی) میں رومس ڈویزن منیجر ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک خاتون سیاح ان کے ہوٹل میں اتریں۔ جب ٹیکسی انھیں اتار کر چلی گئی تو انھیں یاد آیا کہ ان کا ایک بیگ ٹیکسی میں چھوٹ گیا ہے۔ اس بیگ میں ان کا پاسپورٹ، رقم، کیمرا اور زیورات موجود تھے۔

احتیاطاً انھوں نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ انھوں نے ہوٹل والوں کو بتایا۔ ہوٹل والوں نے فوراً ٹرافک پولیس کے کنٹرول روم کو ٹیلی فون کیا اور ان کو ٹیکسی کا نمبر بتایا۔ کنٹرول روم نے اسی وقت وائرلیس کے ذریعہ پوری دہلی میں سڑکوں پر کھڑی ہوئی پولیس کو اس واقعہ کی خبر دیدی۔ پورے شہر میں ہزاروں نگاہیں گزرتی ہوئی ٹیکسیوں کا معائنہ کرنے لگیں۔ ابتدائی اطلاع کے صرف پندرہ منٹ کے اندر پولیس والوں نے ہوٹل کو بتایا کہ انھوں نے ٹیکسی کو پکڑ لیا ہے اور اس سے مذکورہ بیگ حاصل کر لیا ہے:

'Within 15 minutes they telephoned to say
they had located the taxi and taken the bag.

میں نے اس واقعہ کو پڑھا تو مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے جن اور انسان کی جماعت، اگر تم سے ہو سکے تو تم آسمانوں اور زمین کی حدوں سے نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے بغیر (خدا کی) سلطان کے۔ پھر تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا تو تم اپنا بچاؤ نہ کر سکو گے۔ (الرحمٰن ۳۴-۳۵)

مخلوق ایسا کر سکتی ہے کہ وہ ترقی یافتہ مواصلات کے ذریعہ فوری طور پر پولیس کو مطلع کرے اور پولیس منٹوں کے اندر بھاگنے والے کا پتہ کرکے اس کو پکڑ لے۔ جب مخلوق کے اندر یہ طاقت ہے تو خالق کے اندر یہی طاقت مزید بے حساب گنا اضافہ کے ساتھ کمال درجہ میں موجود ہوگی۔ آدمی اگر اس پہلو کو سوچے تو اس کی زندگی میں اچانک انقلاب آجائے۔

میں کسی حال میں خدا کی پکڑ سے باہر نہیں، یہی احساس تمام اصلاحات کی جان ہے۔ اس کے بغیر کوئی حقیقی اصلاح ممکن نہیں۔

دو بول

آپ امام البخاری کی "صحیح" کو پڑھنا شروع کریں تو جب آپ اس کے خاتمہ پر پہنچیں گے تو آخر میں آپ کو یہ حدیث لکھی ہوئی ملے گی :

عن ابی هریرة، قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو بول خدائے مہربان کو محبوب ہیں۔ وہ زبان پر ہلکے ہیں مگر قیامت کی میزان پر بھاری ہیں۔ وہ بول ہیں : سُبحانَ اللہِ وَبِحَمدِہٖ سبحان اللہ العظیم ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں بول زمین و آسمان کی تمام چیزوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ وہ قیامت میں اعمال کے ترازو کو جھکا دینے والے ہیں۔ مگر ان بولوں کی یہ اہمیت ان کے تلفظ میں نہیں ہے بلکہ ان کی حقیقت میں ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ وہ جس معنویت کا اظہار ہیں وہ معنویت اپنی اہمیت میں تمام چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

یہ دونوں بول دراصل معرفتِ خداوندی کے بول ہیں۔ ایک شخص کو ایمان کی معرفت حاصل ہوئی۔ اس نے اللہ کی پاک ہستی کا ادراک کیا۔ اس نے دیکھا کہ کائنات اپنے اَن گنت کرشموں کے ساتھ اس کی حمد میں نغمہ سنج ہے۔ اس نے اپنے اندر اور اپنے باہر خدا کی عظمت وجلال کی نشانیاں دیکھیں۔ اس معرفت نے اس کے سینہ میں حمدِ الٰہی اور اعترافِ خداوندی کا طوفان برپا کر دیا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ خدایا تو پاک ہے۔ ساری حمد تیرے لیے ہے۔ تو سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اس کی زبان پر بے اختیار یہ کلمات جاری ہو گئے کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۔

اس طرح کا ایک بول محض ایک انسانی بول نہیں۔ وہ خدا کی بے پایاں عظمتوں کا انسان کی زبان سے اظہار ہے۔ وہ تمام باوزن چیزوں سے زیادہ باوزن ہے۔ وہ بلاشبہ اسی قابل ہے کہ جس پلڑے میں رکھا جائے اس پلڑے کو جھکا دے۔

غلطی میری نہیں

اڈولف ہٹلر (۱۹۴۵ - ۱۸۸۹) کی موت کے بعد سے اب تک اس کے بارہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد صرف انگریزی زبان میں تقریباً ۵۵ ہزار ہے۔ اس میں تازہ اضافہ برلن کا بنکر (The Berlin Bunker) ہے جو لندن سے چھپی ہے۔ ہٹلر کے آخری ۱۰۵ دن بنکر (فوجی تہ خانہ) میں گزرے تھے۔ مصنف نے اس زمانہ کے ہٹلر کے ساتھیوں سے معلومات حاصل کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ کو جب ایک ہزار امریکی بمباروں نے برلن کو تہس نہس کر دیا تو ہٹلر اپنے عملہ کے ساتھ خاموشی سے بنکر کے اندر چلا گیا۔ اس زمانہ میں اس کا اتنا برا حال تھا کہ ۵۵ سال کا ہو کر وہ ۷۰ سال کا دکھائی دینے لگا۔ اس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ روس کی بڑھتی ہوئی فوجیں پہنچ کر اس کو پکڑ لیں گی۔ ان حالات میں ایک ایک شخص اس کا ساتھ چھوڑتا گیا۔ یہاں تک آخر میں صرف اس کا کتا اس کے ساتھ رہ گیا۔

ہٹلر کی حکومت چونکہ شروع سے آخر تک تشدد پر قائم تھی اس لیے ہٹلر کو ہر وقت اپنی موت کا شبہ لگا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۴۵ - ۱۹۳۹ کے درمیان ہٹلر کے اوپر ۲۵ بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ مگر ہر بار وہ بچ جاتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا زبردست حفاظتی عملہ نہ تھا۔ بلکہ ہٹلر کا یہ مزاج تھا کہ وہ اکثر بالکل آخر وقت میں اپنا پروگرام بدل دیتا تھا۔ پروفیسر ہاف من کا کہنا ہے کہ ہٹلر بعض اوقات اپنا پروگرام طے کرنے کے لیے سکہ اچھالتا اور اس کو دیکھ کر فیصلہ کرتا۔

تاہم اس کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ آخر وقت تک ہٹلر نے یہ نہ کہا کہ "میں نے غلطی کی"۔ وہ ہمیشہ اپنے جنرلوں اور یہودیوں اور کمیونسٹوں کو ساری باتوں کا الزام دیتا رہا۔ حتی کہ "اپنے عوام" کو بھی۔ مایوسی جب اپنی آخری حد پر پہونچ گئی تو ہٹلر نے سائنائڈ کیپسول کھا کر خودکشی کرلی (۶ جنوری ۱۹۸۰)

دنیا میں کوئی آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا، حتی کہ ہٹلر جیسا آدمی بھی نہیں جس کو تمام دنیا غلط قرار دے چکی ہو۔ آدمی کو معلوم نہیں کہ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ وہ اپنی غلطی ماننے پر مجبور ہوگا۔ حتی کہ اگر وہ اپنی زبان سے نہ کہے کہ میں غلطی پر تھا تو خود اس کے اپنے اعضا اس کے خلاف گواہی دیں گے اور وہ اس پر قادر نہ ہوگا کہ ان کو روک سکے (۴۱/۲۱)

امتحان کے لیے

امتحان ہال میں طالب علم کو بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں ـــــ بلڈنگ، میز، کرسی، ملازم کاغذ اور بہت سی دوسری چیزیں۔ وہ بلا روک ٹوک ان چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ آزادانہ طور پر ان کے درمیان اپنی نشست پر بیٹھتا ہے۔

بلڈنگ اس کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے۔ میز اور کرسی اس کو آرام کے ساتھ بیٹھنے کی جگہ فراہم کرتے ہیں۔ کاغذ اور دوسرے سامان اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرے اور جو چاہے کاغذ کے صفحہ پر مرتسم کرے۔

مگر یہ سب کچھ جو طالب علم کو ملتا ہے وہ امتحان کے طفیل میں ملتا ہے۔ وہ صرف اس وقت تک کے لیے اس کا ہے جب تک امتحان کی مدت پوری نہ ہوجائے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوتی ہے اس سے وہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے جو اس کو اب تک بے روک ٹوک ملا ہوا تھا، جو دیکھنے والوں کو اس کا ذاتی اثاثہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ دنیا میں انسان کا ہے۔ یہاں آدمی کو بظاہر بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے یہاں رہے اور جس طرح چاہے اپنی ملی ہوئی چیزوں کو استعمال کرے۔

مگر یہاں جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ سب امتحان کے طفیل میں ہے۔ خدا موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان لے رہا ہے۔ اور اس امتحان کے تقاضے کے تحت وہ بہت سی ضروری چیزیں انسان کو دے دیتا ہے۔ مگر یہ آدمی کے پاس صرف اس وقت تک ہے جب تک امتحان کی مدت ختم نہ ہوجائے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک اس سے سب کچھ چھن جائے گا۔ وہ آدمی جو آج بظاہر سب کچھ پائے ہوئے ہے وہ اس وقت بالکل بے کچھ ہوجائے گا۔ اس دن وہ اس مسافر کی طرح ہوگا جس کو اچانک لق و دق صحرا میں ڈال دیا جائے۔ وہ اس انسان کی طرح ہوگا جس کو لامتناہی خلا میں بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔

موجودہ حالت اور اگلی حالت کے درمیان صرف موت کی غیر مرئی دیوار حائل ہے۔

پہلے آپ

ڈاکٹر سوجات موکو انڈونیشیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر تھے۔ وہ جکارتا یونیورسٹی میں ایک علمی موضوع پر لکچر دے رہے تھے۔ عین لکچر کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ اسٹیج ہی پر گر پڑے اور اسی وقت وفات پاگیے۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جو اقوام متحدہ کی امن یونیورسٹی (ٹوکیو) کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں:

Prof Dr. Soedjatmoko, one of the leading intellectuals of Indonesia while delivering a lecture at a University campus, in Jogjakarta, had a heart attack, collapsed and expired. He was the first Asian to become the President of UN's Peace University in Tokyo. He has written a number of books.

ڈاکٹر سوجات موکو کا کیس موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا کیس ہے۔ پریس اور میڈیا اور پلیٹ فارم کے ظہور نے ہر آدمی کو بولنے کے لامتناہی مواقع دیدیئے ہیں۔ ہر آدمی صبح و شام بولنے میں مصروف ہے۔ آج ہر آدمی دوسروں کو سنا رہا ہے۔ حالاں کہ خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہر آدمی کی طرف آرہے ہیں تاکہ اس کو لے جاکر وہاں کھڑا کردیں جہاں اس کو صرف سننا ہے، سنانے کا موقع آخری طور پر اس کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

علم لفظوں سے واقفیت کا نام نہیں ہے بلکہ معانی سے واقفیت کا نام ہے۔ اس دنیا میں سب سے بڑا کام بولنا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا کام چپ رہنا ہے۔ یہاں اصل اہمیت اظہار رائے کی نہیں ہے بلکہ اظہار رائے سے پہلے سوچنے کی ہے۔

بولنے والا حقیقۃً وہ ہے جو اپنے آپ سے بولے۔ بتانے والا وہ ہے جو اپنے دماغ کو سوچنے میں لگائے ہوئے ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والا وہ ہے جو دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرے، جو دوسروں کو مخاطب کرنے سے پہلے اپنا مخاطب خود بن جائے۔ جو دوسروں پر بلڈوزر چلانے کا نعرہ لگانے سے پہلے خود اپنی ذات پر بلڈوزر چلا چکا ہو۔

دوسروں کو مخاطب کرنا سب سے آسان کام ہے اور اپنے آپ کو مخاطب کرنا سب سے مشکل۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں۔

زلزلہ کا سبق

قدرتی آفتوں میں سب سے بڑی آفت زلزلہ ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے انسان زلزلوں کا شکار ہوتا رہا ہے۔ زلزلہ میں جو انسانی موتیں واقع ہوتی ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب مکانوں کا گرنا ہے۔ جب زلزلہ کا جھٹکا آتا ہے تو مکانات اچانک گر پڑتے ہیں اور چھوٹے بڑے سب اس کے نیچے دب کر مر جاتے ہیں۔ انسان نے اپنے تجربات میں یہ معلوم کیا کہ جو مکان جتنا زیادہ مضبوط ہو، اتنی ہی آسانی سے وہ زمیں بوس ہو جاتا ہے اور بھیانک حادثات کا سبب بنتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ زلزلہ سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچنے کی تدبیر مکانات کی "مضبوطی" نہیں بلکہ اس کی "کمزوری" ہے۔ مضبوط مکان بے لچک ہوتا ہے، وہ زلزلہ کے مقابلہ میں مستحکم طور پر کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ چوں کہ شدید زلزلہ کا جھٹکا ہر مضبوط مکان سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے مکان کی مضبوطی اس کے لیے الٹی پڑتی ہے۔ وہ پورا کا پورا دھڑام سے گر جاتا ہے۔

اس کے برعکس مکان اگر زیادہ مضبوط نہ ہو بلکہ لچک دار ہو تو اس کے اندر زلزلہ کے جھٹکے کو سہارنے کی طاقت آجاتی ہے۔ زلزلہ جب جھٹکا دیتا ہے تو وہ خود بھی ہلنے لگتا ہے۔ اس طرح مکان کا ہلنا اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔ زلزلہ اگر زمین کو تلپٹ نہ کرے، بلکہ صرف ہلائے، تو ایسے مکانات اکثر محفوظ رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان مکانوں کے باشندے بھی۔

اس تجربہ کی روشنی میں، ارتھ کوئیک انجینیرنگ وجود میں آئی ہے۔ اس انجینیرنگ کے مطابق، زلزلہ کے علاقوں میں ایسے مکانات بنائے جاتے ہیں جن کا ڈھانچہ فلوٹنگ فاؤنڈیشن Floating Foundation کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب زلزلہ کا جھٹکا آتا ہے تو ایسا مکان ہل کر رہ جاتا ہے، وہ منہدم نہیں ہوتا۔ ۱۹۸۹ میں سان فرانسسکو میں شدید زلزلہ آیا۔ مگر وہاں صرف ۲۷۵ موتیں ہوئیں۔ جب کہ جون ۱۹۹۰ میں اسی قسم کا زلزلہ شمالی ایران میں آیا تو ۶۰ ہزار آدمی مر گئے۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ سان فرانسسکو میں لچک دار مکانات بنے ہوئے تھے اور ایران میں اینٹ اور سمنٹ کے مضبوط مکانات۔

یہ قدرت کا ایک سبق ہے جو بتاتا ہے کہ موجودہ حادثات کی دنیا میں بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں اکڑ کے ساتھ نہ رہے بلکہ تواضع کے ساتھ رہے۔

اخلاقی زہر

۶ جنوری ۱۹۹۰ کو دہلی (شکرپور) میں ایک دردناک واقعہ ہوا۔ کچھ چھوٹے بچے ایک میدان میں کھیل رہے تھے۔ وہاں ایک طرف کوڑے کا ڈھیر تھا۔ وہ کھیلتے ہوئے اس کوڑے تک پہونچ گئے۔ یہاں انھیں ایک پڑی ہوئی چیز ملی۔ یہ کوئی زہریلی چیز تھی۔ مگر انھوں نے بےخبری میں اس کو اٹھا کر کھالیا۔ اس کے نتیجہ میں دو بچے فوراً ہی مرگیے، اور آٹھ بچوں کو تشویشناک حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ یہ بچے دو سال سے پانچ سال تک کے تھے۔

ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۰) نے صفحۂ اول پر اس کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان بچوں میں سے ایک نے وہاں ایک چھوٹا پیکٹ پایا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو گرام کوئی سفید رنگ کا سفوف تھا۔ انھوں نے غلطی سے اس کو شکر سمجھا اور آپس میں تقسیم کرکے کھانے لگے۔ کھانے کے چند منٹ بعد ان کے ہونٹ نیلے پڑ گیے:

> One of them found a small packet containing about 150 gm of white, powdery substance. They mistook it for sugar and distributed it among themselves. Within minuters of consuming it, their lips turned blue.

مادی خوراک کے اعتبار سے یہ چند بچوں کا واقعہ ہے۔ لیکن اخلاقی خوراک کے اعتبار سے دیکھیے تو آج یہی تمام انسانوں کا واقعہ ہے۔ آج کی دنیا میں تمام انسان ایسی اخلاقی غذائیں کھا رہے ہیں جو ان کی انسانیت کے لیے زہر ہیں، جو ان کو ابدی ہلاکت سے دوچار کرنے والی ہیں۔

جھوٹ، بدکاری، رشوت، غرور، حسد، الزام تراشی، ظلم، غصب، بددیانتی، وعدہ خلافی، بدخواہی، بے اصولی، بدمعاملگی، انانیت، بے اعترافی، غلطی نہ ماننا، احسان فراموشی، خودغرضی، انتقام، اشتعال انگیزی، اپنے لیے ایک چیز پسند کرنا اور دوسرے کے لیے کچھ اور پسند کرنا، یہ تمام چیزیں اخلاقی معنوں میں زہریلی غذائیں ہیں۔ آج تمام لوگ ان چیزوں کو میٹھی شکر سمجھ کر کھا رہے ہیں۔ مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کا زہریلا پن ظاہر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہاں نہ کوئی اس کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ کوئی اس کا علاج کرنے والا۔

حکمتِ عبادت

عبادت

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور جن کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) یہ آیت حقیقتِ واقعہ کے اتنا زیادہ مطابق ہے کہ اگر صرف اسی ایک آیت پر غور کیا جائے تو وہ کسی آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہوگی کہ قرآن خداوندِ عالم کی کتاب ہے، انسان جیسی ایک مخلوق اس قسم کی کتاب وجود میں لانے پر قادر نہیں۔

انسان کی ہستی کے دو پہلو ہیں۔ ایک نفسیاتی (یا روحانی) اور دوسرے جسمانی۔ ان دونوں پہلوؤں سے انسان کی ترکیب ایسی ہے گویا وہ عبادتِ الٰہی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ عبادت کا سب سے زیادہ کامل مظہر نماز (صلاۃ) ہے۔ اس آیت کی روشنی میں نماز اور انسانی شخصیت کا مطالعہ کیجیے۔

انسان کی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان عین اپنی تخلیق کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر انسان کسی نہ کسی کے آگے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس جھکاؤ سے انھیں خصوصی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ مگر غیر خدا کے آگے جھکنا اس جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اس طرح آدمی غیر خدا کو وہ چیز دیدیتا ہے جو اسے صرف خدا کو دینا چاہیے۔

نماز میں جب آدمی خدا کے آگے جھکتا ہے تو اس کو اپنے اس جذبہ کی پوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ نماز میں خدا کے آگے جھک کر وہ اپنے وجود کے اس پورے تقاضے کا جواب پالیتا ہے جو اس کے اندر اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ وہ اس کو نکالنا چاہے تب بھی وہ اس کو نکال نہ سکے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے فطری جذبہ کا مرجع حقیقی طور پر خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد انسان کے جسم کو لیجئے۔ آپ کسی آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے شروع سے آخر تک دیکھیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ نماز آدمی کے پورے جسم کا مکمل استعمال ہے۔ آپ کو ایسا معلوم ہوگا گویا آدمی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھے۔

نماز کے لیے آدمی کا اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہونا، قبلہ رخ متوجہ ہونا۔ پھر ہاتھ باندھنا۔ زبان سے نماز کے کلمات ادا کرنا اور امام کی آواز سن کر ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف جانا، دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر رکوع کرنا، ہاتھ اور پیشانی اور بقیہ پورے جسم کو استعمال کرتے ہوئے سجدہ میں جانا، پھر چہرہ کو دائیں اور بائیں

گھما کر سلام کرنا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کرنا۔ وغیرہ

یہ ساری چیزیں انسان کے جسم سے اتنا زیادہ مطابقت رکھتی ہیں، اور ان حرکات میں انسان کے تمام اعضاء اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کا پورا جسم اسی لیے بنایا گیا تھا کہ وہ نماز کی شکل میں اپنے رب کی عبادت کرے۔

تمام انسان فطرت اللہ پر پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ فطرت اللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور نماز کی صورت میں اس کی عبادت کرے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذٰلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ منيبين اليه واتقوه واقيموا الصلاة ولا تكونوا من المشركين۔	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف سیدھا رکھو۔ اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

نماز کی یہی خاص صفت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے لوگوں نے صرف مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔

آدمی کے اندر جو فطرت ہے وہ عبادت کی فطرت ہے۔ آدمی کا پورا وجود عبادت کا طالب ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر نماز پڑھنے کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا پورا جسم اور اس کے تمام اعضاء نماز کی صورت میں ڈھل جانے کا خاموش داعیہ لیے ہوئے ہیں۔

اب جب ایک آدمی کسی نمازی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا پورا وجود کہہ اٹھتا ہے کہ یہی وہ عمل ہے جس کی طلب وہ اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ نماز اس کو خود اپنی تلاش کا جواب معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی فطرت کی یہ تڑپ اس کو مجبور کرتی ہے اور وہ نمازیوں کے ساتھ نماز میں جھک جاتا ہے۔

(ارکعوا مع الراکعین)

پانچ وقت کی نماز

اسلام کی عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے۔ نماز اہل ایمان کے اوپر رات دن کے درمیان پانچ وقت کے لئے فرض کی گئی ہے۔

احادیث میں نماز کے تمام مسائل تفصیل کے ساتھ آئے ہیں، ان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نماز اہل ایمان کے اوپر پانچ وقت کے لئے فرض ہے۔ فرض نمازوں کا پانچ ہونا روایات سے بتواتر ثابت ہوتا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور دوسری کتب حدیث میں کثرت سے ایسی روایات ہیں جن میں الصلوات الخمس کے الفاظ آئے ہیں، اس سے صراحتہً یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں جو مخصوص اوقات میں مقرر کی گئی ہیں۔

نماز کا حکم قرآن میں

قرآن میں نماز کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: إن الصلوة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً (النساء ۱۰۴) یعنی بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا بھی اسی طرح مقرر وقت ہے جس طرح حج کا مقرر وقت ہے۔ نیز یہ کہ نماز کا ایک وقت جب گزر جاتا ہے تو اس کے بعد اس کا دوسرا وقت آتا ہے اور اس طرح رات اور دن کے درمیان اس کی یہ ترتیب مسلسل جاری رہتی ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/۵۴۹)

اب سوال یہ ہے کہ نماز کے یہ مقرر اوقات کیا ہیں۔ قرآن کے مطالعہ سے واضح طور پر اس کے پانچ اوقات معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو پانچ اوقات حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، ٹھیک وہی اوقات خود قرآن سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔	سورج نکلنے سے پہلے	(قبل طلوع الشمس، طه ۱۳۰)	فجر
۲۔	دوپہر ڈھلنے کے وقت	(لدلوك الشمس، بنی اسرائیل ۷۸)	ظہر
۳۔	غروب آفتاب سے پہلے	(وقبل غروبها، طه۱۳۰)	عصر
۴۔	جب شام ہوتی ہے	(حين تمسون، الروم ۱۷)	مغرب
۵۔	جب رات تاریک ہو جائے	(الى غسق الليل، بنی اسرائیل ۷۸)	عشاء

اس طرح قرآن سے پانچ نمازیں مع تعیّنِ اوقات ثابت ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن میں ایسی آیت بھی موجود ہے جس سے صرف استنباط کے طور پر نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوپر جو نمازیں فرض کی ہیں وہ محدّد طور پر پانچ ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے:

حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ (البقرۃ ۲۳۸) یعنی پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی۔

جملہ کی ترتیب بتارہی ہے کہ اس آیت میں صلوٰۃ وسطیٰ کا لفظ جس نماز کے لئے آیا ہے وہ صلوات سے علیحدہ ایک نماز ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ "نمازوں" کی پابندی کرو اور اسی کے ساتھ اُس نماز کی جس کا وقت "نمازوں" کے بیچ میں آتا ہے۔ صلوات جمع کا لفظ ہے جو عربی قواعد کے مطابق تین یا اس سے زیادہ نمازوں کے لئے ہے۔ استعمال بتاتا ہے کہ یہاں اس سے تین سے زیادہ نمازیں مراد لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ تین کے عدد میں کوئی چوتھی چیز رکھی جائے تو وہ اس کا "بیچ" نہیں بن سکتی۔ کم از کم عدد جو یہاں صلوات سے مراد ہو سکتا ہے وہ چار ہے۔ چار کا عدد لینے کی صورت ہی میں یہ ممکن ہے کہ ایک اور نماز اس میں اس طرح شامل کی جائے کہ وہ اُس کا بیچ بن جائے۔ گویا صلوٰۃ وسطیٰ وہ بیچ کی نماز ہے جس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہیں۔ باعتبار مفہوم آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ــــــ "بیچ کی نماز کی پابندی کرو اور بیچ کی نماز سے پہلے دو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کے بعد دو نمازوں کی"۔ اس سے صاف طور پر یہ نظام معلوم ہوتا ہے کہ رات میں دو نمازیں مقرر کی گئی ہیں اور پھر دن میں دو نمازیں۔ اور ان کے بیچ میں ایک نماز ہے۔ رات کی دو نمازوں سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ دن کی دو نمازوں سے مراد فجر اور ظہر اور بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس طرح کل پانچ نمازیں ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نقشۂ ذیل:

پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو اس نماز کی جو نمازوں کے بیچ میں ہے (قرآن)

مذکورہ آیت کی یہ تشریح صحابہ اور تابعین سے بھی ثابت ہے، مثال کے طور پر مسند احمد اور سنن ابی داؤد کی روایت کے مطابق حضرت زید ابن ثابت انصاریؓ نے کہا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز ہے جس کے اول بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (إن قبلها صلاتين و بعدها صلاتين) تفسیر ابن کثیر ۱/ ۲۹۰۔

اسی طرح نحاس تابعی کا قول ہے کہ الصلوۃ الوسطیٰ سے مراد عصر ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں، اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں، انها العصر ، لأن قبلها صلاتَی نهارٍ و بعدها صلاتَی ليلٍ (الجامع لاحكام القرآن للقرطبی، ۲۱۰/۳)۔ نمازوں میں سے ایک نماز کو بیچ کی نماز، الصلوۃ الوسطیٰ کہنا لازمی طور پر نماز کے متعدد ہونے کو ثابت کرتا ہے اور آیت کے الفاظ کے مطابق جب اس تعدد کو متعین کیا جائے تو لازمی طور پر وہ پانچ کا عدد بنتا ہے۔ پانچ سے کم کا عدد لینے کی صورت میں آیت کی تشریح ممکن نہیں۔

نماز کی اصل اللہ کی یاد ہے۔ مگر اس کا نظام ایسی حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے نہایت جامعیت کے ساتھ اس میں شامل ہوگئے ہیں ـــــ نماز اتحاد اور اجتماعیت کا سبق ہے۔ وہ بندے کو اپنے رب سے جوڑتی ہے۔ وہ ہمارے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ ہمارے اوقات کو منظم کرتی ہے۔ وہ ہلکی جسمانی ورزش کا فائدہ دیتی ہے۔ وہ بار بار ہماری صفائی کرتی رہتی ہے، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ہر قسم کی روحانی اور جسمانی برکتوں کا مجموعہ ہے۔ مسلمان اگر حقیقی شعور کے ساتھ نماز پر قائم ہو جائیں تو ان کی دنیا بدل جائے اور وہی ان کے تمام مسائل کے حل کے لئے کافی ہو جائے۔

پانچ نمازیں اہل ایمان کے لئے نظام الاوقات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس میں یہ سبق ہے کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنے کاموں کو پانچ حصوں میں منظم کرلیں۔ یعنی کچھ کام فجر اور ظہر کے درمیان اور کچھ کام ظہر اور عصر کے درمیان اور کچھ کام عصر اور مغرب کے درمیان اور کچھ کام عشاء اور فجر کے درمیان۔

قیادت کی تربیت

ایک مشہور مسلم شاعر کا نماز کے بارہ میں دو شعر یہ ہے:

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا جانیں، یہ بیچارے دو رکعت کے امام
ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ بات موجودہ دور زوال کی نمازوں کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ اصل نماز اگر اپنی روح کے ساتھ زندہ ہو تو خود مذکورہ شاعر کے مطابق، وہ ایک عظیم انقلابی چیز بن جائے گی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حقیقت یہ ہے کہ نماز پوری زندگی کے لئے ایک تربیت ہے۔ نماز ایک اعتبار سے مسجد کا ایک وقتی عمل ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایسا انقلاب انگیز عمل ہے جو انسانی زندگی میں ہمہ گیر نتائج پیدا کرنے والا ہے۔

نماز کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق امامت سے ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آئے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں سے جو آدمی سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرے (اذا حضرتِ الصلاۃ فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم) ایک اور روایت میں ہے کہ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب اللہ) فتح الباری ۲/۲۰۰

اکبر اور اقرأ (زیادہ علم والا) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسے شخص کی امامت پر راضی ہو جایا کریں جو ان کے درمیان زیادہ پختہ کار اور زیادہ واقف کار ہو۔ جو آدمی علم اور عمر میں بڑا ہوگا۔ اس کے اندر لازماً یہ صفتیں دوسروں سے زیادہ پائی جائیں گی۔

اس طرح مسجد میں یہ تربیت دی جاتی ہے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمان کس طرح رہیں۔ وہ اس طرح رہیں کہ جب بھی کوئی اجتماعی معاملہ ہو تو پختگی اور واقفیت میں جو لوگ کم ہوں وہ اپنے کو پیچھے کرلیں اور جو آدمی پختگی اور واقفیت میں زیادہ ہے اس کو اپنا قائد بنانے پر راضی ہو جائیں۔

دعا کب قبول ہوتی ہے

قرآن میں مختلف مقامات پر دعا کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

ادعو اربکم تضرعا وخفیة انہ لا یحب المعتدین ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا وادعوہ خوفا وطمعا ان رحمت اللہ قریب من المحسنین (اعراف ۵۵-۵۶)	پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ پسند نہیں کرتا حد سے نکل جانے والوں کو۔ اور مت خرابی مچاؤ زمین میں اس کی درستی کے بعد۔ اور پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے۔ یقیناً اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے۔

اس موقع پر احسان کا مطلب ہے دعا کے موافق عمل کرنا۔ دوسری جگہ یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی مسلمین حم سجدہ ۳۳	اور کون شخص ہے بہتر بات میں اس شخص سے کہ پکارے اللہ کی طرف اور صالح عمل کرے اور کہے کہ میں حکم بردار ہوں

دعا کیا ہے۔ بندے کا اعترافِ عجز اپنے رب کے سامنے۔ جب ایک شخص اللہ پر اس حد تک یقین اور بھروسہ کر لیتا ہے کہ اس کی ساری امیدیں بس ایک اللہ سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور سے نہ اس کو پانے کی امید ہوتی ہے اور نہ چھننے کا اندیشہ۔ اس وقت اس کی زبان سے جو بیتابانہ کلمات نکل پڑتے ہیں، اسی کا نام دعا ہے بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ میرے رب! مجھے اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ تیرے سوا کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔ تیرے سوا کوئی کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔

دعا کے یہ الفاظ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعا ہیں جب کہ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) سے اس کی تصدیق ہو رہی ہو۔ آدمی اپنے رب سے اپنے لئے جس رحمت اور عفو و درگزر کا طالب ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت اور عفو و درگزر کا وہی طریقہ اختیار کرنا زمین کی اصلاح ہے۔ اور جب ایسا ہو کہ آدمی اپنے لئے تو رحمت اور عفو و درگزر کا امیدوار ہو اور خود دوسرے انسانوں کے ساتھ سرکشی اور بے پروائی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کا نام زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ اللہ کے سامنے حد بندگی میں ہونے کا اقرار کرنا اور دنیا کی زندگی میں جب دوسرے انسانوں سے عملی سابقہ پیش آئے تو حد بندگی سے نکل جانا ایسا تضاد ہے جو ایک طرف زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے اور دوسری طرف آدمی کی دعا کو اللہ کی نظر میں بالکل بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی اپنی دعا کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر اس بات کا ثبوت اس کو انسانی تعلقات ہی میں دینا ہے کہ وہ اپنی دعا میں محسن ہے یا نہیں۔ جو شخص انسانی تعلقات میں اپنی دعائیہ حیثیت کو بھول جائے اس کی مثال ایسے آدمی کی ہے جس نے زبان سے بڑے بڑے دعوے کئے مگر جب اس کا امتحان لیا گیا تو وہ صفر سے زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکا۔

نماز کی حقیقت

یہ عصر کی نماز تھی۔ امام نے نماز پوری کر کے سلام پھیرا، تھوڑی دیر بیٹھے اور اس کے بعد دعا کر کے اٹھ گیے۔ ایک مقتدی نے امام صاحب کو روکا۔ اور تضحیک کے انداز میں بولے: "عصر کی نیت کی تھی یا ظہر کی" یہ سن کر تمام نمازی ہنس پڑے جو پہلے ہی سے امام صاحب کو عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مذکورہ مقتدی سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "عصر کے وقت تسبیح (فاطمہ) پڑھی جاتی ہے۔ مگر امام صاحب نے تسبیح پڑھے بغیر دعا کر لی اور اٹھ گیے" خیریت یہ ہے کہ امام صاحب نے کسی قسم کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ اپنے حجرہ میں چلے گیے۔ اگر انھوں نے کوئی تیز جواب دیا ہوتا تو یقیناً بات بڑھتی اور زبانی تنقید باقاعدہ ہاتھاپائی میں تبدیل ہو جاتی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آج کل نماز کا کیا حال ہے۔ وہ نماز کو صرف اس کے ڈھانچے کے اعتبار سے جانتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ کچھ لوگ "مسنون" ڈھانچہ کو نماز سمجھے ہوئے ہیں اور کچھ لوگوں نے مبتدعانہ طور پر اس میں کچھ غیر مسنون چیزوں کا اضافہ کر لیا ہے۔

نماز کا بلاشبہ ایک ڈھانچہ ہے۔ مگر نماز کی اصل حقیقت اس کی اندرونی اسپرٹ ہے، اور یہ اندرونی اسپرٹ خشوع ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کی نماز میں ظاہری ڈھانچہ ہو مگر اس میں خشوع کی کیفیت نہ پائی جائے تو ایسی نماز حدیث کے مطابق نماز ہی نہیں (لا صلوٰۃ لمن لم یتخشع)

ڈھانچہ والی نماز اور خشوع والی نماز کی ایک پہچان یہ ہے کہ جو آدمی ڈھانچہ والی نماز پڑھے، اس کی نظر دوسرے کی نماز پر ہوتی ہے۔ اور جو آدمی خشوع والی نماز پڑھے اس کی نظر اپنی نماز پر۔ پہلی قسم کا آدمی دوسروں کی نماز میں "ٹکنکل" خامی نکال کر ان کے خلاف تقریر کرے گا۔ اور دوسری قسم کا آدمی خود اپنی نماز کی کمیوں کو سوچ کر چپ رہے گا۔ وہ اپنے احتساب میں اتنا زیادہ مشغول ہوگا کہ اس کو یہ فرصت ہی نہ ہوگی کہ وہ دوسروں کی نماز پر تبصرہ کرے۔

نماز اللہ کی یاد کا نام ہے، اور اللہ کی یاد کسی آدمی کے اندر جو کیفیت پیدا کرتی ہے اسی کو خشوع کہا گیا ہے۔

رب کے پاس اس حال میں پہنچتا ہے کہ وہ بالکل پاک صاف ہوتا ہے اور اس کو جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانی سے ہاتھ پاؤں کو دھونا اپنے آپ آدمی کو گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ خطا اور گناہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قلبی اعمال ہیں۔ ان کا تعلق آدمی کی نیت اور ارادہ سے ہے۔ اس لیے وہ اسی وقت دھل سکتے ہیں جب کہ آدمی کا قلب دھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی روایتیں اس انسان کے لیے ہیں جس کا جسمانی وضو اس کے لیے روحانی وضو بن جائے۔ جو وضو کا عمل اس طرح کرے کہ اسی کے ساتھ اس کا قلب اور ذہن بھی دھلتا چلا جائے۔ جس کی نفسیات اس کے وضو میں شامل ہو گئی ہو۔

ایک شخص جس کے دل میں اللہ کا خوف اور آخرت کا فکر سمایا ہوا ہو، وہ جب وضو کرتا ہے تو اس کے اندرونی احساسات کے اثر سے اس کا وضو کا عمل ایک ربانی عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مادی عمل اس کی روحانی کیفیات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ وضو کے ظاہری عمل میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا ذہن دعا اور ذکر کے باطنی عمل میں۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا ـــــ جس ہاتھ اور پاؤں اور چہرے کو آپ نے آج کے دن پانی سے دھویا ہے، اس کو کل کے دن اپنی رحمت سے دھو دیجئے۔ جس جسم کو آپ نے دنیا میں مادی اعتبار سے پاک کیا ہے، اس کو قیامت کے دن اپنی رحمت اور مغفرت کے نورانی غسل سے پاک کر دیجئے۔

جب ظاہری وضو کے ساتھ یہ باطنی وضو مل جائے تو یہی وہ وضو ہے جس کے بعد آدمی کے لیے جنت کے سب دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جس دروازہ سے چاہو داخل ہو جاؤ۔

جسمانی وضو جسم کی پاکی ہے، اور روحانی وضو روح کی پاکی۔

نماز میں خشوع

"نماز دراصل وہی ہے جو خشوع کی نماز ہو" ایک صاحب نے کہا "میں جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو بہت کوشش کرتا ہوں کہ خشوع کے ساتھ نماز پڑھوں۔ مگر میری نماز خشوع کی نماز نہیں بنتی۔"

جواب یہ ہے کہ خشوع کی نماز اس طرح کسی کو حاصل نہیں ہوتی کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہو تو اپنے اوپر خشوع طاری کرنے کی کوشش کرے۔ نماز کا خشوع دراصل ایک مسلسل واقعہ کا وقتی ظہور ہے۔ آدمی جب نماز سے پہلے کی زندگی میں اللہ کے آگے اپنے کو جھکائے ہوئے ہو تو اس کا یہ جھکاؤ اس کی نماز میں مزید کیفیات کے ساتھ ابھر کر وہ چیز بن جاتا ہے جس کو خشوع کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ نماز سے باہر غیر خاشعانہ زندگی گزار رہا ہو تو نماز میں وقتی طور پر وہ خاشع نہیں بن سکتا۔ ایک شخص ہے جس سے کسی کو محبت ہے تو اس محبت کرنے والے کے ساتھ ہی یہ واقعہ پیش آئے گا کہ اس کی یاد سے اس کا دل بھر آئے۔ اس کے برعکس جس کو اس شخص سے کوئی لگاؤ نہ ہو وہ وقتی تدبیر سے اس کی خاطر رونے والا نہیں بن سکتا۔

ایک شخص لوگوں کے درمیان تواضع کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص ڈھٹائی کا۔ ایک شخص معاملات میں انصاف کرتا ہے اور دوسرا بے انصافی سے پیش آتا ہے۔ ایک عاجزانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہے اور دوسرا متکبرانہ نفسیات کے ساتھ۔ ایک شخص اعتراف و تسلیم کو اپنا طریقہ بنائے ہوئے ہے اور دوسرا ہٹ دھرمی اور انکار کو، تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں کی نمازیں یکساں قسم کی ہوں۔ ان میں صرف پہلا شخص ہے جس کی نماز خشوع کی نماز بنے گی۔ دوسرا شخص خواہ کتنا ہی چاہے یہ ناممکن ہے کہ وقتی طور پر ہاتھ باندھ کر اور قبلہ رو ہو کر وہ اپنی نماز کو خشوع کی نماز بنائے۔ خشوع کی نماز دراصل خاشعانہ زندگی کا ایک وقتی مظہر ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں خاشع نہ بنا ہو وہ کبھی خشوع کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔

مجھے ایک بار معلوم ہوا کہ ایک محلہ کے دو مسلمانوں میں جھگڑا ہے۔ جھگڑا صرف شان کا تھا نہ کہ کسی واقعی مسئلہ کا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ان میں سے ایک شخص کے پاس گیا جو حیثیت میں زیادہ بڑے تھے۔ ہم نے ان کی بنائی ہوئی شاندار مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ یہیں مسجد میں مذکورہ بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے۔ مگر جب ہم نے بتایا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ آپ سے درخواست کریں کہ آپ فلاں مسلمان سے اپنا جھگڑا ختم کر دیں تو اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کسی قیمت پر اپنے مسلمان بھائی کے آگے "جھکنے" پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی گفتگو سے ان کی جس نفسیات کا اندازہ ہو رہا تھا وہ یہ تھی کہ ——— میرے پاس پیسہ ہے۔ میرے ساتھ اعوان و انصار ہیں۔ میں نے ایک شاندار مسجد کھڑی کر کے جنت خرید لی ہے، پھر مجھے کسی کے آگے جھکنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر یہی نفسیات سب سے زیادہ خشوع کی قاتل ہے۔ جو شخص بندوں کے درمیان جھکی ہوئی زندگی گزار نہ رہا ہو وہ خدا کے سامنے بھی جھکنے والا نہیں بن سکتا۔ جو شخص اپنی صبح و شام کی زندگی میں خاشع نہ ہو وہ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے بھی خشوع کا تجربہ نہیں کر سکتا۔

اللہ کے لئے جھکنے والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا اور لوگ سجدہ کے لئے بلائے جائیں گے تو وہ لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے جو اللہ کے سچے بندے نہ بنے تھے۔ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی اور ان پر ذلت چھارہی ہوگی۔ یہ حال ان لوگوں کا ہوگا جن کو دنیا میں سجدہ کے لئے بلایا جاتا تھا مگر وہ سجدہ نہ کرتے تھے (قلم ۴۲) قیامت میں انسان کو جو رسوائی اور عذاب ہوگا اس کی سب سے بھیانک صورت وہ ہوگی جب کہ مالک کائنات اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ وہ خدا جس نے ہم کو پیدا کیا، جس کے کھلانے سے ہم کھاتے ہیں اور جس کے چلانے سے ہم چلتے ہیں۔ جس نے ہم کو وہ سب کچھ دیا ہے جو ہمارے پاس ہے۔ ایسا عظیم اور محسن خدا بے پردہ انسان کے سامنے ہوگا۔ ایک طرف انسان ہوگا جس کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ دوسری طرف خدا ہوگا جس کے پاس ساری طاقتیں ہیں۔ انسان کا عجز اور خدا کی قدرت دونوں اپنی کامل صورت میں سامنے ہوں گی۔ اس وقت انسان چاہے گا کہ خدا کی عظمت وجلال کے آگے جھک جائے مگر وہ جھک نہ سکے گا۔ وہ چاہے گا کہ اس کی خدائی کے آگے اپنی بندگی کا اظہار کرے مگر وہ اس اظہار پر قادر نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اپنے آقا اور محسن کے لئے حمد کے کلمات ادا کرنے سے بھی اس کی زبان گونگی ہوجائے گی۔ ایک طرف اللہ کے سچے بندے اپنے رب کے آگے اپنے کو ڈال کر حقیقت کا اعتراف کررہے ہوں گے۔ دوسری طرف وہ ذلت ورسوائی کا مجسمہ بنا ہوا کھڑا ہوگا۔ یہ ایسا ہولناک لمحہ ہوگا کہ انسان چاہے گا کہ کاش زمین پھٹ پڑے اور وہ اس کے اندر دھنس جائے۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوسکتی ہے کہ بندہ اپنے خالق اور مالک کے سامنے ہو مگر وہ اس کے آگے اپنی بندگی کا اقرار نہ کرسکے۔ واضح ہو کہ یہ حال صرف معروف قسم کے کافروں یا بے نمازیوں کا نہ ہوگا بلکہ ان لوگوں کا بھی ہوگا جو محض ظاہری سجدہ کرتے تھے، ان کی روح اللہ کے لئے ساجد نہیں بنی تھی۔ جنھوں نے وہ سجدہ نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے۔ وہ ہمہ تن اس کے آگے جھک جائے۔ بخاری نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

یکشف ربنا عن ساقہ فیسجد لہ کل مومن و مومنۃ ویبقی من کان یسجد فی الدنیا ریاء وسمعۃ فیذھب لیسجد فیعود ظھرہ طبقا واحدا (تفسیر ابن کثیر)

اللہ قیامت کے دن اپنے آپ کو ظاہر کرے گا۔ اس وقت مومن مرد اور عورتیں اللہ کے لئے سجدہ میں گر جائیں گے مگر جو شخص دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لئے سجدہ کرتا تھا وہ سجدہ میں جانا چاہے گا مگر سجدہ نہ کرسکے گا۔ اس کی پیٹھ اکڑ جائے گی۔

زندگی میں بار بار وہ لمحہ آتا ہے جب کہ ایک طرف آدمی کی انا ہوتی ہے اور دوسری طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر جو شخص انانیت کا راستہ اختیار کرے اور اللہ کے حکم کے آگے نہ جھکے اس نے اللہ کو سجدہ نہیں کیا۔ اگر وہ متعین اوقات میں بظاہر سجدہ کررہا ہو تب بھی حقیقت کے اعتبار سے وہ سجدہ نہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس نے ایسا سجدہ کیا ہے جو دنیا میں دیکھنے اور سننے والوں کو تو سجدہ معلوم ہوتا ہے مگر اللہ کی نظر میں وہ سجدہ نہیں۔ ایسے تمام لوگ آخرت میں اس اصلی حالت میں نمایاں ہوجائیں گے جہاں وہ باعتبار حقیقت دنیا میں تھے۔ دنیا میں ان کے سامنے اللہ کا حکم آیا مگر انھوں نے اس کو نظر انداز کیا۔ دنیا

ہیں وہ وقت آیا جب کہ ان کو اللہ کے خوف سے جھک جانا چاہئے تھا مگر اس وقت انھوں نے سرکشی دکھائی۔ دنیا میں انھوں نے اس حق کا انکار کیا جو اللہ نے اپنی سنت کے تحت اپنے ایک بندے کی زبان پر جاری کیا تھا۔ وہ اپنے عزت و وقار اور اپنے دنیوی مفاد کو سنبھالنے میں مشغول رہے۔ ایسے لوگ گویا اسی دنیا میں سجدہ کے وقت سجدہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی یہی حالت آخرت میں کھل کر سامنے آجائے گی۔ دنیا میں ان کے دکھانے اور سنانے والے سجدے آخرت کے حقیقی عالم میں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔ آخرت میں اللہ کے آگے جھکنا کسی انسان کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ اس اعلیٰ اعزاز کے حق دار وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہو کہ وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔

عبادت خانہ میں آدمی اللہ کے سامنے جو "سجدہ" کرتا ہے وہ باعتبار ظاہر اقرار سجدہ ہے نہ کہ ثبوت سجدہ۔ آدمی عبادت کے وقت سجدہ کر کے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے آگے جھکنے والا ہے مگر اس اقرار کا ثبوت اس کو بندوں کے ساتھ معاملات میں دینا ہے۔ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں جب تک وہ "جھکنے" کا رویہ اختیار نہ کرے اس کا اقرار بے ثبوت رہتا ہے اور بے ثبوت اقرار کی کوئی قیمت اللہ کے یہاں نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اللہ وہ نہیں کہ مسلمانوں کو چھوڑ دے اس حالت پر جس پر کہ تم ہو جب تک وہ جدا نہ کر دے ناپاک کو پاک سے (آل عمران ۱۷۹) گویا ایمان قبول کر کے آدمی "نماز روزہ" کی جو عام زندگی اختیار کرتا ہے اسی سے اس کے لئے جنت کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ لازماً اس کو جانچا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا نماز روزہ حقیقی نماز روزہ ہے یا "دیکھنے اور سننے والا" نماز روزہ ہے۔ یہ جانچ کہاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود سامنے نہیں آتا نہ خدا کے فرشتے کوئی قلب نما آلہ لے کر آسمان سے اترتے۔ یہ جانچ انسان اور انسان کے معاملات میں ہوتی ہے۔ آدمی نماز کے ذریعہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے جھک جانے والا ہے۔ روزہ کے ذریعہ وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے ڈر سے اس کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دینے والا ہے۔ اس اقرار کا عملی امتحان انسانی تعلقات میں ہوتا ہے۔

انسان اور انسان کے درمیان بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک حق کا معاملہ آجاتا ہے۔ وہاں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے۔ خواہ یہ جھکنا بظاہر ایک کمزور انسان کے آگے جھکنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔ ایسے موقع پر آدمی اگر جھک جائے تو گویا وہ اللہ کے آگے عملی طور پر جھک گیا۔ اس نے نماز میں کئے ہوئے اپنے اقرار سجدہ کو سچا ثابت کیا۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک حق کا معاملہ جو بظاہر کسی انسان کی نسبت سے پیش آیا ہے اس کو وہ محض انسان کا معاملہ سمجھ لے اور عزت و وقار کا خیال اس کو سرکشی پر آمادہ کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جانچ کے وقت وہ اللہ کے آگے نہیں جھکا، اس نے اپنے اقرار سجدہ کا عملی ثبوت نہیں دیا۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان معاملات میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ جائز اور ناجائز کے مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے اس کے لئے ایک رویہ ظلم کا رویہ ہوتا ہے اور دوسرا انصاف کا رویہ۔ ایسے موقع پر آدمی اگر خدا کے منع کئے ہوئے طریقہ سے رک جائے اور اپنے کو صحیح اور منصفانہ رویہ کا پابند بنائے تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ روزہ رکھ کر اس نے اطاعت الٰہی کا جو اقرار کیا تھا اس کو اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔ اس نے اپنے اقرار روزہ کا عملی ثبوت دے دیا۔ اس کے برعکس اگر معاملہ کے وقت اس پر مفاد اور مصلحت کا خیال غالب آجائے، وہ انصاف کے طریقے کو چھوڑ کر ظلم اور بے راہ روی کا طریقہ اپنا لے تو گویا اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی۔ اس نے اپنے اقرار روزہ کا عملی ثبوت نہیں دیا۔

بندہ کو اپنے رب کے سامنے جو "سجدہ" کرنا ہے اس کے تین خاص مواقع ہیں۔ ایک موقع وہ ہے جس کو اعتراف حق کہا جاسکتا ہے۔ اللہ اپنے کسی بندے کی زبان سے جب حق کا اعلان کرائے تو لوگوں کے اوپر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس پر لبیک کہیں۔ وہ اپنے رب کی آواز کو پہچانیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو ان کی مثال اس بدقسمت بچہ کی ہوگی جو اپنے مہربان باپ کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو جائے اور اس کی آواز کو سننے کے لئے اپنے کان کو بہرا کرے۔ خدا کی آواز اگرچہ ایک انسان کی زبان سے بلند ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جس کی تصدیق سارے زمین و آسمان کر رہے ہوتے ہیں اور آدمی کی اپنی فطرت پوری طرح جس کا ساتھ دے رہی ہوتی ہے۔ ایسی آواز کے آگے نہ جھکنا اتنا بڑا انکار سجدہ ہے جس کے بعد ظاہری سجدوں کی کوئی قیمت نہیں۔ سجدہ کے جانچ کا دوسرا میدان اللہ کی راہ میں قربانی ہے۔ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ وقت کے تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرکے اس کا دین لوگوں تک پہنچایا جائے۔ دین کی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کا ممکن انتظام کیا جائے۔ کچھ مخالفین اگر خدا کے دین کو دبانا چاہیں تو اللہ کے وفادار بندے کھڑے ہوکر دین کی طرف سے دفاع کریں خواہ اس راہ میں ان کو اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑے۔ یہ دین کے لئے قربانی کے مواقع ہیں۔ جو لوگ ان مواقع پر اپنے جان و مال کو پیش کریں وہ جانچ میں پورے اترے اور جو لوگ اپنے جان و مال کو دین کی ضرورتوں میں نہ دیں وہ جانچ میں ناکام ہوگئے۔ "سجدہ" کے امتحان کا تیسرا میدان روزمرہ کے انسانی تعلقات ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان معاملہ کرتے ہوئے جب بھی ایسا ہو کہ دو قسم کا رویہ سامنے آجائے۔ ایک وہ ہو جس کا حکم اللہ نے دیا ہے، دوسرا وہ ہو جو اپنے جی کی خواہش کے مطابق ہے۔ اس وقت جو شخص اللہ کے حکم کے آگے جھک گیا وہ اللہ کے آگے سجدہ کرنے والا بنا اور جو شخص اپنے جی کی خواہش پر چلا اس نے گویا سجدہ سے انکار کردیا۔

نماز میں رکوع کے لئے جھکنا اور سجدہ کے لئے گر پڑنا اگر حقیقی معنوں میں جھکنا اور گر پڑنا ہو تو مسجد کا سجدہ اور مسجد کے باہر کا سجدہ ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے۔ بلکہ دونوں ایک ہی واقعہ کی دو مختلف صورتیں بن جاتی ہیں۔ اسی طرح روزہ میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑنا اگر سچے شعور اور جذبہ کے ساتھ ہو تو رمضان کے مہینے میں خدا کی ممنوعات کو چھوڑنا اور اس کے بعد زندگی کے معاملات میں خدا کی ممنوعات کو چھوڑنا دو الگ الگ چیزیں نہیں رہتیں۔ بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رخ بن جاتے ہیں۔ جو شخص اس طرح سجدہ کرنے والا اور اس طرح روزہ رکھنے والا بن جائے وہ اللہ کی یاد میں جینے لگتا ہے، وہ آخرت کی فضاؤں میں سانس لینے لگتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے اللہ کے داعی کو پہچان کر اس کا اعتراف کرلینا یا اللہ کے دین کے لئے قربانی دینا ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی شخص کا اپنے محبوب بیٹے کو پہچاننا اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردینا۔

آخرت کا دن سچائی کے اعتراف کا دن ہے، اس دن وہی لوگ سچائی کے اعتراف کی توفیق پائیں گے جنھوں نے دنیا میں سچائی کے اعتراف کا ثبوت دیا ہو۔ آخرت کا دن مالک کائنات کے آگے جھکنے کا دن ہے، اس دن وہی لوگ مالک کائنات کے آگے جھکنے کے اہل ہوں گے جو دنیا کے معاملات میں اس کے آگے جھکنے والے بنے ہوں۔ آخرت کا دن اللہ کی رحمتوں میں شامل ہونے کا دن ہے۔ اس دن وہی لوگ اللہ کی نعمتوں میں شامل ہوں گے جنھوں نے اس وقت اللہ کی پکار پر لبیک کہا ہو جب کہ اللہ ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ آخرت کا دن وہ دن ہے جب کہ اللہ اپنی تمام نعمتیں اپنے بندوں پر انڈیل دے گا، ایسے انعام میں حصہ پانے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جس نے دنیا میں اپنے تمام اثاثہ کو اللہ کی راہ میں قربان کردیا ہو۔

تہجّد کی حقیقت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ: ومن الليل فتهجّد به نافلةً لك۔ یعنی رات کو تہجد پڑھو، یہ نفل ہے تمہارے لئے (الاسراء: ۷۹)
عربی زبان میں نافلہ کے معنی زائد کے ہوتے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ نافلۃ وہ ہے جو اصل سے زائد ہو (والنافلة ما كان زيادةً على الاصل) لسان العرب ۱۱/۶۷
اِس اعتبار سے "نافِلۃً لک" کا مطلب ہوگا "زائدۃً لکَ"، یعنی تہجد کی نماز تمہارے لئے پانچ نمازوں پر زائد ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے پانچ نمازوں کو اپنے بندوں کے اوپر فرض قرار دیا ہے (خمس صلوٰت فرضَهن الله على العباد) اور تہجد کی نماز کی حیثیت زائد نماز کی ہے۔
یہ انسان کی ایک فطری خواہش ہے کہ جس سے اس کو قلبی لگاؤ ہو اس کے معاملہ میں وہ مقرر فرائض سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا ہے۔ تہجد کی نماز بندہ کی اِسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہے۔ عمومی طور پر اس صلاۃِ زائد کا بہترین وقت رات کا آخری پہر ہے۔ اس وقت آدمی ایک نیند لیکر تروتازہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ان پرسکون لمحات کو کچھ دیر کے لئے خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ فجر سے پہلے چند رکعت نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔
مگر بعض انسانوں کے احوال کے اعتبار سے اس صلاۃِ زائد کے لئے دوسرے اوقات بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص رات کو دیر میں سویا۔ اس کی نیند دیر میں کھلی۔ اس نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ اب وہ اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرنے لگا۔ ایسے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاۃِ زائد کو اپنے ان پرسکون لمحات میں ادا کرے۔
زائد کا یہ اصول ہر معاملہ میں ہے۔ تجدیدِ کلمہ گویا شہادتِ زائد ہے۔ تہجد اسی طرح صلاۃِ زائد ہے۔ نفل روزہ صومِ زائد ہے۔ انفاقِ عام کی حیثیت زکاۃِ زائد کی ہے۔ عمرہ گویا حجِ زائد ہے۔ یہی معاملہ تمام اسلامی اخلاق اور اسلامی اعمال کا ہے۔
عملِ زائد میں ایک خاص لذت ہے جو عملِ زائد ہی میں ملتی ہے، کسی اور طرح اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

دعاء

دعا کا تصور عام لوگوں کے ذہن میں تقریباً وہی ہے جو "عاملین" کے یہاں پُراسرار کلمات کا ہوتا ہے۔ عامل یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں الفاظ کسی خاص ترتیب یا خاص تعداد میں زبان سے ادا کر دیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں صورت میں برآمد ہوگا۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ دعا الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام ہے جس میں خاص تاثیرات چھپی ہوئی ہیں۔ اگر آدمی دعا کے ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر دے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام تاثیرات لازماً ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے لفظی مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جو احساس احتیاج کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور پھر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔

قرآن میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں (مثلاً حضرت موسیٰ کی دعا، اصحاب کہف کی دعا، امرأۃ فرعون کی دعا) یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ انبیاء کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ مختلف علاقوں میں آئے اور وہ جہاں آئے وہیں کی مقامی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی دعا ان کی اپنی مادری زبان (مقامی زبان) میں ہوتی تھی نہ کہ عربی زبان میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ان کی دعا صرف معناً مذکور ہے نہ کہ لفظاً۔

اسی طرح حدیث میں بہت سے انبیاء کی دعائیں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی یہ دعا جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو سکھائی:

> اللّٰھم فارجَ الھَم و کاشفَ الغمِّ و مجیبَ دعوةِ المضطرِّین رحمٰنَ الدنیا و الآخرة رحیمَھما انت ترحمنی فارحمنی برحمةٍ تُغْننی بھا عن رحمةِ مَنْ سواك (رواہ البزّار والحاکم والاصبھانی)

اے اللہ، مصیبت کو ہٹانے والے اور غم کو دور کرنے والے اور مجبور کی پکار کو سننے والے، دنیا اور آخرت کے رحمان اور رحیم، تو ہی دونوں کا رحمان و رحیم ہے پس تو مجھ پر ایسی رحمت فرما جو مجھے تیرے سوا دوسروں سے مستغنی کر دے۔

ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی زبان عربی نہیں تھی اس لئے یقینی طور پر یہ دعا انھوں نے اس زبان میں بتائی جو ان کی اور حواریوں کی پیدائشی زبان تھی۔ حدیث میں یہ دعا اگرچہ عربی زبان میں نقل ہوئی ہے مگر یہ نقل بالمعنی ہے نہ کہ نقل بالالفاظ۔

آپ اپنے رب سے امید وار ہیں کہ وہ آپ کی کوتاہیوں کو نہ دیکھے بلکہ اپنی شان کریمی کے تحت آپ سے معاملہ فرمائے۔ اگر آپ فی الواقع اس پکار میں سچے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دنیا کی زندگی میں جب آپ کا معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے اوپر آپ قابو یافتہ ہوں تو آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی بےبسی یاد آجائے اور آپ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کریں۔ آپ کو اللہ کے عذاب کا ڈر ہے۔ آپ اس کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سے دعا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ جب کوئی انسان آپ کی گرفت میں آجائے تو آپ اس کے ساتھ غصہ اور انتقام کے تحت کارروائی نہ کریں بلکہ فیاضی اور حسن سلوک کے ساتھ معاملہ کر کے اللہ سے کہیں کہ خدایا تو بھی مجھ سے فیاضی کا معاملہ فرما۔ آپ اللہ کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف کر رہے ہیں، اس اعتراف میں آپ اس وقت سنجیدہ ہیں جب کہ آپ کا یہ حال ہو کہ آپ ایک انسان پر قدرت پالیں اور اس پر اپنی کبریائی کا مظاہرہ کر سکتے ہوں مگر اس وقت آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت یاد آجائے اور آپ اپنے رب سے یہ کہتے ہوئے اس شخص کو چھوڑ دیں کہ خدایا میں نے اس سے درگزر کیا تو بھی مجھ سے درگزر فرما۔"

اس کے برعکس اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ اللہ کے سامنے عاجزی کے کلمات دہرائیں اور اس کے بعد بندوں کے ساتھ گھمنڈ اور سرکشی کا طریقہ اختیار کریں۔ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں اور اپنے بھائی کی خطائیں معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اللہ سے امید وار ہوں کہ وہ آپ کی حاجتیں پوری کرے اور آپ کا سابقہ جب کسی دوسرے محتاج انسان سے پڑے تو اس کی حاجت پوری کرنے کا کوئی جذبہ آپ کے اندر نہ ابھرے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دعا کے ساتھ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) نہیں کر رہے ہیں۔ آپ اپنی دعا میں محسن نہیں ہیں۔ ایسی دعا کی اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ ایسی دعا حقیقۃً دعا نہیں بلکہ سوانگ ہے اور سوانگ کسی شخص کو سزا کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام کا۔

دعا کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ برکت والے الفاظ ہیں، ان کو رٹ کر صحت ادا کے ساتھ دہرا دو اور پھر ان کے جادوئی اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ خدا اور بندے کا معاملہ اس قسم کا مشینی معاملہ نہیں ہے۔ خدا الفاظ کو نہیں خود آپ کی ہستی کو دیکھتا ہے۔ خدا کو وہ کلمات درکار ہیں جو آدمی کی اپنی پکار بن کر نکلے ہوں۔ جو اس واقعہ کا ایک فطری اظہار ہوں کہ بندہ صرف ایک اللہ سے ڈرتا ہے اور صرف اسی سے امید رکھتا ہے۔ اس کے احساسات اپنے رب سے اس طرح وابستہ ہو گئے ہیں کہ ہر آن وہ اس سے مصروفِ کلام رہتا ہے، کبھی دل سے اور کبھی زبان سے۔ دعا دراصل پگھلے ہوئے دل کا بیتابانہ طور پر باہر نکل آنا ہے۔ جب کوئی بندہ اس معنی میں دعا کرنے والا بن جائے تو اس کا پورا وجود دعا میں ڈھل جاتا ہے۔ دعا کے الفاظ اور اس کی ہستی الگ الگ نہیں رہتے۔ وہ اندر سے بھی وہی ہوتا ہے جو بظاہر دعا میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی دعا جس طرح خدا کے سامنے اس کے سوال کا مظہر ہوتی ہے اسی طرح وہ بندوں کے مقابلہ میں اس کے کردار کو بتاتی ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت ہے جو خدا کے سامنے تضرع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور بندوں کے مقابلہ میں تواضع اور عدم استکبار کی صورت میں۔

رمضان کا روزہ

دہلی کے ایک مسلمان تاجر جناب محمد عثمان صاحب سے ۲۹ نومبر ۱۹۹۲ کو ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ روزہ ہر قسم کی ایمرجنسی کا سامنا کرنے کی تربیت ہے۔ روزہ کی اس تشریح کی تصدیق ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر کے اصل معنی ہیں رک جانا۔ صبر کا لفظ جزع کا نقیض ہے۔ الجوهری نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے جزع کے وقت اپنے آپ کو تھامنا (الصبر حبس النفس عند الجزع)

زندگی میں ہمیشہ خلافِ مزاج باتیں پیش آتی ہیں۔ زندگی نام ہے ناموافق باتوں کا سامنا کرتے ہوئے سفرِ حیات طے کرنے کا۔ جو آدمی جتنا زیادہ بامقصد اور جتنا زیادہ بااصول ہو اتنا ہی زیادہ اس کو اپنی پسند کے خلاف چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس صفت کی ضرورت دنیوی معاملات میں بھی پیش آتی ہے اور دینی معاملات میں بھی۔ روزہ اسی قسم کی صابرانہ زندگی کی تربیت ہے۔ روزہ میں آدمی کے معمولات ٹوٹتے ہیں۔ وقت پر کھانا اور وقت پر سونا اس کو میسر نہیں آتا۔ مسلسل ایک مہینہ تک اس کو بھوک، پیاس، بے خوابی جیسے تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ طبیعت کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے اس کے اندر جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر اس پر بھی اس کو صبر کر لینا پڑتا ہے۔

برداشت کی اس زندگی کو خود اپنے ارادہ سے اختیار کرنے کا نام روزہ ہے۔ لوگ مجبورانہ صبر کرتے ہیں، روزہ دار اختیارانہ صبر کرتا ہے۔ جن چیزوں کو لوگ دباؤ کے تحت چھوڑتے ہیں، روزہ دار ان چیزوں کو اصول کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ جس صابرانہ روش کو لوگ ذاتی مفاد کے لیے اختیار کرتے ہیں، اس صابرانہ روش کو روزہ دار خدا کی مرضی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کا صبر اگر اپنی ذات کے لیے ہے تو مومن کا صبر خداوند ذوالجلال کے لیے۔ روزہ ایک بے روح رسم نہیں، وہ ایک زندہ تربیت ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں جو آدمی اس کورس کو صحیح طور پر مکمل کرے وہ اس کے بعد پورے سال کے لیے ایک ایسا انسان بن جائے گا جو ہنگامی حالات میں بھی معتدل زندگی گزارے، جو بے صبری کے مواقع پر بھی صابر انسان بنا رہے۔

روزہ کا مقصد آدمی کی روحانیت کو جگانا اور اس کو ربّانی انسان بنانا ہے۔

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ۔۔۔ تم لوگ ربّانی بنو (آل عمران ۷۹) اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رب والے یا اللہ والے بن کر زندگی گذارو۔ خود پرستی کی زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی زندگی اختیار کرو۔

دنیا میں زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اپنی خواہشوں کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی مرضی کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ ربّانی انسان وہ ہے جو خدا کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اسی کی یاد میں جیئے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کی مرضی کو جاننے کی کوشش کرے اور جو خدا کی مرضی ہو اس پر اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ اس کے برعکس غیر ربّانی انسان وہ ہے جو اپنے آپ میں جیتا ہو۔ جس کے لئے اس کی خواہشیں ہی سب کچھ ہوں۔ جو اپنی خواہشوں کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہو۔

رمضان کے مہینے کا روزہ کسی آدمی کو ربّانی انسان بنانے کی تربیت ہے۔ روزہ آدمی کی ذاتی خواہشوں پر پابندی لگاتا ہے۔ روزہ یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے جینے کے بجائے خدا کے لئے جیو۔ اپنی خواہشوں کو سب کچھ سمجھنے کے بجائے صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنالو۔

روزہ آدمی کو ربّانی انسان بنانے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دنیا اور آخرت کی کامیابیاں مقدر کی گئی ہیں۔

روزہ کیا ہے .....

روزہ اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے

نظم یا ڈسپلن ہر معاملہ میں کامیابی کے لئے ضروری ہے، خواہ وہ دنیا کا معاملہ ہو یا دین کا معاملہ۔ نظم یا ڈسپلن صحتِ کار کی ضمانت ہے۔ کسی کام کی بخوبی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام میں نماز کو مقرر اوقات میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ اور دوسری عبادات بھی مقرر تاریخوں میں اور مقرر وقت پر ادا کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ تمام دینی اعمال کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم اور ڈسپلن کے بغیر کوئی بھی اسلامی عمل صحیح طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔

روزہ نظم اور ڈسپلن کی اسی اسپرٹ کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ رمضان کا پورا مہینہ روزہ دار کو سخت ڈسپلن کے تحت گذارنا ہوتا ہے۔ سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، غرض ہر مشغولیت کو ایک سخت قسم کے نظام الاوقات کے تحت انجام دینا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ایک منظم زندگی پورے مہینہ تک جاری رہتی ہے۔ اس طرح کی ایک ماہانہ زندگی آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں میں بھی نظم اور ڈسپلن کے تحت زندگی گذارے۔

روزہ ایک مومن کے لئے اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے۔ روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ ایک بااصول انسان بنا ہوا ہو۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے کنٹرول میں دیئے ہوئے ہو۔

روزہ خود انضباطی (سلف کنٹرول) کی مشق ہے۔ وہ ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔

فاقہ نہیں

۲۵ جنوری ۱۹۹۷ کو دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں روزہ پر ایک اجتماع تھا۔ اس موقع پر جناب سید حامد صاحب نے کہا کہ ایک بار دہلی میں ایک جلسہ تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی موجود تھے۔ اس موقع پر ایک تقریر ڈاکٹر تارا چند کی بھی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ سال کا پورا ایک مہینہ روزہ میں بتانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں ہے اس کے بارہ میں مسلمانوں کو نظر ثانی کرنا چاہیے۔ یہ اپنی کارکردگی کو گھٹانے کے ہم معنی ہے۔ یہ طریقہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔

میں نے اپنی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک غیر معقول اعتراض ہے۔ علمی حیثیت سے اس کے اندر کوئی وزن نہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ روزہ کوئی فاقہ کشی (starvation) نہیں ہے۔ روزہ دار ایک مہینہ کے دوران صرف یہ کرتا ہے کہ وہ دن میں نہ کھا کر رات کو کھاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض فرقے ایسے ہیں جو ۲۴ گھنٹہ میں صرف ایک بار کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ہر قسم کی ترقیاں حاصل کی ہیں۔ پھر ایک مہینہ کے لیے دن کے بجائے رات کو کھانا کیوں کر ترقی میں رکاوٹ بن جائے گا۔

روزہ دراصل اپنی غذائی عادتوں (food habits) پر کنٹرول کرنے کا نام ہے۔ اس کو ایک لفظ میں غذائی تنظیم (regulated eating) کہہ سکتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ جسمانی صحت کے لیے بہترین طریقہ ہے۔ منظم انداز میں خوراک لینے والے ہمیشہ صحت مند رہتے ہیں اور زیادہ کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر منظم خوراک لینے والے لوگ اپنی صحت کو خراب کر لیتے ہیں اور نتیجۃً اپنی کارکردگی کی مقدار کو بھی گھٹا لیتے ہیں۔

ماہ رمضان کے روزہ کا مطلب شاید مذکورہ قسم کے لوگ یہ لے لیتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک مہینہ تک مسلسل کھانا اور پینا چھوڑ کر فاقہ کی زندگی گزاریں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اسلامی حکم کا مطلب صرف یہ ہے کہ عام حالت میں اگر لوگ دن کو کھاتے ہیں اور رات کو نہیں کھاتے

تو رمضان میں ایک مہینہ کے لیے وہ اس ترتیب کو بدل دیں۔ یعنی دن میں نہ کھاکر رات کے اوقات میں کھائیں۔ روٹین میں اس قسم کی تبدیلی جسمانی اعتبار سے بھی مفید ہے اور روحانی اعتبار سے بھی۔

ماہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں یہ اصولی اور نظریاتی بات تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اصولی اور نظریاتی اعتبار سے ماہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں مذکورہ قسم کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل موجود نہیں۔

مگر یہ صرف اصول اور نظریے کی بات نہیں۔ عملی واقعات بھی اس کو بالکل بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ عملی واقعات سے میری مراد (روزہ داروں) کی تاریخ ہے۔ مسلمان پچھلے چودہ سو سال سے سال میں ایک مہینہ روزہ رکھتے چلے آرہے ہیں۔ مگر تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ اس روزہ نے کسی بھی درجہ میں ان کو کمزور نہیں کیا۔

اسلام کے دور اول میں اصحاب رسولؐ کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ یہ سب کے سب روزہ دار تھے، مگر انھوں نے تاریخ کا اہم ترین انقلاب برپا کیا۔ یہ اصحاب رسولؐ روزہ دار قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں عرب قبائل، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر سب کے سب غیر روزہ دار لوگ تھے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ پیش آیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ غیر روزہ داروں کے اوپر روزہ دار قوم نے کھلی فتح حاصل کی۔

اس کے بعد روزہ دار مسلمانوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، اور وقت کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ ایک شاعر نے بجا طور پر کہا ہے کہ :

نہ تھا پلّہ کسی ملّت کا دنیا میں گراں ہم سے

پھر یہی روزہ دار لوگ تھے جنھوں نے بغداد میں اس وقت کا سب سے بڑا علمی مرکز قائم کیا۔ انھوں نے اسپین میں وہ علمی ترقیاں کیں جو بعد کو یورپ کے سائنسی انقلاب کی بنیاد بنی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ آدمی کو کمزور نہیں کرتا۔ روزہ آدمی کو ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے طاقت ور بناتا ہے۔ نظریاتی مطالعہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے اور تاریخ کا عملی مطالعہ بھی۔

شکر گزاری

روزہ کا مہینہ روحانی تزکیہ کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ خدا سے قریب ہونے کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ ان صفات کی تربیت کا خصوصی مہینہ ہے جو کہ اسلام میں مطلوب ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں روزہ (فاسٹنگ) کے باب کے تحت درج ہے کہ اسلام میں رمضان کے مہینہ کو توبہ کے مہینہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور صبح سے شام تک مکمل فاقہ کیا جاتا ہے:

> The month of Ramadan in Islam is observed as a period of penitence and total fasting from dawn to dusk. (IV/62)

توبہ بلاشبہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ حتی کہ پیغمبر اسلام کو حدیث میں نبی التوبہ کہا گیا ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۰۵) توبہ اسلام کے پورے نظام سے اتنا زیادہ جڑا ہوا ہے کہ روزہ سمیت، کوئی بھی اسلامی عمل اس کی روح سے خالی نہیں۔

تاہم قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے اس کی جو خاص حکمت بتائی گئی ہے، وہ شکر اور تقویٰ ہے۔ قرآن کے مطابق، رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شکر اور تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔ (البقرہ)

قرآن کا ابتدائی نزول رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ اس بنا پر وہ اہل ایمان کے لئے شکر گزاری کا مہینہ قرار پایا۔ کیوں کہ یہ اللہ کی عظیم نعمت ہے کہ اس نے قرآن کی شکل میں وہ ہدایت نامہ اتارا جو انسان کے لئے سچا رہنما بن سکے۔

تقویٰ سے مراد محتاط زندگی ہے۔ انسان کے لئے دونوں جہان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں ہمیشہ احتیاط والا طریقہ اختیار کرے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے، اور روزہ کے ذریعہ لوگوں کو اسی محتاط زندگی کی تربیت دی جاتی ہے۔

روزہ سلف ڈسپلن کی سالانہ مشق ہے۔ روزہ اختیار کے باوجود بے اختیاری کا ایک تجربہ ہے۔ اسی آدمی کا روزہ سچا روزہ ہے جو روزہ کے عمل سے اس قسم کی ذاتی تربیت پا کر نکلے۔ جس کا روزہ اس کو حقیقی معنی میں شاکر اور متقی بندہ بنا دے۔

تقریر رمضان

پچھلے کچھ سالوں سے ہمارے یہاں افطار پارٹی کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر سال رمضان میں سیکڑوں کی تعداد میں اس طرح کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ ان افطار پارٹیوں میں لوگ جمع ہو کر کھاتے پیتے ہیں تفریحی باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی افطار پارٹیوں پر فارسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے :

تن پروریٔ خلق فزوں شد ز ریاضت — جز گرمیٔ افطار ندارد رمضان ہیچ

آج کے پروگرام کا یہ انداز نہایت صحت مند ہے کہ افطار پارٹی کے ساتھ یہاں اس اسلامی عبادت کے موضوع پر تقریروں کا پروگرام رکھا گیا۔ یہ ایک مفید طریقہ ہے۔ اس کے لیے میں پروگرام کے منتظمین کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے اجتماعات زیادہ سے زیادہ کیے جائیں اور مختلف مواقع کو اسلام کے مثبت تعارف کے لیے استعمال کیا جائے۔

اب مجھے روزے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہے۔ روزہ ایک سالانہ عبادت ہے جو رمضان کے مہینہ میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کا آغاز رمضان کا نیا چاند دیکھ کر ہوتا ہے۔ جب شعبان کا مہینہ ختم ہوتا ہے اور رمضان کی پہلی شام آتی ہے تو تمام آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں تاکہ وہ ہلالِ رمضان کو دیکھ سکیں۔ روزہ کی عبادت اگر شمسی مہینہ کی بنیاد پر قائم کی جاتی تو ایسا نہ ہوتا۔ کیوں کہ شمسی مہینہ کو علم الحساب کے ذریعہ مقرر کیا جاتا ہے نہ کہ آسمان میں نیا چاند دیکھ کر۔

یہ گویا رمضان کے مہینہ کا پہلا سبق ہے۔ اسی طرح رمضان یہ پیغام دیتا ہے کہ تم زمین سے اپنی نظریں اٹھاؤ اور آسمان کی طرف دیکھو۔ تم نیچے کی طرف دیکھنے والے نہ بنو بلکہ اوپر کی طرف دیکھنے والے بنو۔ تم مخلوقات کی سطح سے بلند ہو کر خدا کی سطح پر جینا سیکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فطرت کی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے کہ — سادہ زندگی اور اونچی سوچ :

Simple living and high thinking

اب میں روزہ کی حقیقت کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں کچھ باتیں کہوں گا۔

۱۔ قرآن میں جہاں روزہ کا حکم دیا گیا ہے وہاں ارشاد ہوا ہے کہ یہ حکم تم کو اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تاکہ تمہارے

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑے (مشکوٰۃ المصابیح ۱/۶۲۳)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ میں کھانے پینے کا ترک ایک علامتی ترک ہے۔ یہ علامتی ترک اس بات کا سبق ہے کہ آدمی ہر قسم کے جھوٹ اور برائی کو چھوڑ دے۔ وہ اپنے معاملات میں اخلاقی پابندی کا طریقہ اختیار کرے۔

اس طرح روزہ انسان کو سماج کا ایک صالح ممبر بناتا ہے۔ وہ انسان کو اس مقصد کے لیے تربیت دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اعلیٰ کردار کے ساتھ زندگی گزارے اور پست کرداری کا طریقہ چھوڑ دے۔

۳۔ حدیث میں روزہ کے مہینہ کو شہر المواساۃ (ھو شھر المواساۃ) کہا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کی ہمدردی کا مہینہ (مشکوٰۃ المصابیح ۱/۶۱۳)

اس پہلو کو دوسرے لفظوں میں انسانی خدمت کہا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے روزہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ روزہ دار کے اندر انسانیت کا درد پیدا کرے۔ وہ دنیا میں صرف اپنے لیے نہ جئے بلکہ دوسروں کے لیے جینا سیکھے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے فرمائے گا کہ میں تمہارے پاس بھوکا آیا مگر تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ کہے گا کہ خدایا تو تو رب العالمین ہے تو کیسے بھوکا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آئے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوک کی حالت میں تیرے پاس آیا تھا اگر تو اس کو کھلاتا تو مجھ کو تو اس کے پاس پاتا (صحیح البخاری، کتاب المرضیٰ)

انسان کے انسان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی ضروریات میں ان کے کام آئے۔ وہ سماج کے اندر اس طرح زندگی گزارے کہ دوسروں کی حاجتوں کو پورا کرنا بھی اس کی زندگی کے پروگرام کا ایک جزء بنا ہوا ہو۔ یہ انسانی صفت اس کے اندر ہو سکتی ہے جو دوسروں کی تکلیفوں کو اپنے سینے میں محسوس کرے۔ روزہ گویا یہی کیفیت پیدا کرنے کی ایک تربیت ہے۔ روزہ کے ذریعہ بھوک اور پیاس کے تجربہ کو انسان کا ذاتی تجربہ بنا دیا گیا۔ حاجت مند کے درد کو حاجت براری کرنے والے کے دل میں اتار دیا گیا تاکہ وہ انسانی خدمت کی راہ میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہو سکے۔

۴۔ رمضان کا ایک اور پہلو وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی سورۃ نمبر ۹۷ میں آیا ہے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر (شب قدر) میں اتارا۔ یعنی وہ رات جب کہ سال بھر کے متعلق

قضا و قدر کے محکم اور اٹل فیصلے زمین میں کام کرنے والے فرشتوں پر خدا کی طرف سے اتارے جاتے ہیں۔ یہ رات رمضان میں آتی ہے۔ چنانچہ رمضان کی آخری راتوں میں روزہ دار خصوصی طور پر عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ اس رات کے فیوض کو پا سکیں۔ اس سورت (القدر) کا ترجمہ یہ ہے :

ہم نے اس کو اتارا ہے شب قدر میں۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں۔ ہر حکم لے کر۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے، صبح نکلنے تک۔

اس سورۃ میں لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔ یہ مدت تقریباً ۸۴ سال بنتی ہے۔ یعنی وہ مدت جو کہ انسان کی اوسط عمر کی مدت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر شب قدر کی برکتوں کو پالے جو گویا روزے کی سعادتوں کا آخری نقطۂ عروج (culmination) ہے تو وہ تمام عمر کے لیے اصلاح یافتہ ہو جائے گا۔ اور اگر وہ شب قدر کی سعادتوں کو جزئی طور پر پائے تب بھی کم از کم سال بھر اس کی زندگی پر اس کے مبارک اثرات باقی رہیں گے۔ رمضان کے مہینہ کی اس اہم ترین رات کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ سلامتی ہی سلامتی ہے :

It is all peace till the rising of the dawn.

اس سے روزہ کا ایک اور اہم پہلو معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ روزہ کا مقصد آدمی کے اندر یہ صفت پیدا کرنا ہے کہ اس کی روح سراپا سلامتی بن جائے۔ وہ اپنے سماج کے اندر امن و سلامتی کے ساتھ رہنے لگے۔ سلامتی کی روح وہ ہے جو تکلیفوں میں بھی پر سکون رہے، مادی رغبتوں سے اوپر اٹھ جائے جو ناخوش گواریوں کے ماحول میں بھی خوش گوار جذبات کے ساتھ جینے لگے۔

جس انسان کے اندر سلامتی کی یہ صفت پیدا ہو جائے اس کا وجود پورے ماحول کے لیے سلامتی بن جاتا ہے۔ وہ سماج کا ایک ایسا پر امن شہری بن جاتا ہے جس سے دوسروں کو صرف امن و سلامتی ملے۔ حتی کہ دوسرے لوگ اگر اس کو ستائیں تب بھی وہ اپنی پر امن روش پر پوری طرح قائم رہے۔

خدا اپنے بندوں سے قریب ہے، ہر چیز سے زیادہ قریب۔ خدا اپنے بندے سے اتنا زیادہ قریب ہے کہ وہ ان کی پکار کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ قرآن میں خدا کا یہ تعارف کسی بندے کے لئے بے حد سکون بخش ہے کہ وہ اپنے رب کو براہ راست پکار سکتا ہے، وہ اپنے رب سے براہ راست اپنا مدعا بیان کر سکتا ہے۔

خدا بلاشبہ اپنے بندوں کے قریب ہے۔ مگر یہ قربت کسی بندے کے لئے ذاتی واقعہ اسی وقت بنتی ہے جبکہ اس پر بندگی کے حقیقی تجربات گزریں۔ جب اس پر احتیاج کی حالت طاری ہو۔ روزہ آدمی کو اسی موافقِ دعا تجربہ سے گزارتا ہے۔ وہ قربت خداوندی کی کیفیات پیدا کر کے آدمی کو سچا دعاگو بناتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا احساس بندگی کے تحت نکلنے والے الفاظ کا نام ہے، اور روزہ اسی احساس بندگی کو پیدا کرنے کی سالانہ تربیت۔ پانی کو نعمت کے طور پر محسوس کرنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی کو پیاس لگے اور ٹھنڈا پانی اس کی رگوں کو تر کر دے۔ جس آدمی پر پیاس کا تجربہ نہ گزرے وہ پانی کی نعمت کا احساس بھی نہیں کر سکتا۔

روزہ آدمی کے اندر پیاس پیدا کرتا ہے تاکہ جب وہ پانی پیئے تو وہ پانی کی نعمت پر سچا شکر ادا کر سکے۔ روزہ آدمی کو احتیاج کی حالت کا احساس دلاتا ہے، تاکہ جب اس کی احتیاج پوری ہو تو وہ بھرپور کیفیات کے ساتھ کہہ سکے کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے میری ضرورتوں کی تکمیل کا اتنا اعلیٰ انتظام فرمایا۔

روزہ اور دعا

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں رمضان کے روزہ کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ عین اسی کے درمیان دعا کی آیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: اور جب میرے بندے تم سے میری بات پوچھیں تو میں بالکل قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں۔ امید ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے (البقرہ ۱۸۶)

یہ ترتیب بتاتی ہے کہ روزہ اور دعا کے درمیان خاص تعلق ہے۔ روزہ دار انسان عین اسی وقت ایک دعاگو انسان ہوتا ہے۔ روزہ دعا کے ساتھ خصوصی مناسبت رکھتا ہے۔

دعا کیا ہے۔ دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے۔ وہ نفسیاتی سوز کا ایک لفظی اظہار ہے۔ روزہ یہی تڑپ اور یہی سوز و گداز پیدا کرتا ہے۔ روزہ آدمی کے اندر اخبات کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے آدمی کے اندر سچی دعا ابلنے لگے۔

شام کو روزہ کی تکمیل کے وقت جب آدمی یہ کہتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا، اور تیرے حکم سے میں نے افطار کیا، تو یہ صرف کچھ الفاظ نہیں ہوتے۔ یہ دراصل ایک روحانی تجربہ ہوتا ہے جو لفظوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح مہینہ بھر روزہ آدمی کے اندر عجز و گداز کی کیفیات پیدا کرتا ہے اور اس کے تحت آدمی بار بار خصوصی دعاؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ روزہ کا مہینہ پورا ہو جاتا ہے، اس وقت خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ خدایا، تو میرے بقیہ تمام مہینوں کو روزہ کے اس مبارک مہینہ کے تابع کر دے۔ خدایا، میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی، اب تو بھی میری دعاؤں کو قبول کر لے۔

روزہ گویا دعا کی تیاری ہے۔ روزہ آدمی کو چارج کرتا ہے تاکہ وہ حقیقی طور پر دعا کے قابل ہو سکے۔ وہ مطلوب کیفیات کے ساتھ خدا کو پکارنے لگے۔

روزہ کیا ہے

روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی مشق ہے۔ روزہ کے دنوں میں آدمی خود اپنے ارادہ اور فیصلے سے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جب شام کا وقت آتا ہے تو دوبارہ وہ خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو خود انضباطی کی زندگی گزارنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ دار بن کر وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ سال کے بقیہ مہینوں میں وہ اپنے ہر معاملہ میں روزہ دارانہ زندگی گزار سکے۔

کائنات میں انسان کے سوا بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام مکمل طور پر خدا کے تحت ہیں۔ ہر چیز اپنے اختیار کو ترک کرکے خدا کے قانون کی پابندی کر رہی ہے۔ اللہ تعالی کو منظور ہے کہ انسان اطاعت کی اس روش کو خود اپنے ارادہ سے اپنے لئے اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو خدا کا پابند بنالے۔

اسی خود اختیار کردہ پابندی کی تربیت کے لئے روزہ کا نظام مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کوئی سالانہ رسم نہیں، وہ ایک سالانہ تربیت ہے۔ روزہ وقتی طور پر بھوک پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں۔ روزہ مستقل طور پر صبر و برداشت کی زندگی گزارنے کا ایک سبق ہے۔

روزہ میں آدمی کے سامنے کھانا اور پانی ہوتا ہے مگر بھوک پیاس کے باوجود وہ ان کو نہیں لیتا۔ اسی طرح یہ مطلوب ہے کہ آدمی کو خدا کی مرضی کے خلاف چلنے کا موقع ہو مگر خواہش کے باوجود وہ ایسے راستہ پر نہ جائے۔ آدمی کے لئے گھمنڈ کرنے کا امکان پوری طرح موجود ہو، مگر چاہنے کے باوجود وہ گھمنڈ کو چھوڑ کر تواضع کا طریقہ اختیار کرلے۔ آدمی کے لئے بے انصافی کے دروازے کھلے ہوئے ہوں مگر طبیعت کے تقاضے کے باوجود وہ زیادتی اور بے انصافی سے دور رہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس دنیا میں خود عائد کردہ پابندی کی ایک زندگی گزارے۔ روزہ میں یہ پابندی کھانے پینے کے معاملہ میں ہوتی ہے اور بقیہ زندگی میں یہ پابندی اخلاقی سلوک کے معاملہ میں۔

علامتی روزہ

رمضان کے مہینہ کا روزہ ایک اعتبار سے علامتی روزہ ہے۔ قرآن (البقرہ ۱۸۵) کے لفظوں میں وہ صوم یُسر ہے نہ کہ صوم عُسر۔ رمضان کے مہینہ میں جو روزہ رکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ دنوں تک کے لیے دن کے اوقات میں جسم کو کھانے اور پینے سے روک دیا جاتا ہے۔ کھانا اور پانی انسان کی ایک ضرورت ہے۔ اسی طرح انسان کی اور بھی اَن گنت ضرورتیں ہیں، محدود مدت کے لیے صرف ایک ضرورت پر پابندی عائد کرنا گویا صومِ یُسر ہے۔ اسی طرح اگر تمام ضرورتوں پر پابندی لگا دی جائے تو وہ صومِ عُسر کے ہم معنیٰ ہوگا۔

مگر انسان اپنے عجز کی بنا پر صوم عسر کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو صوم یسر کا حکم دیا۔ تاکہ وہ اپنی ایک ضرورت کے بارہ میں محدود پابندی کا تجربہ کرکے اپنے اندر اس احساس کو جگائے کہ رب العالمین اگر اسی طرح تمام ضرورتوں پر پابندی عائد کردے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ آدمی کے اندر زیادہ سے زیادہ شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

اب صوم عُسر کا تصور کیجئے ـــــ انسان کا نظام ہضم (میٹابلزم) اگر کام کرنے سے رک جائے۔ دل اگر خون کے دوران کو جاری نہ کرے۔ دماغ کا کمپیوٹر اگر اپنا کام بند کردے۔ طبیعت مدبرۂ بدن اگر اپنے عمل کو روک دے تو یہ سب صوم عسر ہوگا۔ اسی طرح جسم کے باہر سورج اگر روشنی اور حرارت ہماری طرف نہ بھیجے۔ اگر ہوا آکسیجن کی سپلائی نہ کرے۔ زمین اگر اپنی قوت کشش کو معطل کردے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جو گویا صوم عسر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر وہ پیش آجائیں تو انسان کی پوری زندگی تہہ و بالا ہو کر رہ جائے گی۔

یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے صوم عسر کا حکم نہ دے کر ہم کو صرف صوم یسر کا مکلف کیا۔ انسان اگر اس خدائی رحمت کا احساس کرکے اس پر سچا شکر ادا کرے تو اس کو نہ صرف صوم یسر کا اجر ملے گا بلکہ وہ صوم عسر کا عظیم تر ثواب بھی پائے گا۔ اسی لیے حدیث میں یہ بشارت آئی ہے کہ دوسرے تمام اعمال کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر صوم (روزہ) کا اجر لامحدود ہے، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو دیا جائے گا۔ یہ عظیم ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو جسمانی طور پر صوم یسر کا اہتمام کرنے کے ساتھ شعوری طور پر صوم عسر کا بھی تجربہ کرسکیں۔

دلیلِ نبوت

رمضان کا مہینہ اسلام میں روزہ کا مہینہ ہے۔ قرآن میں صوم رمضان کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر وہ فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو (البقرہ ۱۸۳)

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی چھوٹا یا بڑا مذہب ایسا نہیں ہے جس میں روزہ کا تصور موجود نہ ہو۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی طور پر روزہ کا رواج پایا جاتا ہے۔ انسانی معاشروں کے ایک مغربی عالم نے لکھا ہے کہ یہ مشکل ہوگا کہ کسی بھی ایسے مذہبی نظام کی نشاندہی کی جائے جس میں روزہ (fas n) کو بالکل ہی نہ مانا گیا ہو:

It would be difficult to name any religious system of any description in which it is wholly unrecognized. (X/193)

مزید یہ کہ عرب قبائل میں اس زمانہ میں جو مذہب تھا اس میں روزہ کا رواج پایا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے مشرکانہ سماج میں روزہ کا کوئی رواج موجود تھا:

We have no evidence of any practice of fasting in pre-Islamic pagan Arabia. (p. 133)

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے مذکورہ الفاظ محض سادہ الفاظ نہیں۔ بلکہ وہ دلیل نبوت ہیں۔ مواصلات اور معلومات کے جدید دور سے چودہ سو سال پہلے عرب کا ایک آدمی ہرگز یہ نہیں جان سکتا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ کا رواج کسی نہ کسی طرح پایا جاتا ہے۔ جب کہ حال یہ تھا کہ اپنے قریبی معاشرہ میں وہ ایسے عمل کا مشاہدہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کے پیغمبر تھے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو اُس وقت آپ کو اس عالمی واقعہ کی خبر دے سکے۔

عید الفطر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں کے لوگ ایک سالانہ تیوہار مناتے تھے۔ اس میں کھیل تماشا اور دنگل ہوا کرتا تھا۔ آپ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے اس سے بہتر دو تیوہار مقرر کئے ہیں ـــــــ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

عید الفطر کے معنی ہیں افطار کا تیوہار۔ یہ رمضان کا مہینہ ختم ہونے کے فوراً بعد آتا ہے۔ اس دن مسلمان آزادانہ طور پر کھاتے پیتے ہیں۔ خوش ہو کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ دو رکعت خصوصی نماز اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں۔ یہ گویا مہینہ بھر کی پابندی کے بعد آزادی کا دور شروع ہونے کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو عید الفطر کہا جاتا ہے۔

عید کے دن لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باہر آتے ہیں تو ہر طرف السلام علیکم، السلام علیکم کا ماحول قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح لوگوں میں خوش گوار تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ محبت اور ہمدردی کی روایتیں زندہ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے احترام کی قدریں فروغ پاتی ہیں۔ یہ احساس ابھرتا ہے کہ تمام انسان ایک وسیع کنبہ ہیں۔ اور سب کو باہم مل جل کر اور ایک دوسرے کا خیر خواہ بن کر رہنا چاہئے۔

ان احساسات کے تحت جب تمام چھوٹے اور بڑے لوگ میدان میں جمع ہو کر اکٹھے عبادت کرتے ہیں تو وہ اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ سب کا خدا ایک خدا ہے۔ اور تمام انسان اسی کے بندے ہیں۔ اس طرح عید کے دن کا مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی کو فروغ دینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

عید کا دن عبادت کا دن ہے۔ عید کا دن خوشی منانے کا دن ہے۔ عید کا دن سماجی قدروں کو فروغ دینے کا دن ہے۔ عید کا دن انسانی تعلقات قائم کرنے کا دن ہے۔ عید کا دن اس لئے ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنا سیکھیں۔ لوگ ایک دوسرے کا احترام کرنے کی تربیت حاصل کریں۔ عید کا دن بیک وقت خدائی دن بھی ہے اور اسی کے ساتھ انسانی دن بھی۔ وہ خدا کے ساتھ

انسان کے تعلقات کو بڑھاتا ہے اسی کے ساتھ وہ انسانی تعلقات کو اس بنیاد پر استوار کرتا ہے جو واحد مضبوط بنیاد ہے، یعنی باہمی محبت۔ عید آغازِ حیات کا دن ہے۔ روزہ کا مہینہ احتساب کا مہینہ ہے اور عید کا دن اس کے بعد نئے حوصلوں کے ساتھ مستقبل کی طرف اپنا سفر شروع کرنے کا دن۔

روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دنیا سے اور دنیا کی چیزوں سے ایک محدود مدت کے لئے کٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ اپنی فطری ضروریات تک میں کمی کر دے۔ رمضان کا اعتکاف اسی کی انتہائی صورت ہے جب کہ بندہ ماسوا سے قطع تعلق کر کے خدا کے گھر میں آکر پڑ جاتا ہے۔ اس کا مطلب لوگوں کو رہبان بنانا نہیں ہے۔ یہ "حساب کئے جانے سے پہلے اپنا حساب کر لو" کا ایک وقتی لمحہ ہے تاکہ مستقل زندگی کے لئے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ عید کا دن اس وقتی لمحہ کا خاتمہ ہے جب کہ مسلمان نئے شعور اور نئی قوت عمل کے ساتھ از سر نو زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس اور صبر اور تعلق باللہ کی جو دولت اس نے روزہ کے ذریعہ پائی ہے، اس کو وہ ساری زندگی میں پھیلانے کے لئے دوبارہ دنیا کے ہنگاموں میں واپس آجاتا ہے ـــــ روزہ وقتی طور پر عالم مادی سے کٹنا ہے اور عید دوبارہ عالم مادی میں لوٹ آنا۔ روزہ جس طرح محض بھوک پیاس نہیں ہے۔ اسی طرح عید محض کھیل تماشہ کا نام نہیں ہے۔ روزہ اللہ سے قربت حاصل کرنے کی کوشش ہے اور عید اس نئے بہتر سال کا آغاز ہے جو روزہ کے بعد روزہ داروں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

آیئے ہم عید سے اپنی نئی زندگی شروع کریں۔ عید کے دن کو اپنی دینی و ملی تعمیر کے آغاز کا دن بنائیں۔ آج ہم نئی ایمانی قوت اور نئے عملی حوصلہ کے ساتھ زندگی کی جدو جہد میں داخل ہوں۔ ہمارا سینہ خدا کے نور سے روشن ہو۔ ہماری مسجدیں خدا کے ذکر سے آباد ہوں۔ ہمارے گھر تقویٰ اور تواضع کے گھر بن جائیں۔ اللہ کے لئے ہم سب ایک ہو کر وہ جدو جہد شروع کریں جس کے نتیجہ میں ہم کو دنیا میں اللہ کی نصرت ملتی ہے اور آخرت میں اللہ کی جنت۔ روزہ کے بعد عید کا آنا روزہ داروں کے لئے خوش خبری ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے کہ اگر ہم نے روزہ کی اسپرٹ کو زندگی میں استعمال کیا تو ہم دونوں جہان کی خوشیوں سے ہم کنار ہوں گے۔

حکمتِ دعوت

خدا کا کریشن پلان

خدا نے ایک دنیا بنائی، بے حد خوب صورت، ہر قسم کے کھلے مواقع، اور راحت کے ہر اعلیٰ سامان سے بھری ہوئی، خود خدا کے واحد استثناء کے بعد تمام موجودات میں سب سے بہتر چیز۔ قرآن کے مطابق، اس جنتی دنیا میں دو چیزیں وافر مقدار میں رکھ دی گئیں۔ ایک نعمت اور دوسرے آزادی (الدھر ۲۰) اس دنیا میں ایک طرف ہر قسم کی نعمتیں تھیں اور دوسری طرف کامل آزادی کا ماحول۔ خدا نے اس حسین دنیا کا نام جنت رکھا۔

اب خدا نے چاہا کہ وہ ایک مخلوق پیدا کرے جس کو اس حسین دنیا میں بسایا جا سکے، جو اس دنیا سے بھرپور طور پر متمتع ہو، جس سے خدا خوش ہو اور جو خدا سے خوش۔ (البینۃ ۸)

اس کے بعد خدا نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق، انسان کو پیدا کیا۔ یہ انسان جوڑے کی صورت میں تھا جس کو آدم اور حوّا کہا جاتا ہے۔ خدا نے اپنے اس منصوبہ کا اعلان کرتے ہوئے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (البقرہ ۳۰) خلیفہ کے معنٰی عربی زبان میں، جانشین یا قائم مقام کے ہیں۔ یعنی بعد کو آنے والا یا کسی کی جگہ لینے والا۔ اسی لیے صاحب جلالین نے قرآن کی آیت: انی جاعل فی الارض خلیفة کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: خلیفة یُخلفنی فی الارض (ایک خلیفہ جو زمین میں میری جگہ لے گا) اسی خلافت کو قرآن میں دوسرے مقام پر الأمانة (الاحزاب ۷۲) کہا گیا ہے۔ یہاں امانت سے مراد اختیارانہ اطاعت ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا ساری کائنات کا واحد بادشاہ ہے۔ زمین و آسمان میں بلاشرکت صرف اسی کا اقتدار قائم ہے۔ ستارے اور سیارے، سورج اور چاند، سمندر اور پہاڑ، حیوانات اور نباتات، غرض پورا عالم موجودات براہ راست طور پر خدا کی سلطنت کے تابع ہیں۔ ہر چیز ادنیٰ انحراف کے بغیر خدا کے زیر حکم ہے۔

اس عموم میں خدا نے صرف ایک جزئی استثناء رکھا اور وہ انسان کا استثناء تھا۔ خدا نے اپنی وسیع

سلطنت کا ایک بہت چھوٹا حصہ (زمین) کو انسان کے نام گویا الاٹ کر دیا۔ اور پھر خدا نے انسانی جوڑے سے کہا کہ تم میری اس دنیا میں آزادانہ طور پر رہو اور اس کی نعمتوں سے جس طرح چاہو فائدہ اٹھاؤ۔ تاہم خدا نے ایک درخت کے بارے میں یہ ہدایت کی کہ تم اس درخت سے دور رہنا۔

یہ درخت ایک علامتی درخت تھا۔ وہ اس بات کا ایک نشان تھا کہ انسان اگر چہ آزاد ہے مگر اس کی آزادی لامحدود آزادی نہیں ہے بلکہ وہ خدا کے بالاتر اقتدار کے ماتحت ہے۔ یہ آزادی خدا کے بالاتر اقتدار کے تحت ایک قسم کی محدود آزادی تھی۔ مگر انسان (آدم وحوا) اس ابتدائی امتحان میں پورے نہ اُترے۔ دونوں نے ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا (الاعراف ۲۲) اس کے بعد خدا نے انسان کو جنت کی دنیا سے نکال کر موجودہ زمین میں بسا دیا اور کہا کہ تم لوگ اس زمین پر قیام کرو اور یہاں اپنی نسل کو بڑھاؤ۔ یہاں تم خدا کی نگرانی میں رہو گے۔ پھر ایک وقت آئے گا جب کہ خدا تمہارے اوپر عدالت قائم کرے گا اور تم میں سے صالح لوگوں کو انعام دے گا اور برے لوگوں کو سزا دے گا۔

اس خدائی نقشہ کے مطابق، وہ وقت آنے والا ہے جب کہ انسان کو جنت میں دوبارہ داخلہ (re-entry) ملے۔ تخلیق کے پہلے نقشہ میں انسان کو پیدائشی طور پر (by birth) جنت میں داخلہ مل گیا تھا مگر انسان اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت نہ کر سکا۔ اس لیے خدا نے تخلیق کے دوسرے مرحلہ میں یہ اصول مقرر کیا کہ جنت میں داخلہ انتخابی بنیاد (selective basis) پر ہو۔ موجودہ دنیا میں انسان اپنے امتحانی مرحلہ میں ہے۔ جو لوگ یہاں اس امتحان کو کوالیفائی (qualify) کریں انھی کو جنت میں داخلہ ملے گا اور جو لوگ اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کو رد کر کے اُنہیں کائنات کے کوڑے خانہ (dustbin) میں ڈال دیا جائے گا۔

موجودہ زمین پر انسان کو جو ٹسٹ دینا ہے اس کے دو بنیادی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا کی نعمتوں کا استفادہ اس طرح کرے کہ وہ نعمت کے استعمال کے ساتھ بھر پور طور پر منعم کا اعتراف کر رہا ہو۔ زمین پر رہتے ہوئے منعم کا کامل اعتراف کرنا یہی وہ صفت ہے جو کسی کو اس قابل بناتی ہے کہ اس کو جنت کی ابدی نعمتوں میں جینے کا حق دیا جائے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا میں ملی ہوئی آزادی کو وہ

اس طرح استعمال کرے کہ پورا اختیار رکھتے ہوئے بھی وہ اس احساس میں جی رہا ہو کہ اصل اقتدار خدا کا ہے۔ خدا حاکم ہے اور میں محکوم۔ یہ خدا کی عنایت ہے کہ اس نے اپنی حاکمانہ حیثیت کے باوجود مجھے آزادانہ زندگی گزارنے کا موقع دے دیا۔ دنیا کے دار الامتحان میں یہی دو بنیادی پرچے ہیں۔ انھی دونوں پرچوں میں پاس ہونے یا فیل ہونے پر آدمی کی اخروی زندگی کا فیصلہ ہونا ہے۔ یعنی آزادانہ طور پر خود اپنے اختیار سے اپنے آپ کو خدا کا محکوم بنالینا۔

قرآن کے مطابق، جنت ان افراد کو ملے گی جو دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو نفس مزکّی (طٰہٰ ۷۶) ثابت کریں۔ یعنی پاک روح (purified soul)۔ موجودہ دنیا کا پورا ماحول اسی مقصد کے تحت بنایا گیا ہے۔ اس لیے یہاں آدمی کو کبد میں پیدا کیا گیا ہے (البلد ۴) اس مقصد کے لیے دنیا میں یہ ماحول قائم کیا گیا ہے کہ یہاں لوگوں کے درمیان انٹرسٹ کا ٹکراؤ (clash of interest) پیش آئے، حتّٰی کہ باہمی عداوت کی نوبت آجائے (طٰہٰ ۱۲۳) اس لیے دنیا خدا کی آیات (signs) سے بھری ہوئی ہے تاکہ آدمی ان سے نصیحت لے سکے۔

فطرت کے اندر بے شمار خدائی راز چھپادئے گئے ہیں تاکہ آدمی اپنی عقل کو استعمال کرکے ان رازوں کو دریافت کرے۔ اسی لیے دنیا میں حق کے داعی کو عام انسان کے روپ میں پیدا کیا گیا تاکہ لوگ تعصبات سے اوپر اٹھ کر اس کو پہچانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ربّانی حقائق کو یہاں غیب کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے تاکہ انسان غور وفکر کے ذریعہ انہیں دریافت کرے۔ طرح طرح کے مادی انٹرسٹ رکھ دیے گیے ہیں تاکہ انسان وقتی انٹرسٹ سے بلند ہوکر اعلیٰ سطح پر جینے کا ثبوت دے سکے۔ اس لیے انسان کے اندر انا (ego) کا جذبہ رکھا گیا ہے تاکہ خدا یہ دیکھے کہ کون اپنی انا کا شکار ہوجاتا ہے اور کون انا کے خول سے باہر آکر بلندتر حقیقتوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اس مقصد کے تحت انسان کے اندر طرح طرح کی خواہشیں (desires) رکھی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کون خواہشوں کے جال میں پھنس جاتا ہے اور کون اس سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی کے ساتھ خدا نے دنیا کی چیزوں کو اس طرح بنایا ہے کہ ہر چیز کے ساتھ ایک شبہہ کا

عنصر (element of doubt) لگا ہوا ہے۔ مثلاً حق کا داعی ہے تو وہ بھی انسان کے روپ میں ہے، نہ کہ فرشتہ کے روپ میں۔ دنیا میں نعمتیں ہیں تو اسی کے ساتھ مصیبتیں (sufferings) بھی ہیں۔ خدا اپنی تخلیقات میں نمایاں بھی ہے مگر اسی کے ساتھ اس کی ذات کامل طور پر مخفی بھی ہے۔ یہ بھی انسان کے امتحانی پرچے کا ایک جزء ہے کہ وہ شبہات کے پردے کو پھاڑ کر سچائی کو دیکھے۔ وہ ہر قسم کے ناخوشگوار پہلوؤں سے بخیر خوبی گزرتے ہوئے اپنا روحانی اور فکری سفر جاری رکھے۔

اس قسم کی تمام چیزیں انسان کے لیے شخصی ارتقاء (personality development) کے کورس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور یہی وہ ارتقاء یافتہ شخصیت ہے جو اس قابل ہوگی کہ اس کو جنت کی لطیف ونفیس دنیا میں بسایا جائے۔

خدا کا یہی تخلیقی نقشہ ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ○ ثم رددناه اسفل سافلین ○ الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات فلهم اجرٌ غیر ممنون (التین ۴۔۶)

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اُس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔

قرآن کی ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ اُن تمام صفتوں کا حامل ہے جو اُس کو جنت میں آبادکاری کے مستحق بنائیں۔ مگر جنت میں داخلہ سے پہلے انسان کو موجودہ زمین میں عارضی طور پر بسایا گیا۔ یہاں ہر قسم کے امتحانی اسباب رکھے گئے۔ یہ اسباب اُس کو قدم قدم پر جنت سے دور کرنے والے ہیں۔ ان اسباب کو پہچاننا اور ان اسباب کا شکار ہوئے بغیر اپنی زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھنا، یہی وہ شرط ہے جو انسان کو اس کی مطلوب دنیا (جنت) میں اس کو پہنچانے والی ہے۔ یہی جنتی دنیا احسن تقویم کا اصل جائے مقام ہے۔ جو لوگ زمینی زندگی میں اس کا استحقاق ثابت نہ کرسکیں وہ پیدائشی طور پر احسن تقویم ہوتے ہوئے اسفل السافلین میں جا گرے۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت قرآن کی کچھ آیات سے ہوتی ہے۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کی کمی سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اوپر اُن کے رب کی شاباشیاں ہیں اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو راہ پر ہیں۔ (البقرہ ۱۵۵۔۱۵۷)

قرآن کے اس بیان میں زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ خدا نے اس دنیا کو انسان کے لیے آرام گاہ کے طور پر نہیں بنایا ہے بلکہ اُس کو امتحان گاہ کے طور پر بنایا ہے۔ اس تخلیقی نقشہ کی بنا پر اس دنیا کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار انسان کے ساتھ جانچنے والے حالات پیش آئیں۔ یہاں بار بار ایسے ناموافق تجربات گزریں جو انسان کے ذہن کو شاک دینے والے ہوں۔ انسان کے ذہن میں مختلف قسم کے شبہات ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ وہ شبہہ کا شکار ہو گیا یا اُس سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی امتحانی مصلحت کی بنا پر زمین پر زلزلے آتے ہیں۔ تا کہ انسان کے یقین کو جانچیں۔ یہاں طرح طرح کی مصیبتیں (sufferings) پیش آتی ہیں تا کہ یہ دیکھا جائے کہ انسان ان کی توجیہہ کرنے میں اپنے عقل کو صحیح طور پر استعمال کر سکا یا وہ اس میں ناکام رہا۔ اسی امتحانی مصلحت کی بنا پر یہاں ایسے ناخوشگوار حالات پیش آتے ہیں جو آدمی کے سینہ میں منفی جذبات کا طوفان برپا کریں۔ اس طرح خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون منفی جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا اور کون اپنے آپ کو اس سے بچانے میں کامیاب رہا۔

اس امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے سب سے اہم شرط صبر ہے۔ یہاں صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے ساتھ جو بھی خوشگوار یا ناخوشگوار تجربات گذریں اُن کو وہ خدا کے تخلیقی نقشہ کا نتیجہ قرار دے۔ ہر تجربہ کا استقبال وہ اس طرح کرے کہ یہ صرف میری جانچ کے لیے ہے۔ میری ساری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ میں اس جانچ میں پورا اتروں۔ زندگی کے تجربہ کو وہ خدائی امتحان کا پرچہ سمجھ کر لے اور

اسی اعتبار سے وہ اس میں پورا اُترنے کی کوشش کرے۔

قرآن کے مطابق، دنیا کی مادّی ترقی کسی کو ملتی ہے تو وہ اُس کو نعمت کے طور پر نہیں ملتی بلکہ وہ صرف اس لیے ہوتی ہے کہ اُس کے ذریعہ آدمی کو جانچا جائے (الکہف ۷) اسی طرح جب کسی کو سیاسی اقتدار ملے تو وہ بھی اُس کو انعام کے طور پر نہیں ملتا بلکہ وہ اُس کے لیے صرف اس بات کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اقتدار پا کر سرکش بنتا ہے یا وہ خدا کی وفاداری پر قائم رہتا ہے (النمل ۴۰) اسی طرح دنیا کی ہر چیز خواہ وہ خوش گوار ہو یا ناخوشگوار، ہر حال میں وہ امتحان کا ایک پرچہ ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ہر تجربہ جو انسان پر گذرتا ہے وہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی کے جنّتی یا غیر جنّتی ہونے کا فیصلہ کرے۔

موجودہ دنیا کی فلسفیانہ توجیہہ کا بنیادی نکتہ یہی ہے۔ موجودہ دنیا کو خدا کے تخلیقی نقشہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو اُس کا ہر جزء اپنی فکری توجیہہ پالیتا ہے۔ اور اگر اس تخلیقی نقشہ کو سامنے رکھے بغیر دنیا کی توجیہہ کرنے کی کوشش کی جائے تو یقینی طور پر ایسی کوشش ناکام رہے گی۔ خدا کے تخلیقی نقشہ کی روشنی میں دنیا کو سمجھنا آدمی کو یقین کی طرف لے جاتا ہے۔ جو لوگ اس تخلیقی نقشہ کو رہنما بنائے بغیر دنیا کی توجیہہ کرنا چاہیں وہ صرف ذہنی انتشار (confusions) کا شکار رہیں گے، وہ اپنی تلاش کا اطمینان بخش جواب کبھی نہ پاسکیں گے۔

جنت کی دریافت

غالباً ۱۹۸۳ کی بات ہے۔ اُس وقت دہلی میں ایک انگریز مسٹر جان بَٹ (John Butt) رہتے تھے۔ اُنہوں نے میری انگریزی کتابیں پڑھی تھیں اور میری فکر سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ ملاقات کے دوران ایک بار میں نے اُن سے کہا کہ قلم میری محبوب چیز ہے۔ میں نے بہت سے قلم استعمال کیے مگر مجھے اپنی پسند کا قلم ابھی تک نہیں ملا۔ اُنہوں نے کہا کہ میں جلد ہی لندن جانے والا ہوں، وہاں سے میں آپ کے لیے ایک اچھا قلم لے آؤں گا۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ مجھ سے ملے اور انگلینڈ کا بنا ہوا ایک قلم مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میں نے لندن اور آکسفورڈ کی مارکیٹ میں کافی تلاش کے بعد یہ قلم (فاؤنٹین پین) حاصل کیا ہے۔ تاہم مجھے امید نہیں کہ یہ قلم آپ کی پسند کے مطابق ہوگا۔ میں نے کہا، کیوں۔ اُنہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک پرفیکشنسٹ (perfectionist) ہیں اور دنیا میں چونکہ کوئی بھی قلم پرفیکٹ قلم نہیں، اس لیے آپ کو کوئی بھی قلم پسند نہیں آئے گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر پرفیکشنسٹ ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان ایک کمال پسند حیوان ہے:

Man is a perfection-seeking animal.

انسانی فطرت کا یہی خاص پہلو ہے جس کی بنا پر ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ محرومی (frustration) کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو دنیا کا ہر سامان حاصل کر لیتے ہیں وہ بھی محرومی کے احساس سے خالی نہیں ہوتے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے پرفیکشنسٹ ہے مگر جس دنیا میں وہ رہتا ہے اُس کی کوئی بھی چیز پرفیکٹ نہیں۔ اس طرح انسان کی طلب اور دنیا کی قابلِ حصول چیزوں کے درمیان ایک عدم مطابقت (incompatibility) پیدا ہوگئی ہے۔ دونوں کے درمیان یہی عدم مطابقت

انسان کے اندر محرومی کے احساس کا اصل سبب ہے۔

انسان اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دنیا میں جدوجہد شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ دولت، اقتدار، ساز وسامان اور دوسری مطلوب چیزیں حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی مطلوب چیزوں کو پانے کے بعد بھی وہ بدستور محرومی کے احساس سے دوچار ہے، اب بھی وہ یافت کے احساس تک نہ پہنچ سکا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ پانے سے پہلے وہ سمجھتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس کی آرزو وہ اپنے دل میں لیے ہوئے ہے۔ مگر چیز کو پانے کے بعد اُس کو وہ تسکین نہیں ملتی جو کسی مطلوب چیز کی یافت سے ہونی چاہئے۔ کیوں کہ اُس کے دل میں جو آرزو تھی وہ پرفیکٹ چیز کے لیے تھی۔ جب کہ دنیا کی ہر چیز غیر پرفیکٹ (imperfect) ہے اور ظاہر ہے کہ کسی پرفیکشنسٹ کو غیر پرفیکٹ میں تسکین نہیں مل سکتی۔

اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ آدمی جنت کو اپنا نشانہ بنائے۔ جنت پورے معنوں میں ایک پرفیکٹ ورلڈ (perfect world) ہے، جب کہ اُس کے مقابلہ میں موجودہ دنیا صرف ایک اِم پرفیکٹ ورلڈ (imperfect world) کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے جس پرفیکٹ ورلڈ کا طالب ہے، وہ جنت ہے۔ جنت کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے آدمی موجودہ دنیا میں اپنی آرزوئیں تلاش کرنے لگتا ہے اور اپنی فطرت اور خارجی دنیا کے درمیان عدم مطابقت کی بنا پر محرومی کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ شعوری انقلاب لایا جائے کہ وہ جنت کی معرفت حاصل کر سکے۔ اس معرفت کے حصول کے بعد اُس کی مایوسی کا احساس اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کیوں کہ وہ جان لے گا کہ جن چیزوں میں وہ اپنی آرزوؤں کی تسکین ڈھونڈ رہا ہے اُن میں اُس کے لیے تسکین کا سامان موجود ہی نہیں۔ اس دریافت کے بعد اُس کی توجہ جنت کی طرف لگ جائے گی۔ اس کے بعد وہ موجودہ دنیا کی چیزوں کو ضرورت کے طور پر لے گا، نہ کہ مطلوب کے طور پر۔ اور جب کسی آدمی کے اندر یہ سوچ پیدا ہو جائے تو اُس کے بعد اُس کا حال یہی ہو گا کہ وہ یافت کے احساس میں جینے لگے گا، نہ کہ محرومی کے احساس میں۔

موجودہ دنیا پانے سے زیادہ کھونے کی جگہ ہے۔ یہاں ہر مرد اور عورت کو بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس سے کھوئی گئی۔ فلاں موقع اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فلاں شخص نے اُس کو نقصان پہنچا دیا۔ اس قسم کے چھوٹے یا بڑے حادثات ہر ایک کو بار بار پیش آتے ہیں۔ کسی بھی مرد یا عورت کے لیے ان نقصانات سے بچنا ممکن نہیں۔

اس قسم کے نقصانات ہر ایک کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان نقصانات کی تلافی کی صورت کیا ہے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ جنت کا یقین ہے۔ جس آدمی کو خدا کی جنت پر یقین ہو اُس کا حال یہ ہوگا کہ ہر نقصان کے بعد وہ یہ کہہ سکے گا کہ دنیا کا یہ نقصان تو بہت چھوٹا ہے۔ جنت کے مقابلہ میں اس نقصان کی کوئی حقیقت نہیں۔ دنیا کے ہر نقصان کے بعد وہ اور زیادہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ وہ خدا سے اور زیادہ جنت کا طالب بن جائے گا۔

قرآن میں جنت کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہاں آباد ہونے والے لوگوں کے لیے نہ خوف ہوگا اور نہ حُزن (البقرہ ۳۸)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کو جو زندگی ملتی ہے وہ کبھی اور کسی کے لیے خوف اور حُزن سے خالی نہیں ہوتی۔ موجودہ دنیا کا نظام اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ یہاں حقیقی معنوں میں خوف اور حزن سے خالی زندگی کا حصول ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں آدمی کے لیے واحد درست رویّہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو اپنا مقصود نہ بنائے۔ وہ دنیا کو صرف یہ حیثیت دے کہ وہ حقیقی منزل کی طرف جانے کا ایک راستہ ہے۔

اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: **اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ**۔ یعنی راحت اور مسرّت کا حصول صرف آخرت میں ممکن ہے۔ دنیا میں راحت و مسرّت تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسافر ریلوے اسٹیشن پر اپنے لیے ایک آرام دہ گھر بنانے کی کوشش کرے۔ ہر مسافر جانتا ہے کہ اسٹیشن گھر بنانے کے لیے نہیں ہوتا۔ اسی طرح موجودہ دنیا عمل جنت کے لیے ہے، نہ کہ تعمیر جنت کے لیے۔ جنت کو اپنی منزل مقصود بنانا صرف عقیدہ کی بات نہیں وہ مقصد حیات کی بات ہے، ایسا مقصد جس کے سوا کوئی اور مقصد انسان کے لیے ممکن نہیں۔

خدااورآخرت

تخلیق اپنے آپ میں خالق کا ثبوت ہے۔ کائنات اتنا زیادہ بامعنی واقعہ ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ کسی کے بنائے بغیر وہ بن گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے چوائس باخدا کائنات اور بےخدا کائنات میں نہیں ہے بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات یا غیر موجود کائنات میں ہے۔ کیوں کہ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں خود کائنات کو غیر موجود ماننا پڑے گا۔ اور ہمارے لیے ایسا چوائس سرے سے ممکن ہی نہیں۔

The choice for us in this regard is not between universe with God or universe without God. This is not the choice. The real choice is between universe with God or no universe at all. If we say that God does not exist then we are also compelled to say that the universe does not exist. But the universe is too obvious a fact that we are not in a position to deny the existence of the universe. So we can not deny the existence of God.

بامعنی کائنات

سرجیمس جینز نے کہا تھا کہ کائنات کا خالق ایک ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) ہے۔ میں کہوں گا کہ ہماری دنیا اتنی زیادہ بامعنی ہے کہ وہ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق معنویت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ ایسا خالق ایک ایسی دنیا کی تخلیق نہیں کرسکتا جو اپنے انجام کے اعتبار سے ناقص ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک بامعنی خالق ایک بےمعنی کائنات کی تخلیق کرے۔ کائنات اپنی ساری معنویت کے باوجود اپنی موجودہ حالت میں ناقص ہے۔ وہ اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جس کو پیغمبروں نے آخرت کی دنیا کہا ہے۔

یہ آخرت کی دنیا صرف عقیدہ کی بات نہیں۔ وہ پوری طرح ایک علمی واقعہ ہے۔ عالم آخرت

کے وجود کوٹھیک اسی علمی معیار پر ثابت کیا جا سکتا ہے جس معیار پر سائنس میں دوسری تمام چیزوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

سائنسی ثبوت

اس معاملہ میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ سائنٹفک پروف کیا ہے۔ موجودہ سائنس کے مطابق، سائنٹفک پروف یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کے معاملہ میں تیقن (certainty) کا درجہ حاصل ہو جائے۔ اس قسم کا ناقابلِ انکار تیقن کسی بھی چیز کے بارے میں ممکن نہیں۔ جدید سائنسی موقف کے مطابق، کسی چیز کا علمی طور پر ثابت ہو جانا یہ ہے کہ اس کا قرینہ یا امکان (probability) ثابت ہو جائے۔ جدید سائنس میں جن نظریات کو مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا ہے ان کو صرف اس لیے مانا جاتا ہے کہ ان کا امکان ثابت ہو گیا نہ یہ کہ مشاہداتی سطح پر ان کے واقع ہونے کا قطعی علم حاصل ہو گیا ہے۔ ایٹم کے اسٹرکچر کو بطور حقیقت ماننا اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

عالم آخرت کے وجود کو ماننے کے لیے بھی ہمیں اسی مسلّمہ سائنٹفک متھڈ کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس کے سوا کسی دوسرے متھڈ کو استعمال کرنا اصولی طور پر درست نہیں۔ کیوں کہ علمی طور پر ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ دوسرے معاملات میں جس سائنٹفک متھڈ کو ہم معقول (valid) مانیں، عالم آخرت کے بارے میں ہم اس متھڈ کے استعمال سے انکار کر دیں۔

تین علمی اصول

جیسا کہ معلوم ہے، اس طرح کے معاملہ میں تین علمی اصول سائنٹفک متھڈ کے تین اجزاء ہیں۔ وہ اجزاء یہ ہیں — مفروضہ، مشاہدہ، اور تصدیق:

Hypothesis, Observation, Verification

اس سہ نکاتی فارمولا کو عالم آخرت کے وجود کے معاملہ میں استعمال کیا جائے تو ہم یقینی طور پر ایک موافق قرینہ یا ایک تائیدی امکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا، قرینہ یا امکان تک پہنچنے ہی کا دوسرا نام تیقن (certainty) ہے۔

اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلا قرینہ یہ سامنے آتا ہے کہ انسان دوسری تمام مخلوقات سے مختلف ہے۔ یہ انسان کی ایک استثنائی صفت ہے کہ وہ کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ انسان کے سوا جمادات اور نباتات اور حیوانات میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے اندر کل کا تصور رکھتا ہو۔ اس مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے سوا دوسری تمام مخلوقات کی منزل صرف آج ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی منزل آئندہ آنے والے کل (tomorrow) سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی جسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم ان گنت خلیوں (living cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیے ہر لمحہ ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس طرح انسان کا جسم بار بار پرانے کے بعد نیا ہوتا رہتا ہے جیسا کہ بہتے ہوئے دریا کا پانی ہر وقت پرانا اور نیا ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی شخصیت اس کے جسم سے الگ ایک مستقل وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسم پر موت واقع ہوتی ہے مگر اس کی روحانی شخصیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اسی طرح ہر انسان کے اندر نہایت گہری خواہشیں موجود ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان خواہشات کو طلب کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a desire-seeking animal.

مگر اسی کے ساتھ تجربہ بتاتا ہے کہ کسی بھی انسان کی یہ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہر انسان اپنی خواہشات کے مطابق اپنے لیے ایک معیاری دنیا بنانا چاہتا ہے مگر ہر انسان جلد ہی مر جاتا ہے، اس سے پہلے کہ اس نے اپنی خواہشوں کے مطابق اپنا مطلوب کل بنایا ہو۔

امید کی کرن

امریکی مشنری بلی گرہم نے لکھا ہے کہ اس کو ایک بار ایک امریکی دولت مند کا ارجنٹ پیغام ملا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا کہ مجھ سے فوراً ملو۔ بلی گرہم نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ فوراً سفر کر کے مذکورہ امریکی دولت مند کے پاس پہنچا۔ بلی گرہم کا بیان ہے کہ جب میں امریکی دولت مند کے گھر پہنچا تو وہ فوراً مجھ کو اپنے وسیع مکان کے ایک الگ کمرہ میں لے گیا۔ یہاں ہم دونوں دو کرسیوں پر آمنے

سامنے بیٹھے۔ اس کے بعد امریکی دولت مند نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بلی گرہم سے کہا کہ دیکھو، میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی اپنی ساری معنویت کھو چکی ہے۔ میں نامعلوم کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان، کیا تم مجھے امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leap into the unknown. Young man can you give me a ray of hope.

یہ سوال صرف ایک امریکی دولت مند کا سوال نہیں۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اس سوال سے دوچار ہوتا ہے، عورت بھی اور مرد بھی۔ اس سوال کا معقول جواب صرف عالم آخرت کے عقیدہ میں ملتا ہے۔ اگر موت کے بعد ایک اور دنیا کو نہ مانا جائے تو یہ عالمگیر سوال ہمیشہ کے لیے بے جواب ہو کر رہ جائے گا۔

تضاد کا خاتمہ

انسان کے بارے میں اس قسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد پیدائشی طور پر دو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ ایک طرف ہر ایک کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایک مطلوب دنیا (dream world) بنائے، ایک ایسی دنیا جو اس کے آئیڈیل کے مطابق ہو اور جہاں وہ اپنے ''کل'' کے دور حیات کو خوشیوں اور راحتوں کے ساتھ گزار سکے۔ مگر دوسری طرف ہر انسان اس تضاد میں مبتلا ہے کہ وہ بظاہر تمام مادی چیزیں حاصل کر لینے کے باوجود اپنی مطلوب دنیا بنا نہیں پاتا۔ بورڈم، نقصان، بیماری، ایکسیڈنٹ، بوڑھاپا اور آخر میں سو سال سے بھی کم مدت میں موت، یہی اس دنیا میں انسان کی کہانی ہے۔

یہی معاملہ ہر عورت اور ہر مرد کا ہے۔ ہر ایک اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور بسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ہر ایک اپنی حسین تمناؤں کو لیے ہوئے مر جاتا ہے، قبل اس کے کہ اس نے اپنی مطلوب دنیا کو عملاً پایا ہو۔

یہاں دوبارہ ایک مشاہدہ سامنے آتا ہے۔ یہ مشاہدہ کی دنیا میں عالمگیر طور پر زوجین (pairs)

کا اصول قائم ہے۔ یہاں ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے۔ ہر چیز دو کے ملنے سے مکمل ہوتی ہے — ایٹم میں نگیٹیو پارٹیکل اور پازیٹیو پارٹیکل، ستاروں کی دنیا میں جوڑا ستارے (pair stars)، نباتات کی دنیا میں نر اور مادہ، حیوانات کی دنیا میں مذکر اور مؤنث، انسان کی دنیا میں مرد اور عورت۔

اس عالمگیر فطری اصول کو زوجین کا اصول (pair principle) کہا جا سکتا ہے۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے آپ کو مکمل کرتی ہے۔ اسی عالمگیر اصول میں مذکورہ سوال کا جواب ہے۔ اس کے مطابق، ساری دنیا میں ایک جوڑا دنیا (pair world) ہے۔ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا موجود ہے اور اسی دنیا کے ملنے سے ہی موجودہ دنیا اپنے وجود کو مکمل کرتی ہے۔

آغاز کی تکمیل

اب مذکورہ مشاہدہ کی روشنی میں دیکھئے تو اس بات کی واضح تصدیق ہو جاتی ہے کہ عالم آخرت کا نظریہ درست ہے۔ عالم آخرت وہ جوڑا دنیا ہے جس کے ملنے سے موجودہ دنیا اپنے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ اس جوڑا دنیا سے ملے بغیر ہماری موجودہ دنیا اسی طرح نامکمل ہو جاتی ہے جس طرح اس کائنات کی دوسری تمام چیزیں اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل رہتی ہیں۔

ہماری دنیا کا دو دنیاؤں کی صورت میں ہونا بہت بامعنی ہے۔ اس دوسری دنیا کو ماننے کے بعد انسانی وجود ایک مکمل وجود بن جاتا ہے۔ اب ہر چیز اپنی معنویت پا لیتی ہے۔ اب ہر چیز اپنے خانہ میں فٹ بیٹھ جاتی ہے:

Everything falls into place.

درست فریم ورک

یہ تصور ہم کو وہ فریم ورک دے دیتا ہے جس میں زندگی اور کائنات کی ہر چیز اپنی اطمینان بخش توجیہہ پا سکے۔ اس تصور سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جنت اور جہنم کیا ہے۔ جنت گویا سنجیدہ اور حق پرست لوگوں کی آرام گاہ ہے اور جہنم گویا سرکش اور باطل پرستوں کا عذاب خانہ۔

اس کے مطابق جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو عالم امتحان (testing ground)

کے طور پر بنایا گیا اور اگلی دنیا کو اپنا انجام پانے کی جگہ کے طور پر تخلیق کیا گیا۔ انسان کو پیدائشی طور پر ابدی مخلوق کی حیثیت سے بنایا گیا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت عطا ہوئی ہے۔ تاہم انسان کی زندگی گویا آئس برگ کی مانند ہے جس کا بہت چھوٹا حصہ اوپر دکھائی دیتا ہے اور اس کا پورا بقیہ وجود سمندر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مدت عمر (life span) دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں رکھا گیا ہے اور اس کی مدت حیات کا زیادہ بڑا حصہ عالم آخرت میں رکھ دیا گیا ہے۔

موجودہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے تاکہ انسان اپنی شخصیت کو مکمل کرے۔ مثال کے طور پر موجودہ دنیا طرح طرح کی تلخیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ انسان ان تجربات سے گزرتے ہوئے یہ ثبوت دے کہ وہ منفی حالات میں بھی مثبت احساسات کے ساتھ جی سکتا ہے۔ ایسے ہی مثبت شخصیات کے لوگ جنت کی معیاری دنیا میں داخل کئے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ردعمل کا شکار ہو گئے اور منفی تجربات کے درمیان خود بھی منفی بن گئے، ایسی منفی شخصیت رکھنے والے لوگوں کو جنت کے لیے نااہل قرار دیا جائے گا۔ وہ جہنم میں داخل کردیے جائیں گے جہاں سے وہ کبھی نکل نہ سکیں گے۔

عضویاتی ارتقاء کے نظریہ کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک فیکٹ سمجھا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ عضویاتی ارتقاء کے نظریہ کے حق میں مشاہداتی دلائل حاصل ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء کو ماننے کی صورت میں حیاتیاتی شواہد کی ایک قابل فہم توجیہہ حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کہ علماء سائنس کے نزدیک، دوسرا کوئی ایسا نظریہ موجود نہیں جو معلوم حیاتیاتی شواہد کی توجیہہ کرتا ہو۔ گویا نظریہ ارتقاء ایک قابل عمل نظریہ (workable theory) ہے نہ کہ معروف معنوں میں کوئی ثابت شدہ نظریہ (proved theory)۔

اطمینان بخش توجیہہ

اس سائنسی اصول کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں تمام معلوم

شواہد کی تشفی بخش توجیہہ مل جاتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں سب کچھ ناقابل توجیہہ بنارہتا ہے۔

عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا ادھوری معلوم ہوتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا مکمل نظر آنے لگتی ہے۔ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات ناقابل فہم بنی رہتی ہے کہ بہت سے سچے اور اچھے انسان دنیا سے اس طرح چلے گئے کہ انہیں اپنی سچائی کا کوئی انعام نہیں ملا۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال پوری طرح ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا کا یہ واقعہ ناقابل توجیہہ بنارہتا ہے کہ یہاں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ برائی اور سرکشی کرتے ہیں مگر یہاں وہ اپنی برائی کی سزا نہیں پاتے۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں ہم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔

اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات مکمل طور پر ناقابل فہم رہتی ہے کہ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان یہاں ایک آئیڈیل ورلڈ کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے، مگر ہر شخص اس آئیڈیل ورلڈ کو پائے بغیر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب انسان اس یقین کے ساتھ موجودہ دنیا میں رہ سکتا ہے کہ جس مطلوب چیز کو وہ قبل از موت دنیا میں نہ پا سکا وہ اس کو بعد از موت دنیا میں پالے گا۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز عبث پیدا نہیں کی گئی۔ سورج چاند کا نظام ہو یا زمین کے کیڑے مکوڑے سب ایک مقصد کے تحت پیدا کئے گئے ہیں اور وہ اپنے اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اس دنیا میں صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو بظاہر بلا مقصد معلوم ہوتی ہے۔ ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر حسین تمناؤں کا ایک تصور بسا ہوا ہے، کوئی بھی عورت یا مرد اس سے خالی نہیں۔ پھر جب اس دنیا کی دوسری تمام چیزیں واضح مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بھی اپنی ایک حقیقی منزل رکھتی ہوں۔ جس کائنات میں ہر چیز بامقصد ہو وہاں انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بے مقصد نہیں ہو سکتیں۔

یقینی طور پر یہ خواہشیں اور تمنائیں بھی سوچی سمجھی تخلیق ہیں۔ ان کی پیدائش کا ایک واضح مقصد ہے۔ البتہ یہ مقصد موجودہ محدود دنیا میں پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ خواہشیں اور تمنائیں لامحدود ہیں اور وہ ایک لامحدود دنیا ہی میں پوری ہوسکتی ہیں۔ اسی لامحدود دنیا کا نام آخرت ہے۔

آخرت کی اس لامحدود دنیا میں اچھے لوگوں کو ابدی جنت ملے گی جو ہر قسم کی خوشیوں اور راحتوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ اس کے برعکس جو لوگ موجودہ دنیا میں برے ثابت ہوں ان کو آخرت کی دنیا میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ مجبور ہوں گے کہ وہ اپنی برائیوں کی سزا ابدی طور پر بھگتتے رہیں۔

جنت کی حقیقت

جنت کیا ہے۔ جنت انسان کی تلاش کا جواب ہے۔ انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ ایک انوکھے استثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ وسیع کائنات کا ہر جزء اپنے آپ میں مکمل ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو اپنے آپ میں مکمل نہیں۔ پوری کائنات ایک بےنقص (zero-defect) کائنات ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر ناقص وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔

کائنات میں ہر طرف یقین (certainty) ہے اور انسان کی دنیا میں غیر یقینیت (uncertainty)۔ بقیہ کائنات میں کہیں خوف (fear) دکھائی نہیں دیتا مگر انسان ہمیشہ خوف اور اندیشہ سے دوچار رہتا ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر طرف تسکین (satisfaction) کی حالت ہے اور انسان کی زندگی میں بےتسکینی (dissatisfaction) کی حالت ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر چیز کا حال یہ ہے کہ جو کچھ اس کو چاہئے وہ سب اس کو مل رہا ہے مگر انسان اس دنیا کی واحد مخلوق ہے جو اسی احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ اس کو نہیں ملا۔ بقیہ کائنات ایک برائی سے پاک (evil-free) کائنات ہے۔ مگر انسان استثنائی طور پر اس مسئلہ سے دوچار ہے جس کو برائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔

جنت اسی سوال کا جواب ہے۔ جنت کا تصور بتاتا ہے کہ انسان کے لیے بھی وہ سب کچھ پوری

طرح موجود ہے جو بقیہ کائنات کو ملا ہوا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ بقیہ کائنات کو اپنا مطلوب آج میں مل رہا ہے، جب کہ انسان کو اس کا مطلوب کل میں ملے گا۔ دونوں کے معاملات کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر ایسا ہے کہ بقیہ کائنات کے پاس کل (tomorrow) کا تصور نہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر کل کے تصور میں جیتا ہے۔

فطرت کا حصہ

خدا اور آخرت کا معاملہ بظاہر غیر مشہود دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسان کی فطرت خدا اور آخرت کے معاملہ کو ایک معلوم صداقت کے طور پر جان لیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی معرفت کے دو درجے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فطری۔ خدا اور آخرت کے وجود کو عقلی سطح پر ماننا اس معرفت کا صرف ابتدائی درجہ ہے جب کہ خدا اور آخرت کے وجود پر فطری سطح پر یقین کرنا اس کا انتہائی درجہ۔ خدا اور آخرت کے معاملہ میں عقلی دلائل کے استعمال کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر سے شک کے پردے کو ہٹا دیا جائے۔ انسان کو اس مقام تک لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے معاملہ کو کم از کم امکانی صداقت کے طور پر قبول کر لے۔

خدا اور آخرت کے معاملہ میں دلیل اور منطق کے استعمال کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اس فکری سطح پر لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے وجود کو بطور ایک نظریہ ماننے کے لیے تیار ہو جائے۔ جب آدمی اس حالت تک پہنچ جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس نظریہ کو لینے کے لیے اس کی فطرت کے دروازے کھل جائیں۔ وہ اس کو ایک فطری سچائی کے طور پر پہچان کر اپنا لے۔

ہر انسان کے پاس وہ آنکھ موجود ہے جو خدا اور آخرت کو دیکھ سکے مگر اس آنکھ کے اوپر کنڈیشننگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ منطقی دلیل یہ کام کرتی ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ یا اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کو توڑ کر اس مصنوعی پردہ کو فطرت کی آنکھ سے ہٹا دے۔ اس کے بعد انسان خدا اور آخرت کو صاف دیکھنے لگتا ہے۔ اب انسان بظاہر نہ دکھائی دینے والے خدا کے وجود پر

اسی طرح کامل یقین کر لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

خدا اور آخرت کا معاملہ صرف اس وقت تک منطقی بحث کا موضوع رہتا ہے جب تک کہ آدمی کے ذہن کا مصنوعی پردہ ہٹا نہ ہو۔ غور و فکر یا منطقی استدلال کے ذریعہ جب یہ پردہ ہٹ جائے تو انسان اپنے خدا کو خود اپنی داخلی معرفت کے تحت پہچان لیتا ہے۔ اب خدا اس کے لیے تمام معلوم چیزوں سے زیادہ معلوم واقعہ بن جاتا ہے۔ منطقی دلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے دروازے تک پہنچا دے۔ فطرت کا دروازہ کھلتے ہی انسان خدا کو اس طرح پا لیتا ہے جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔

انسان کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو ضرورت ہوتی ہے کہ سورج کے وجود کو اس کے لیے دلائل سے ثابت کیا جائے۔ لیکن جب آنکھ کی پٹی ہٹا دی جائے تو اس کے بعد سورج کو ماننے کے لیے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خدا کا ہے۔ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں آخری حد تک سمایا ہوا ہے۔ اصل ضرورت صرف فطرت کا پردہ ہٹانے کی ہے۔ دلیل کے ذریعہ جب فطرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو انسان خدا کو اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے جتنا کہ ایک کھلی آنکھ والا انسان آفتاب کو۔

دنیا اور آخرت

بیج ڈالنے کے دن جو کسان فصل کاٹنا چاہے، وہ بیج کو بھی کھوئے گا اور فصل سے بھی محروم رہے گا۔ یہی معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت اس کا انعام پانے کی جگہ۔ جو شخص دنیا ہی میں ''انعام'' حاصل کرنا چاہے تو وہ اس قیمت پر ہوگا کہ وہ مطلوب عمل انجام نہ دے سکے گا۔ وہ آخرت کی تعمیر کے واحد موقع کو کھو دے گا۔

جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو آدمی موجودہ دنیا میں پانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں ہی کو کھو دیتا ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو دنیا کے ذریعہ آخرت کو خرید ے، نہ کہ دنیا میں پھنس کر اپنے آپ کو آخرت سے محروم کرلے۔

آپ سفر کے دوران وہ سکون حاصل کرنا چاہیں جو صرف گھر پر کسی آدمی کو ملتا ہے تو آپ کبھی اپنی اس طلب میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی مثال سے دنیا اور آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ دنیا کو خدا نے عمل کرنے کی جگہ بنایا ہے اور آخرت کو عمل کا انجام پانے کی جگہ۔ یا دنیا سفر کا راستہ ہے اور آخرت اس کی منزل۔

اب اگر آپ چاہیں کہ دنیا ہی میں اپنا انجام پالیں تو آپ کے عمل کی منصوبہ بندی بالکل غلط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر آپ راستہ میں منزل والا سکون حاصل کرنا چاہیں تو آپ اپنے راستہ کو کھوٹا کر لیں گے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے اس فرق کو سمجھے۔ وہ موت سے پہلے اس چیز کی خواہش نہ کرے جو صرف موت کے بعد والی زندگی میں کسی کو مل سکتی ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ حقیقت پسند بنے۔ وہ خواہشوں کے پیچھے نہ دوڑے۔ کیوں کہ خواہشیں آدمی کو گڑھے کے سوا کسی اور منزل پر پہنچانے والی نہیں۔

ہر آدمی اپنے سینہ میں خواہشات کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے۔ یہ خواہشات بجائے خود غلط نہیں۔ مگر ان خواہشات کی تکمیل کا مقام آخرت ہے نہ کہ موجودہ دنیا۔

دعوت کا عمل

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو آزمائش کے لیے پیدا کیا (الملک ۲) موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ یہ آزادی انسان کا ذاتی حق نہیں بلکہ وہ امتحان کی مہلت ہے۔ جو شخص خدا کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی گزارے گا اس کو خدا ابدی جنت میں جگہ دے گا اور جو شخص خدا کے نقشہ کے خلاف چلے گا اس کو خدا ابدی جہنم میں ڈال دے گا۔ یہ نقشۂ حیات کیا ہے۔ اس کو بتانے کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وان علینا للهدیٰ (اللیل ۱۲) یعنی یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستہ دکھائے:

Surely it is for God to guide mankind.

اس مقصد کے لیے خدا نے ایک قابل اعتماد انتباہی نظام (warning system) قائم کیا۔ اس انتباہ کے لیے خدا نے یہ کیا کہ انسان کی تاریخ کے آغاز ہی سے اپنے پیغمبر انسان کے پاس بھیجنا شروع کیا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ـــ اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے (النساء ۱۶۵) قرآن میں مزید بتایا گیا ہے کہ خدا کے یہ پیغمبر بلا وقفہ لگاتار بھیجے جاتے رہے (المؤمنون ۴۴)

پیغمبروں کے اس سلسلہ کی آخری کڑی محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب تھے۔ ۶۳۲ء میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ خدا کے فیصلہ کے مطابق، آپ کے بعد کوئی اور پیغمبر آنے والا نہیں۔ تاہم نبوت کے کام کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ پیغمبر آخر الزماں کے بعد لوگوں کو آگاہ کرنے کا یہ کام آپ کی امت کے ذریعہ انجام دیا جائے۔ خدا کے اس فیصلہ کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو (الحج ۷۸)

اس خدائی انتظام کے تحت یہ ہوا کہ پیغمبر آخر الزماں کے بعد حق کی پیغام رسانی کا کام آپ کی

امت کے ذریعہ ہونے لگا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے لے کر اٹھارویں صدی کے نصف اول تک یہ کام بذریعہ امت مسلسل جاری رہا۔ اس کے بعد خدا نے اپنے خصوصی انتظام کے تحت دعوت کے اس کام کو خود انسانی تاریخ میں ایک عمل (process) کے طور پر داخل کر دیا۔ اس طرح اس انتہاہی نظام کے تین دور قرار پاتے ہیں۔

۱۔ رسولوں کے ذریعہ آغاز انسانیت سے ساتویں صدی کے نصف اول تک۔

۲۔ امت محمدی کے ذریعہ ساتویں صدی کے نصف ثانی سے لے کر اٹھارویں صدی کے نصف اول تک۔

۳۔ تاریخی عمل کے ذریعہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بعد کے زمانہ تک۔

پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت کو دنیا کے بڑے رقبہ میں سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس اقتدار کے زمانہ میں مسلمان نسل در نسل کم و بیش دعوت کے عمل کو انجام دیتے رہے۔ اس پر امن دعوتی عمل کی تفصیل ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی ۵۰۸ صفحہ کی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے:

The preachings of Islam (1896)

اٹھارویں صدی میں یہ ہوا کہ یورپ کی نو آبادیاتی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہو کر اٹھیں اور انہوں نے پوری مسلم دنیا پر سیاسی غلبہ قائم کر دیا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، مسلمانوں کے لیے یہ داخلی احتساب (introspection) کا وقت تھا مگر مسلم رہنما ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے اس وقت مسلمانوں کو شکایت اور احتجاج میں مبتلا کر دیا۔ وہ غالب قوموں کے خلاف نفرت اور انتقام کی نفسیات میں جینے لگے۔

یہ منفی ذہن ابتداءً یورپی قوموں کے خلاف پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ پھیلتا رہا یہاں تک کہ وہ تمام غیر مسلم قوموں تک پہنچ گیا۔ یورپی، امریکی، عیسائی، یہودی، ہندو، غرض دنیا کی تمام قومیں مسلمانوں کے لیے نفرت کا موضوع بن گئیں۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دعوت الی اللہ کے کام کے لیے پوری طرح نااہل ہو گئے۔ انسانی خیر خواہی (human interest) ان کا کنسرن (concern)

نہ رہا۔ وہ اپنی قوم اور غیر قوم کی متعصبانہ تقسیم میں جینے لگے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلمانوں کی ۵۷ آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مگر مسلمانوں کی نفرت اغیار بدستور باقی ہے۔ کیوں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں کو دینا چاہتے تھے۔

اب مسلمانوں میں دعوتی تحریکوں کے بجائے جہادی تحریکیں جاری ہوگئیں۔ پہلے صوفیاء پرامن دعوتی تحریک کی علامت تھے۔ اب یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا میں سیاسی تحریکیں مسلح جہاد کی علامت بن کر ابھر آئیں۔ صوفیاء کا مزاج صلح کل (peace with all) کے اصول پر قائم تھا۔ لیکن ردعمل کے تحت اٹھنے والی سیاسی تحریکوں کا نعرہ یہ ہوگیا کہ — آؤ ہم جنگ کریں، آؤ ہم جنگ کریں، کیوں کہ جنگ ہی کامیابی کا راستہ ہے:

هلم نقاتل هلم نقاتل فان القتال سبيل الرشاد

جہاد و انقلاب کے نام پر اٹھنے والی ان سیاسی تحریکوں نے ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں کو نفرت کا موضوع بنا دیا۔ ان کی سوچ نفرت کی سوچ بن گئی۔ تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان نفرت کی زبان میں کلام کرنے لگے۔ اس طرح ساری دنیا کے مسلمانوں نے یہ صلاحیت کھودی کہ وہ غیر مسلم قوموں کو خدا کے دین کا پیغام پہنچا سکیں۔

مگر خدا کا انتباہی نظام (warning system) رکنے والا نہ تھا۔ خدا جس طرح سورج کے ذریعہ مادی روشنی دنیا والوں کو پہنچا رہا ہے۔ اسی طرح خدا کو یہ مطلوب ہے کہ دعوت اسلام کے ذریعہ سچائی کی روشنی بلا انقطاع دنیا والوں تک پہنچتی رہے۔ چنانچہ جب مسلمان اپنی منفی نفسیات کی بنا پر دعوت کے کام کے لیے نا اہل ہو گئے تو وہ واقعہ ہوا جس کو مسیح نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر انسان چپ رہیں تو پتھر چلا اٹھیں گے:

I tell you that if these should keep silent, the stones would immediately cry out. (Luke, 19:40)

واقعات بتاتے ہیں کہ ۱۹ ویں صدی اور ۲۰ ویں صدی میں مسلمانوں نے دعوت کا عمل

پوری طرح چھوڑ دیا۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی مدعو قوموں کو اپنا دشمن سمجھ لیا۔ وہ ان کو ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ ان کی مسجدوں میں مدعو قوموں کے خلاف ہلاکت اور تدمیر دیار کی بددعائیں ہونے لگیں۔ ان کے نوجوان مدعو قوموں کے خلاف ہر ممکن تشدد کرنے لگے۔ اس طرح دعوتی عمل کے لیے مسلمانوں کی نااہلی آخری طور پر ثابت ہو گئی۔ اس بنا پر مسلمانوں کے ساتھ خدا کا معاملہ وہ ہوا جس کو بائبل کے ایک پیغمبر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وہ مردود چاندی کہلائیں گے کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے:

People will call them rejected silver, because the Lord has rejected them. (Jeremiah, 6:30)

اب دعوتی عمل کا وہ دور شروع ہوا جس کو ہم نے تیسرا دور کہا ہے۔ اب خدا نے یہ کیا کہ خود تاریخ انسانی میں دعوت کے کام کو ایک پراسس (process) کے طور پر داخل کر دیا۔ یہ پراسس اس دور میں شروع ہوا جس کو دوسرے الفاظ میں مابعد سائنسی دور (post-scientific era) کہا جاتا ہے۔ اس تاریخی عمل کا اشارہ حدیث میں ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:

لایبقی علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا ادخله الله کلمة الاسلام (مسند احمد ۶/۴) یعنی زمین کی سطح پر کوئی گھر یا خیمہ نہیں بچے گا مگر یہ کہ خدا اس کے اندر اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا۔

اس حدیث میں کلمۂ اسلام کی عمومی اشاعت کے عمل کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے جب کہ دعوت کے پہلے دور میں اس کو رسولوں کی طرف اور اس کے دوسرے دور میں اس کو امت محمدی کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ گویا انسانی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دعوت کے تیسرے دور میں خدا دعوتی عمل کا چارج خود اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ مذکورہ حدیث میں اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ جب ایسا ہوگا تو دعوتی عمل کی رفتار بھی بہت تیز ہو جائے گی۔

موجودہ زمانہ میں یہ تیسرا دعوتی منصوبہ پوری طرح واقعہ بن چکا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

مسلمانوں کی طرف سے کسی دعوتی کوشش کے بغیر اسلام اپنے آپ نہایت تیزی سے پورے کرۂ ارض میں پھیل رہا ہے۔ مسلمان اپنی منفی سیاست کی بنا پر اپنی مسجدوں میں غیر مسلم قوموں کے لیے اللھم اھلکھم، اللھم دمر دیارھم کی بددعائیں کر رہے تھے۔ مگر خدا اس کے برعکس غیر مسلموں کے دل میں دین حق کی آواز پہنچا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ غیر مسلم قومیں تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہونے لگیں۔

مذہب کے حوالے سے حال میں جو عالمی جائزے شائع ہوئے ہیں ان کے مطابق، اس وقت صرف امریکا میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ (100,000) لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مختلف عالمی جائزوں کے مطابق، اسلام اس وقت ہر دوسرے مذہب کے مقابلہ میں زیادہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ان رپورٹوں میں اس قسم کے الفاظ پڑھنے کو ملتے ہیں:

1. Islam is the fastest growing religion in the world.

2. Islam is world's fastest growing religion.

3. The religion of Islam is growing faster than any other religion in the world. (Radiance weekly, New Delhi, 19-25 Dec. 2004)

اسلام کی یہ تیز رفتار اشاعت اتفاقی نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کی کسی دعوتی کوشش کا نتیجہ بھی نہیں۔ وہ مکمل طور پر خدا کی منصوبہ بندی کے تحت پیش آیا ہے۔ یہ واقعہ خدا کے اس قانون کے تحت ظاہر ہوا ہے جس کو مذکورہ حوالہ کے مطابق بائبل میں اس طرح کہا گیا تھا کہ انسان اگر نہ بولیں تو پتھر بولیں گے (If man failed to speak, stones would speak)۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے دوسری قوموں کو قابل نفرت سمجھ کر ان کو اسلام کی طرف بلانا چھوڑ دیا تو ''پتھر'' خدا کی طرف سے بولنے لگے۔ اس تاریخی عمل کو سمجھنے کے لیے یہاں اس نوعیت کی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلی تبدیلی وہ ہے جس کو پرنٹنگ پریس کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ یہ ایک بہت دیر طلب کام تھا۔ کیوں کہ لمبی مدت کے بعد صرف چند کتابیں ہاتھ سے لکھ کر تیار کی جاسکتی تھیں۔ پرنٹنگ پریس کی دریافت نے اس کو ممکن بنادیا کہ کسی کتاب

کا ایک صحیح نسخہ لکھا جائے اور پھر بہت کم مدت میں اس کی لاکھوں کاپیاں تیار کر لی جائیں۔ اس طرح چھپی ہوئی کتابوں کے ذریعہ اشاعت اسلام کا عمل سیکڑوں گنا زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہو گیا۔ کتابوں کے مطالعہ کے ذریعہ لاکھوں لوگ اپنے آپ اسلام کے قریب آئے۔ مثلاً ہنگری کے مستشرق ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس نے اسی طرح کتابوں کے ذریعہ سے اسلام کو جانا اور اس کو قبول کر لیا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں نئی قسم کی تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں، اسٹیم شپ، ریلوے ٹرین، موٹر کار، ہوائی جہاز، وغیرہ۔ ان نئی سواریوں کی ایجاد کے بعد سفر بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دنیا میں اختلاط (interaction) میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ لوگ دنیا کے ہر حصہ میں آنے اور جانے لگے۔ اس طرح انسانی اختلاط کے دوران براہ راست یا بالواسطہ طور پر دعوت کا عمل ہونے لگا۔ اس کی ایک مثال آسٹریا کے لیوپولڈ اسد کی ہے۔ وہ جرنلسٹ کے طور پر سعودی عرب گئے۔ وہاں لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران اُنہوں نے اسلام کو دریافت کیا اور پھر بطور خود اسلام میں داخل ہو گئے۔

۳۔ موجودہ زمانہ میں ٹیلی ویژن نے اتنا زیادہ پھیلاؤ حاصل کیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر گھر میں ٹی وی سٹ پہنچ گیا ہے۔ ٹی وی نے جس طرح دوسری خبروں کو نشر کیا اسی طرح اسلام کے متعلق خبروں کو بھی وہ روزانہ نشر کرنے لگا۔ مثال کے طور پر سعودی عرب کے شاہ فیصل کو جب گولی ماری گئی تو آخر وقت میں ان کی زبان سے نکلا **أشهد ان لا الـه الا الله وأشهد ان محمدا عبده و رسوله**۔ اس واقعہ کو ساری دنیا میں ٹیلی ویژن اسکرین پر باتصویر انداز میں دکھایا گیا۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جو ہر دن ٹی وی اسکرین پر آتے رہتے ہیں اور اس طرح اسلام کا پیغام کسی نہ کسی صورت میں ہر گھر میں پہنچ رہا ہے۔ میرے ذاتی علم کے مطابق، دہلی کے ایک بڑے تاجر رام رتن کپلا ٹی وی کے پروگراموں کو دیکھ کر اسلام سے متعارف ہوئے اور پھر اسلام قبول کر لیا۔

۴۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں جو نئی چیزیں پیدا ہوئیں اُن میں سے ایک وہ ہے جس کو روح تجسس (spirit of enquiry) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی نئی نئی دریافتوں نے لوگوں کے

اندر بہت بڑے پیمانہ پر تجسس کی روح جگادی۔ یہ تجسس مادی دنیا کے مطالعہ سے شروع ہوا اور پھر وہ تمام شعبوں تک پھیل گیا۔ چنانچہ اس کے زیر اثر مذاہب کا مطالعہ بھی بہت بڑے پیمانہ پر کیا جانے لگا۔ انسانی تاریخ میں یہ ایک نیا ظاہرہ تھا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام سے متعارف ہوئے۔ مثال کے طور پر بنگال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا اسی طرح اسلام کے قریب پہنچے اور پھر وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

قدیم زمانہ میں مذاہب کا مطالعہ متعصبانہ انداز میں کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ چیزوں کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں مذاہب کا غیر متعصبانہ مطالعہ پیدا ہوا۔ مطالعہ کا یہ سلسلہ اسلام تک بھی پہنچا۔ چنانچہ میرے ذاتی علم کے مطابق، موجودہ زمانہ میں اسلام کے موضوع پر لکھی جانے والی اکثر بہترین کتابیں وہ ہیں جو غیر مسلموں نے لکھی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

1. Prof. T.W. Arnold, The preachings of Islam.
2. Dr. Mourice Bukaue, Bible, The Science and Qur'an.
3. Dr. Michael H. Hart, The 100
4. Karen Armstrong, Mohammad

۶۔ سائنسی تحقیقات کے تحت جو چیزیں دریافت ہوئیں وہ اصلاً سیکولر تحقیق کا نتیجہ تھیں۔ مگر ان کے ذریعہ سے بہت سے ایسے حقائق سامنے آئے جو قرآن کے عقائد کی سائنسی تصدیق کے ہم معنٰی تھے۔ ان حقائق کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک تحقیق کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، وہ ہے بگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ۔

۷۔ جدید دور میں جو فکری انقلابات آئے ان میں سے ایک اہم انقلاب وہ تھا جس کو مذہبی آزادی (religious freedom) کہا جاتا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ آج انسان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوئی۔ جب تک کوئی شخص تشدد نہ کرے اس کو مذہب کی مکمل آزادی حاصل رہے گی۔ اسی آزادی نے اس قدیم برائی کو ختم کیا جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا

ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مسیحی دنیا میں اتنے بڑے بڑے اسلامی مراکز قائم ہیں جو مسلم ملکوں میں بھی نہیں۔ اس تبدیلی نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے تمام بند دروازے کھول دیے۔ اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اقوامِ عالم کی عالمی تنظیم (U.N.O) کے تحت دنیا کی تمام قوموں نے سرکاری طور پر یہ اعلان کیا کہ ان کے ملکوں میں لوگوں کو کامل مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ کسی کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی کی مذہبی آزادی میں رکاوٹ ڈالے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ کسی رکاوٹ کے بغیر اسلام کا پیغام ہر جگہ پہنچنے لگے۔

۸۔ جدید دور میں سائنسی مطالعہ نے ایک کام یہ کیا ہے کہ اُس نے شرک کی نظریاتی جڑ کاٹ دی۔ قدیم زمانہ میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جب کئی طرح کی چیزیں ہیں تو خداؤں کی تعداد بھی کئی ہوگی۔ اسی کے زیر اثر شرک (polytheism) کا عقیدہ پیدا ہوا۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ بظاہر مختلف ہونے کے باوجود تمام چیزوں کی اصل بالآخر ایک ہے۔ اور وہ ایک برقی لہر ہے جس کو الکٹران (electron) کہا جاتا ہے۔ اسی لیے ایک سائنسداں نے کہا ہے کہ:

The world is nothing but a mad dance of electrons.

اس طرح جدید دریافت نے شرک کو بے بنیاد ثابت کیا اور توحید کے حق میں ایک نظریاتی بنیاد فراہم کردی۔

۹۔ موجودہ زمانہ میں جو نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو ادارے (institutions) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں انسانی سماج میں صرف ایک ہی ادارہ ہوا کرتا تھا، اور وہ سیاسی ادارہ تھا جس میں صرف بادشاہ کو سپریم حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں سیاست کا دائرہ محدود ہوگیا اور یہ ممکن ہوگیا کہ غیر سیاسی ادارے قائم کر کے وہ سب کچھ آزادانہ طور پر کیا جاسکے جس کو پہلے صرف سیاسی ادارہ کے تحت ہی ممکن سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار سیاسی اقتدار کا مرکزی رول ختم ہوگیا۔ اب سیاسی اقتدار کے بغیر سب کچھ کرنا ممکن ہوگیا۔ اس عموم میں بلاشبہہ مذہب کی آزادانہ اشاعت بھی شامل ہے۔

۱۰۔حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللھم لاعیش الاّ عیش الآخرۃ (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الرقاق ،وأن لا عیش إلاّ عیش الآخرۃ)۔یعنی عیش (pleasure) دنیا میں نہیں، وہ صرف آخرت میں ہے۔اسلام دعوتِ آخرت ہے۔اس اعتبار سے اس حقیقت کا نہایت گہرا تعلق دعوت کے عمل سے ہے۔مگر قدیم زمانہ میں یہ حقیقت زیادہ تر عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔موجودہ زمانہ میں اس کی حیثیت ہر ایک کے لیے ذاتی تجربہ کی ہوگئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو خدا نے ایک معیار پسند (perfectionist) مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔مگر ہر ایک کو موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں موجودہ دنیا میں رہنا پڑتا ہے، اور یہ دنیا ایک غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے۔طالب اور مطلوب کے درمیان یہی وہ تضاد ہے جس کی بنا پر دنیا کا ساز وسامان کسی کو حقیقی طور پر خوشی نہیں دیتا۔موجودہ دنیا کی یہ صورت حال ایک خاموش پیغام ہے کہ اے انسان، تو اگر اپنی مطلوب خوشی کو پانا چاہتا ہے تو اس کو موت کے بعد کی دنیا میں تلاش کر۔کیوں کہ موت سے پہلے کی دنیا میں وہ تجھ کو ملنے والی ہی نہیں۔

اسلامی دعوت کے اعتبار سے یہ بات بہت زیادہ اہم ہے۔مگر قدیم زرعی دور میں صرف بڑے بڑے مالکان زمین (landlords) ہی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اس عظیم حقیقت کو ذاتی تجربہ کے تحت دریافت کرسکیں۔پنچانوے فیصد عوام اقتصادی ذرائع سے محروم ہونے کی بنا پر اس حقیقت کا ذاتی تجربہ کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھے۔وہ شعوری طور پر اس حقیقت سے غافل رہ کر صرف اس حسرت میں جیتے تھے اور مر جاتے تھے کہ اگر ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہم بھی دنیا کے اچھے سامان حاصل کرتے اور عیش وآرام کی زندگی گذارتے۔

موجودہ زمانہ میں صنعت اور ٹیکنالوجی میں جو ترقی ہوئی ہے اُس کا ایک پہلو وہ ہے جس کو اقتصادی انفجار (economic explosion) کہا جاسکتا ہے۔موجودہ زمانہ میں اقتصادی مواقع کے عمومی پھیلاؤ نے مال کو ہر آدمی کی دسترس تک پہنچا دیا ہے۔اب ہر آدمی کے لیے ممکن ہوگیا ہے کہ وہ

اچھے سامانِ حیات کے درمیان رہ سکے۔ اقتصادی توسیع کے اسی ظاہرہ کو حدیث جبریل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أن ترى الحفاة العراة يتطاولون في البنيان (صحیح البخاری)۔

موجودہ زمانہ کو کنزیومرزم (consumerism) کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانی تقاضے کے نتیجہ میں ہر عورت اور مرد کو یہ موقع ملا کہ وہ دنیا کی خوش نما چیزوں کو حاصل کر سکے اور ان کے درمیان جئے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ لوگ ان خوش نما چیزوں کے ملنے سے پہلے جتنے غیر مطمئن تھے، اُتنے ہی غیر مطمئن وہ اُن کے ملنے کے بعد بھی رہے۔ اس طرح مذکورہ حدیث میں بیان کی جانے والی حقیقت موجودہ زمانہ میں ہر عورت اور مرد کا ذاتی تجربہ بن گئی۔

اس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ جب لوگوں کو جنت کی طرف بلایا جائے تو یہ بات ہر ایک کے لیے ایک قابلِ فہم بات ہو۔ ہر ایک اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر یہ سمجھ سکے کہ اسلام میں جنت کی دعوت بلا شبہہ ایک حقیقی دعوت ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت میں دبے ہوئے جذبات کے تحت اپنے لیے ایک آئیڈیل دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ یہ آئیڈیل دنیا موت سے پہلے کی زندگی میں مل نہیں سکتی۔ وہ صرف موت کے بعد کی زندگی میں بشرطِ استحقاق ملے گی۔ اسلام کی یہ دعوت قدیم زمانہ میں زیادہ تر ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں وہ ذاتی تجربہ کے تحت ہر انسان کے لیے ایک معلوم حقیقت بن چکی ہے۔

دورِ جدید میں ظاہر ہونے والے ان واقعات نے اسلام کی دعوت و اشاعت کے لیے انتہائی وسیع نئے امکانات کھول دیے ہیں۔ یہ امکانات اتنے زیادہ طاقتور ہیں کہ وہ اپنے آپ لوگوں تک اسلام کو پہنچانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ مسلمانوں نے اگر چہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام چھوڑ دیا تھا مگر مذکورہ قسم کے نئے واقعات کی بنا پر دعوت کا کام خود خدائی انتظام کے تحت جاری ہوگیا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ خود اپنے زور پر اپنے دین کا پیغام ساری دنیا میں ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچا رہا ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ کوئی بھی عورت یا مرد اس پیغام سے بے خبر نہ رہے اور تمام انسانوں کے اوپر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

یہ نمبر موجود نہیں

آپ اگر اپنے ٹیلی فون پر کسی شخص کا نمبر ڈائل کریں اور کوئی غلط بٹن دب جائے تو آپ کی کال مطلوب شخص تک نہیں پہنچے گی۔ آپ کو دوسری طرف سے ہیلو کی آواز نہیں آئے گی بلکہ کمپیوٹرائزڈ سسٹم کے تحت یہ ہوگا کہ ٹیلی فون اکسچینج سے ریکارڈ کی ہوئی آواز سنائی دے گی۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۴ کو میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ میں نے اپنے ٹیلی فون پر دہلی کے ایک صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے یہ آواز سنائی دی — یہ نمبر موجود نہیں ہے:

This number does not exist.

اکسچینج کی یہ آواز سن کر اچانک میرے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ اس مادی واقعہ میں ایک بہت بڑا روحانی سبق موجود ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی انسان خدا سے ربط قائم کرنا چاہے اور وہ اپنے غلط ذہن کی بنا پر خدا کے سوا کسی اور کو اپنا خدا سمجھ بیٹھے اور خدا سمجھ کر اس کو پکارنے لگے تو اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا کہ براہِ راست خدا کی طرف سے تو اس کو کوئی جواب نہیں ملے گا۔ البتہ ایک اور آواز اس کو سنائی دے گی جو اس سے کہہ رہی ہوگی کہ تم نے جس خدا کو پکارا ہے وہ خدا سرے سے موجود نہیں:

This God does not exist

خدا کی طلب انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر خدا کو پانا چاہتا ہے۔ مگر تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں نے وہ غلطی کی جس کو شرک کہا جاتا ہے۔ حقیقی خدا کو پالینے کا نام توحید ہے اور حقیقی خدا کے سوا دوسری چیز کو خدا کا درجہ دے کر اس سے قلبی تعلق قائم کرنا شرک ہے۔ حقیقی خدا سے رشتہ قائم ہونا انسان کے لیے سب سے بڑی رحمت ہے۔ جس عورت یا مرد کا رشتہ خدا کے ساتھ قائم ہو جائے اس کی زندگی میں ہدایت کا نور آجائے گا۔ اس کے اندر ربانی شخصیت پیدا ہوگی۔ اس کو ذہنی ارتقاء کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص شرک میں مبتلا ہو وہ اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی خدا کا نام لیتا ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی چیز کو خدا کا درجہ دے کر اس کو اپنا لیتا ہے۔ مگر جہاں تک خدا کی رحمت اور ربانی شخصیت کا تعلق ہے، اس کا کہیں وجود نہیں۔ اس کا سبب واضح طور پر یہی ہے کہ لوگ غیر خداؤں کو اپنا خدا بنائے ہوئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی غیر خدا کو ٹیلی فون کر رہے ہیں۔ مگر جواب میں ہر ایک کے پاس یہ آواز آرہی ہے کہ جو نمبر تم نے ڈائل کیا ہے وہ نمبر موجود نہیں، جس کو تم خدا سمجھ کر پکار رہے ہو اس خدا کا کہیں وجود ہی نہیں، اس لیے تم کو اس کی طرف سے کوئی جواب بھی ملنے والا نہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

سچا پکارنا صرف خدا کے لیے ہے۔ اور اس کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی اس سے زیادہ دادرسی نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو تاکہ وہ اس کے منھ تک پہنچ جائے اور وہ اس کے منھ تک پہنچنے والا نہیں۔ اور منکرین کی پکار سب بے فائدہ ہے (الرعد ۱۴)

ہر آدمی کی یہ پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ حقیقی خدا کو دریافت کرے اور پھر یہ معلوم کرے کہ اس خدا سے ربط قائم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ اس دریافت کے بغیر انسانی زندگی نہ صرف نامکمل ہے بلکہ وہ یقینی طور پر تباہی کے انجام سے دوچار ہونے والی ہے۔ یہی کسی انسان کا سب سے بڑا مقصد ہے، یہی انسان کی جدوجہد کا سب سے بڑا نشانہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ جس انسان کی زندگی اس دریافت سے خالی ہو وہ بلاشبہہ سب سے بڑا مفلس ہے، خواہ بظاہر اس نے مادی چیزوں کا ڈھیر اپنے گرد اکھٹا کر لیا ہو۔

مزید سنگین بات یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ موقع صرف قبل از موت مدت حیات میں ملتا ہے۔ بعد از موت کی مدت حیات میں کسی انسان کو یہ موقع ملنے والا نہیں۔ انسان کے لیے اُس کے خالق کا بنایا ہوا قانون یہ ہے — موت سے پہلے کی زندگی میں کرنا، اور موت کے بعد کی زندگی میں صرف بھگتنا۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

۲۵ جولائی ۲۰۰۴ کا واقعہ ہے۔صبح کے وقت میں دہلی میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر میں نے اپنا ریڈیو کھولا تو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے صبح کے نشریہ میں ایک مذہبی گیت سنائی دینے لگا۔اس کی ایک لائن یہ تھی:

سجن رے جھوٹ مت بولو خدا کے پاس جانا ہے   نہ ہاتھی ہے نہ گھوڑا ہے وہاں پیدل ہی جانا ہے

اس تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ریڈیو کا گیت اور چڑیوں کا نغمہ دونوں ایک ہیں۔ گویا کہ ریڈیو اسی حقیقت کا اعلان ملفوظ زبان میں کر رہا ہے جس کا اعلان اس سے پہلے چڑیاں غیر ملفوظ زبان میں کر رہی تھیں۔ دونوں کا پیغام ایک ہے—اے انسان، تو جس دنیا میں ہے وہ خدا کی دنیا ہے۔ تیری کامیابی کا راز یہ ہے کہ تو اس بنیادی حقیقت کو جانے اور اپنی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق ڈھال لے۔

زندگی امتحان کی ایک مدت ہے اور موت اس مدت امتحان کا خاتمہ۔ موت گویا مالک کائنات کی طرف سے انسان کی گرفتاری ہے۔ موت کے بعد ہر عورت اور مرد خدا کی عدالت میں پہنچا دیے جاتے ہیں تاکہ وہ وہاں اپنے قول و عمل کا حساب دیں۔ اسی حساب کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے مستقبل کا فیصلہ کیا جانا ہے۔ خدا کے حکم پر چلنے والوں کے لیے جنت کا فیصلہ، اور خدا کے حکم کے خلاف چلنے والوں کے لیے جہنم کا فیصلہ۔

لوگ ہر سال اپنا برتھ ڈے مناتے ہیں۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ایک اور سال پورا ہو گیا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ ہر سال اپنا ڈِتھ ڈے منائیں۔ وہ ہر سال یاد کریں کہ ان کی مقرر زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا۔ اس دنیا میں ہر عورت اور مرد ایک محدود مدت کے لیے آتے ہیں— پچاس سال، نوّے سال، بہت سے بہت سو سال۔ اس کے بعد ہر ایک کے لیے مقدر ہے کہ وہ اپنی عمر کی طے شدہ مدت پوری کر کے مر جائے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ہر عورت اور ہر مرد کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ ہر نیا سال جب آتا ہے تو وہ ہر عورت اور ہر مرد کی عمر کا ایک سال اور کم کر دیتا ہے۔

موت ایک ایسا آنے والا واقعہ ہے جو ہر ایک پر آتا ہے۔ موت ایک چیتاونی ہے، وہ یاد دلاتی ہے کہ آخر کار ہر عورت اور مرد کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ خدا کی عدالت میں حاضری کی مدت بہت قریب ہے۔ موت ہر ایک کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اے سونے والو، جاگ اٹھو، اور اے جاگنے والو، ہوشیار ہو جاؤ۔ تم جلد ہی خدا کی کائناتی عدالت میں حاضر کئے جانے والے ہو۔ اس آنے والے بڑے دن کی تیاری کرو۔

ہر صبح کو جب آسمان پر سورج طلوع ہوتا ہے تو گویا کہ خدا اپنی کائناتی ٹارچ کو جلا کر انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ خدا ہر عورت اور ہر مرد کو دیکھ رہا ہے۔ بولنے والوں نے کیا بولا اور چلنے والے کس راہ پر چلے، کسی عورت یا مرد کو خدا نے جو کچھ دیا ہے اس نے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ ہر چیز سے خدا پوری طرح آگاہ ہے۔

یہ صورت حال پکار کر ہر عورت اور ہر مرد سے کہہ رہی ہے کہ تم جب سوچو تو یہ دھیان میں رکھ کر سوچو کہ خدا تمہاری سوچ تک کو جانتا ہے۔ جب تم بولو تو یہ سوچ کر بولو کہ تمہارے الفاظ دوسرے انسان تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ جب تم کوئی کام کرو تو یہ سمجھ کر کرو کہ تمہارا ہر کام خدا کی نظر میں ہے اور ہر کام پر تم کو خدا کی طرف سے سزا یا انعام ملنے والا ہے۔

ہر پیدا ہونے والی عورت اور ہر پیدا ہونے والے مرد پر لازم ہے کہ وہ خدا رخی زندگی (God-oriented life) کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ وقتی خواہشوں سے بلند ہو اور وہ روش اختیار کرے جو اس کے ابدی مستقبل کے لیے کارآمد ہو۔

ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو پہچانے۔ وہ خدا کی خدائی کا اقرار کرے۔ وہ خدا کے آگے پوری طرح جھک جائے۔ وہ خدا کا کامل پرستار بنے۔ وہ اپنے دماغ کو برے خیالات سے پاک کرے۔ وہ لوگوں کا خیر خواہ بنے نہ کہ بدخواہ۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرے۔ وہ ایسے مال کو اپنے لیے حرام سمجھے جو جائز طور پر اس کا حق نہیں۔ اس کو کوئی عہدہ ملے تو اس عہدہ کو وہ ایک ذمہ داری سمجھے نہ کہ ایک اعزاز۔ وہ نفرت اور تشدد سے پوری طرح اپنے آپ

کو بچائے۔ وہ حسد اور بغض اور کینہ کو اپنے لیے ہلاکت سمجھے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے۔ وہ اپنے سماج کا ایک پرامن شہری بنے۔ وہ دوسروں کی مدد کرنے والا ہو۔ وہ جب بھی بولے اور جب بھی کوئی کام کرے تو یہ سوچ کر بولے یا کرے کہ اس کا یہ عمل خدا کی پسند کے مطابق ہے یا خدا کی پسند کے خلاف۔ اس کا ضمیر جس کام کو خدا کی پسند کا کام بتائے اس کو وہ اپنا لے اور جس کام کو اس کا ضمیر خدا کی پسند کے خلاف بتائے اس سے وہ اسی طرح بچے جس طرح کوئی شخص آگ سے بچتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور ہر مرد کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک جہنم کا راستہ اور دوسرا جنت کا راستہ۔ جو آدمی اپنی خواہشوں کے پیچھے چلے وہ گویا جہنم کی طرف جارہا ہے اور جو آدمی خدا کے حکم اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں چلے وہ جنت کی طرف جارہا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ وقتی فائدے کے بجائے ابدی فائدے کو سامنے رکھے اور وقتی مفاد کے بجائے ابدی کامیابی کے لیے عمل کرے۔ ہر عورت اور ہر مرد کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ خالق کے تخلیقی نقشہ کو جانے تاکہ اس کے مطابق وہ اپنی زندگی کی درست منصوبہ بندی کر سکے۔ تاکہ وہ بھٹکے بغیر اپنی حقیقی منزل تک پہنچ جائے۔

انسانی زندگی کی مثال آئس برگ جیسی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ (ٹپ) آج کی دنیا میں دکھائی دیتا ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کو پیدا کرنے والے نے انسان کو ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اور پھر اس کی عمر کے بہت چھوٹے حصہ کو موجودہ دنیا میں رکھا اور اس کے بڑے حصہ کو اگلی دنیا میں رکھ دیا۔ اور پھر اس کے لیے مقدر کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کے امتحانی حصہ کو موجودہ مختصر دنیا میں گزارے اور اپنی بقیہ طویل عمر گزارنے کے لیے موت کے بعد اگلی دنیا میں پہنچا دیا جائے۔

موجودہ دنیا کیا ہے اور اگلی دنیا کیا۔ موجودہ دنیا ناقص دنیا ہے اور اگلی دنیا کامل دنیا۔ موجودہ دنیا انسان کے لیے ٹسٹ کی جگہ ہے اور اگلی دنیا ٹسٹ میں پورا اترنے کی صورت میں انعام پانے کی جگہ۔

اگلی دنیا میں خدا نے ایک معیاری دنیا بنائی اسی کا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا اس معیاری دنیا کا ایک ناقص نمونہ ہے۔ جنت آج کی ناقص دنیا کی ایک زیادہ کامل صورت ہے۔ جنت ایک

ابدی دنیا ہے جب کہ موجودہ دنیا صرف ایک فانی دنیا۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں وہ لوگ چنے جا رہے ہیں جو اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ جنت کی اعلیٰ دنیا میں بسائے جانے کے اہل ہیں۔ سلکشن کی یہ مدت جب پوری ہوگی تو منتخب افراد جنت کی معیاری دنیا میں پہنچا دئے جائیں گے، جہاں نہ کوئی تکلیف ہے اور نہ کوئی اندیشہ، جہاں نہ کوئی شور ہے اور نہ کوئی مصیبت۔ اور جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں انہیں کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ آج کی دنیا میں لوگوں کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر عورت اور ہر مرد بے اطمینانی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن کو بظاہر دنیا کے سارے سامان حاصل ہیں، وہ بھی مطمئن نہیں۔ اس بے اطمینانی کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے معیاری دنیا (ideal world) کا طالب ہے جب کہ موجودہ دنیا اپنے سارے سازوسامان کے باوجود ایک غیر معیاری دنیا ہے۔ انسان کی طلب اور موجودہ دنیا کے درمیان یہی فرق بے اطمینانی کا اصل سبب ہے۔

جنت میں یہ فرق ختم ہو جائے گا۔ وہاں کی جنت عین وہی معیاری دنیا ہوگی جس کی طلب انسان اپنے اندر فطری طور پر پاتا ہے۔ جنت میں ہر عورت اور ہر مرد کو پورا فل فلمنٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ وہاں ہر ایک اپنی طلب کے مکمل جواب کو پالے گا۔

یہی وہ جنت کی معیاری دنیا ہے جس کے بارے میں پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گزرا (لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر)

انسان کو اس کی ابدی عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل مسئلہ دنیا کی کامیابی یا دنیا کی ناکامی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگلی دنیا میں جہنم کی سزا سے بچے اور اپنے آپ کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنائے۔ ایسی حالت میں انسان کو چاہیے کہ وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرے، اور وہ جنت کا سب سے زیادہ خواہش مند بنے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی حقیقت پسندی کا تقاضا بھی۔

ناشکری کا فتنہ

۱۲ جولائی ۲۰۰۴ کی شام کو دہلی کے ای ٹی وی (Eenadu TV) کے اسٹوڈیو میں ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس کا موضوع ''ہندستانی مسلمان اور ریزرویشن'' تھا۔ اس میں میرے سوا دہلی کے چار معروف مسلم دانشور شریک تھے۔ یہ ڈسکشن ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

مذکورہ چاروں مسلم دانشوروں کی رائے زیر بحث موضوع پر تقریباً ایک جیسی تھی۔ ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ ہندستانی مسلمان ایک پچھڑی ہوئی کمیونٹی (backward community) بن گئے ہیں اور اب مسلمانوں کو ملک کے دوسرے فرقوں کے برابر لانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن دیا جائے۔ ریزرویشن کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہندستانی مسلمانوں کی پسماندگی کی بات محض ایک افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں نے اس ملک میں تقریباً سوگنا زیادہ ترقی کی ہے حتیٰ کہ اقتصادی اعتبار سے آج وہ مغل حکومت کے زمانہ سے بھی زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ آپ کسی بھی شہر یا گاؤں کا سروے کر کے اس حقیقت کو جان سکتے ہیں۔

آپ ایک ملک گیر سروے کریں اور مسلمانوں سے صرف ایک سوال پوچھیں۔ وہ یہ کہ ۱۹۴۷ میں تمہارے خاندان کی جو اقتصادی حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج تمہارے خاندان کی حالت کیا ہے۔ تقریباً ہر ایک سے آپ کو یہی جواب ملے گا کہ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج ہم بہت زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ پہلے اگر ہمارے پاس کچا مکان تھا تو اب ہمارے پاس پکا مکان ہے۔ پہلے اگر ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی تو آج ہمارے پاس جدید سواری موجود ہے۔ پہلے ہمارے پاس بجلی اور ٹیلی فون جیسی چیزیں موجود نہ تھیں مگر آج ہم کو یہ سب چیزیں حاصل ہیں۔ پہلے ہمارے بچے صرف معمولی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ آج ہمارے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ آپ ایک آسان جائزہ لیجئے۔ ملک میں ایسی بہت سی جماعتیں اور ادارے

موجود ہیں جو اپنے آپ کو ہندستانی مسلمانوں کا نمائندہ بتاتے ہیں۔ آپ ان نمائندہ جماعتوں اور اداروں کا سروے کیجئے اور دیکھئے کہ آج ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں ان کی حالت کیا ہے۔ مثلاً تبلیغی جماعت، جمعیۃ علمائے ہند، جماعت اسلامی ہند، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، دار العلوم، دیوبند، جامعہ دار السلام، عمر آباد، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڈھ، وغیرہ۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں اور آپ بھی تحقیق کے ذریعہ معلوم کرسکتے ہیں کہ یہ جماعتیں اور ادارے ۱۹۴۷ میں بالکل معمولی حالت میں تھے۔ آج ان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اب وہ کم از کم سوگنا زیادہ ترقی کرچکے ہیں۔ مالیات، بلڈنگ، کار، ٹیلی فون اور دوسری سہولتیں جو ۱۹۴۷ میں ان میں سے کسی کے پاس موجود نہ تھیں، آج ان میں سے ہر ایک کے پاس اس قسم کی سہولتیں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ایسی حالت میں پسماندگی کی بات کہنا صرف ناشکری کی زبان بولنا ہے نہ کہ حقیقت واقعہ کا اظہار۔

ہندستان میں روزنامہ دینک جاگرن کے سروے کے مطابق، اس وقت ۲۲ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے ہر شخص یکساں درجہ میں خوش حال نہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم۔ مگر اس فرق یا نابرابری کا تعلق کسی ملک یا حکومت سے نہیں۔ یہ فرق تمام تر فطرت کے قانون کی بنا پر ہے۔ وہ خود خالق کے تخلیقی نقشہ کے مطابق ہے۔ اس بنا پر یہ فرق مسلمانوں میں اور دوسری قوموں میں ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وصدقات کے بارے میں پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ: تؤخذ من اغنیاء کم و ترد إلی فقرائکم (صدقات تمہارے امیروں سے لیے جاتے ہیں اور وہ تمہارے غریبوں کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں)۔ اس شرعی حکم کے مطابق، سماج میں ہمیشہ امیر اور غریب دونوں قسم کے لوگ موجود رہتے ہیں۔ فرق کی یہ حالت پیغمبر اسلام کے بنائے ہوئے نظام میں بھی موجود تھی۔ اس کے بعد خلافت راشدہ، اموی سلطنت، عباسی سلطنت، فاطمی سلطنت، ایوبی سلطنت، مغل سلطنت، عثمانی سلطنت اور اسپینی سلطنت، غرض ہر دور میں یہ صورت حال موجود رہی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ علمائے اسلام نے اعلان کیا ہو کہ اب سماج میں فقراء باقی

نہیں رہے ہیں اس لیے زکوٰۃ وصدقات کے احکام اب منسوخ قرار پا گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلے چودہ سو برس کے دوران ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں مسلم معاشرہ کا اقتصادی اعتبار سے وہی حال رہا ہے جو آج ہندستان میں پایا جاتا ہے۔ مگر اسلامی تاریخ کی طویل مدت میں کبھی علمائے اسلام نے یہ اعلان نہیں کیا کہ مسلمان ایک پس ماندہ ملت بن چکے ہیں۔ یہ بدعت پہلی بار ہندستان کے نام نہاد رہنماؤں نے نکالی ہے اور اس کی حقیقت ایک سطحی سیاست کے سوا اور کچھ نہیں۔

آج کی دنیا میں ۵۷ مسلم ممالک ہیں۔ یہ وہ ممالک ہیں جہاں خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہے۔ لیکن ہر جگہ وہی اقتصادی فرق پایا جاتا ہے جو ہندستان میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں ہر دور میں اور ہر ملک میں یہ فرق موجود رہا۔ اس فرق کو مٹانا سرے سے ممکن نہیں۔

نئی دہلی کے مذکورہ ڈسکشن میں میں نے مزید کہا کہ "غریبی" کوئی برائی نہیں، غریبی ایک چیلنج ہے اور چیلنج ہی واحد چیز ہے جس کے ذریعہ تمام ترقیات ظہور میں آتی ہیں۔ چیلنج نہیں تو ترقی بھی نہیں۔ میں نے کہا کہ بڑی کامیابی حاصل کرنے والے تمام لوگ غریب خاندانوں میں پیدا ہوئے۔ کوئی سپر اچیور (super achiever) کبھی کسی بل گیٹ (Bill Gate) کے محل میں پیدا نہیں ہوا۔ ہمارے ملک میں جواہر لال نہرو کو چھوڑ کر تمام لیڈر غریب فیملی ہی میں پیدا ہوئے۔ اس کی ایک زندہ مثال صدر جمہوریہ ڈاکٹر عبدالکلام ہیں۔

اوپر میں نے مسلم دانشوروں کے بارے میں جس تجربہ کا ذکر کیا، وہ کوئی ایک تجربہ نہیں۔ ملک کے باہر اور ملک کے اندر ہر جگہ میں نے مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ سے اسی قسم کی بات سنی ہے۔ مسلمانوں کے اخبارات اور میگزین، مسلمانوں کے جلسے، مسلمانوں کی کتابیں، غرض ہر جگہ پسماندگی کی اسی مفروضہ کہانی کو دہرایا جا رہا ہے۔ ہر مسلم زبان اور ہر مسلم قلم یکساں طور پر مسلمانوں کی مظلومی اور پسماندگی کے خلاف شکایت اور احتجاج میں مشغول ہے۔

میں نے اس مسئلہ پر بہت زیادہ غور کیا۔ میں نے جاننا چاہا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ اس معاملہ کا

سب سے زیادہ عجیب پہلو یہ ہے کہ جو مسلم عالم یا دانشور مسلمانوں کی بدحالی پر لکھتے یا بولتے ہیں وہ خود تقریباً بلا استثناء ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ کم از کم میں نے اپنی لمبی عمر میں جس شخص کو بھی مسلمانوں کے مسائل پر لکھتے یا بولتے ہوئے دیکھا وہ اسی کی مثال تھا۔ یعنی وہ اپنے باپ دادا کے زمانہ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی مفروضہ حالت پر مرثیہ خوانی کر رہا تھا۔

ایک بار میں نے دیکھا کہ ہندستان کے ایک نوجوان عالم ایک عرب ملک میں گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہندستان کے مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں (مسلموا الهند بين فكي الرحىٰ) یہ مسلمان عالم ماشاءاللہ فربہ جسم کے تھے۔ ان کے لباس اور ان کے چہرہ پر خوش حالی نمایاں تھی۔ ان کے لہجہ میں بھی سکون اور اعتماد جھلک رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میرے بھائی، آپ بھی تو ایک ہندستانی شہری ہیں پھر کیسے آپ اس عام تباہی سے بچ گئے اور اگر آپ کے پاس ایسا کوئی نسخہ ہے جس کے ذریعہ آدمی تباہی کی عمومی حالت میں بھی شاندار زندگی حاصل کر سکے تو آپ بربادی کی داستان بتانے کے بجائے مسلمانوں کو یہی ذاتی نسخہ بتائیے۔

غور وفکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان ہر زمانہ میں ایک عمومی فتنہ برپا کرتا ہے۔ کسی انسان کا سب سے بڑا ٹسٹ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عمومی فتنہ سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

میرے نزدیک قدیم زمانہ کا فتنہ شرک تھا۔ اس زمانہ میں شیطان نے فکر وعمل کے تمام نقشوں کو اس طرح شرک کے رنگ میں رنگ دیا تھا کہ ہر عورت اور مرد اس کے اثر میں آ گئے۔ ہر ایک نے مشرکانہ کلچر کو اختیار کر لیا۔ یہ صورت حال جاری رہی، یہاں تک کہ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا فتنہ ناشکری کا فتنہ ہے جو یقینی طور پر شیطان کا پیدا کردہ ہے۔ شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ حالات کا غلط مطالعہ کراتا ہے اور اس طرح لوگوں کو بے

بنیادطور پر غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے واقعہ کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں جو ان کے قدموں کے نیچے موجود ہو۔

مثال کے طور پر دہلی میں ایک بار میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی۔ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے مگر آج وہ دہلی میں ایک شاندار مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس موٹر کار اور دوسری جدید سہولیات موجود ہیں۔ اُن کے بچے مہنگی تعلیم حاصل کرر ہے ہیں۔ مگر وہ بے تکان اس رواجی قول کو دہرا رہے تھے کہ ہندستان کے مسلمان اقتصادی اعتبار سے بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ بھی تو ایک ہندستانی مسلمان ہیں۔ مگر آپ راجدھانی میں ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر آپ اپنے ذاتی تجربہ سے سبق کیوں نہیں لیتے۔

پھر میں نے کہا کہ دہلی کا ہمدرد دواخانہ ۱۹۴۷ میں کرایہ کے ایک معمولی مکان میں تھا۔ مگر آج ہمدرد دواخانہ ایک ایمپائر بن چکا ہے۔ انہوں نے فوراً کہا کہ آپ ہمدرد دواخانہ کا تقابل ڈابر کمپنی سے کیوں نہیں کرتے جو ہمدرد دواخانہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ایک غیر منطقی بات کرر ہے ہیں۔ کیوں کہ آپ حضرات کا یہ کہنا ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا کی حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا اس لیے وہ بدحالی کے شکار ہو گئے۔ اس لیے اصل سوال کی نسبت سے ہم کو مسلمانوں کی ۱۹۴۷ کی اپنی حالت کا مقابلہ آج کے مسلمانوں کی اپنی حالت سے کرنا ہوگا اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

اصل یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ کسی دوسرے کے ظلم کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اپنے غلط مزاج کا ہے اور وہ مزاج ناشکری کا مزاج ہے۔ اسی مزاج کی بنا پر آج یہ حالت ہے کہ ہر مسلمان ناشکری کی زبان بول رہا ہے، خواہ وہ ایسی شاندار زندگی گزار رہا ہو جس کا اس کے باپ دادا نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بڑی بڑی جماعتیں اور ادارے قائم ہوئے ہیں۔ مگر کسی بھی جماعت یا ادارہ میں شکر خداوندی کا چرچا نہیں۔ مثال کے طور پر تبلیغی جماعت میں تعلیم

کے لیے ایک ضخیم کتاب تبلیغی نصاب یا فضائل اعمال کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں کئی چیزوں کے فضائل پر ابواب موجود ہیں مگر اس میں فضائل شکر کا کوئی باب نہیں۔ جماعت اسلامی میں (اسلام کے مکمل نظام) پر بہت سی کتابیں چھاپی گئی ہیں۔ مگر شکر خداوندی پر ان کے یہاں کوئی کتاب موجود نہیں۔ یہی حال دوسرے تمام اداروں کا ہے۔ مسلمانوں کے جلسوں میں دوسرے موضوعات پر جوشیلی تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر میرے علم کے مطابق، شکر خداوندی کے موضوع پر کوئی تقریر نہیں ہوتی۔

میں اپنے تجربہ کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے سب سے بڑی چیز جو اٹھ گئی ہے وہ شکر خداوندی کی اسپرٹ ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی محرومی یہی ہے۔ اسی محرومی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب ان کی زبان سے شکر کے کلمات نہیں نکلتے، ہر ایک بس ناشکری کے الفاظ بول رہا ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک بے حد خطرناک علامت ہے۔ ہماری اصلاحی کوششوں کا نشانہ یہی داخلی کمزوری ہونا چاہیے نہ کہ کوئی بیرونی خطرہ۔

ٹیلی ویژن کا استعمال

نئی دہلی کے اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے شمارہ ۱۱ اگست ۲۰۰۴ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ میں ٹی وی کے بارے میں دو مختلف ''فتووں'' کا ذکر ہے۔ ایک فتوے میں کہا گیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کے لیے ٹی وی کا استعمال جائز ہے۔ دوسرے فتوے میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ ٹی وی تفریح کا ذریعہ ہے جس پر فحش پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ دینی پروگرام کے لیے اس کا استعمال ناجائز ہے (صفحہ ۱)

اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنا ایک ایسا کام ہے جو اہل اسلام پر فرض ہے۔ اس کو ہر دور اور ہر حال میں انجام دینا ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ یہ کام اسی جگہ کیا جائے گا جہاں لوگ موجود ہوں یا اسی ذریعہ سے کیا جائے گا جو لوگوں تک پہنچنے والا ہو۔ کسی الگ تھلگ جزیرہ میں انفرادی طور پر یہ کام نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں یہ شرط لگانا کہ صرف اسی مقام پر یا اسی ذریعہ سے یہ کام کیا جائے گا جہاں کوئی برائی نہ ہو تو اس طرح سرے سے یہ کام ہی انجام نہ پائے گا کیوں کہ دوسرے لوگ کبھی ہماری شرطوں پر ہم کو نہیں مل سکتے۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ۶۱۰ء میں پیغمبری ملی۔ اس وقت وہاں یہ حال تھا کہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ گویا کہ کعبہ کو عملاً بت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ دوسری طرف یہ صورت حال تھی کہ اس وقت کے مکہ میں کعبہ ہی لوگوں کے لیے مقام اجتماع بنا ہوا تھا۔ مکہ کے لوگ روزانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ مکہ والوں تک دین توحید کا پیغام پہنچانے کے لیے جو قابل حصول مقام تھا وہ یہی کعبہ تھا۔ جہاں لوگ اپنے بتوں کی نسبت سے اکٹھا ہوتے تھے۔ کسی اور جگہ ان لوگوں کو پانا ممکن ہی نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں ایک حکمت اختیار کی۔ آپ نے بت کے معاملہ کو اور دعوت کے معاملہ کو ایک دوسرے سے الگ کر لیا۔ آپ نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ

جولوگ وہاں اکٹھا ہوتے ہیں وہ بتوں کی نسبت سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ آپ نے اس پہلو کو نظر انداز کر کے اُس وقت کعبہ کو صرف مقام اجتماع کے طور پر لیا اور وہاں جا کر وہاں کے موجود لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگے اور توحید کا پیغام دینے لگے۔ اس حکمت نبوی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔

یہی حکمت ہمیں ٹی وی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی دوسرے غیر مطلوب پروگرام جو ٹی وی میں آتے رہتے ہیں ان کو نظر انداز کر کے اس میڈیم کے ذریعہ اپنا دینی پروگرام پیش کرنا۔ کیوں کہ ٹی وی کے عمومی رواج کی بنا پر یہ صورت حال ہے کہ ہم کو زیادہ سامعین ٹی وی ہی کے ذریعہ مل سکتے ہیں، کسی اور ذریعہ سے ہمیں زیادہ سامعین نہیں ملیں گے۔

تاہم اس کا ایک اور پہلو ہے۔ اس کا تعلق ان پروگراموں سے ہے جو آج کل اسلامی پروگرام کے نام پر ٹی وی میں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام عملاً زیادہ مفید نہیں۔ ٹی وی کے دوسرے پروگراموں کی طرح ان اسلامی پروگراموں کو بھی تفریح کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ یہ پروگرام بھی اسلام کے نام پر تفریحی پروگرام ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ زیادہ تر اسلامی تفریح ہوتے ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی پروگرام۔

جولوگ ٹی وی دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ٹی وی کو استعمال کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق، اس اعتبار سے سب سے اچھی مثال مسیحی پروگرام کی ہے۔ اردو اور دوسری زبانوں میں روزانہ مسیحی پروگرام آتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام فنی اعتبار سے ممتاز طور پر بہتر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہر مسلم ملک میں اسلامی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ مگر میری معلومات کے مطابق، لوگ اس کو بہت کم دیکھتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب ان پروگراموں کا غیر معیاری ہونا ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس کا تجربہ ہوا ہے کہ کسی مسلم ملک میں میرا جانا ہوا۔ وہاں میں نے تحقیق کی کہ وہاں کے ٹی وی پر جو اسلامی پروگرام آتے ہیں اس کو لوگ کتنا زیادہ دیکھتے ہیں۔ معلوم

ہوا کہ بہت کم لوگ ٹی وی کے اس اسلامی پروگرام کو دیکھتے ہیں۔ اکثر مقام پر یہ حال ہے کہ جب ٹی وی پر اسلامی پروگرام آتا ہے تو گھر والے یہ کہہ کر اس کو بند کر دیتے ہیں کہ —— اس کو بند کرو، یہ تو سرکاری پروگرام ہے۔

برصغیر ہند کے تقریباً تمام مسلمان اقبال کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اقبال کا کلام ان لوگوں کے لیے صرف گنگنانے کا نغمہ ثابت ہوا ہے، نہ کہ زندگی کے لیے عملی رہنمائی لینے کا ذریعہ۔ مثلاً اقبال نے کہا تھا:

آئینِ نَو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اَڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مگر مسلمانوں، خاص طور پر مذہبی طبقہ کا یہ حال ہے کہ وہ ہر نئی چیز پر بھڑکتے ہیں۔ وہ ہر نئی چیز پر منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اسی کی ایک مثال ٹی وی ہے۔ مذہبی طبقہ کے درمیان ٹی وی کو اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے جتنا کہ شیطان کو۔

اس معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ٹی وی اور ٹی وی کے غلط استعمال کے درمیان فرق کیا جائے۔ ٹی وی تو ایک خدائی قدرت کا ظہور ہے۔ وہ خدا کے بنائے ہوئے فطری قانون کا استعمال ہے۔ ٹی وی کا طریقہ امکانی طور پر خود خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں چھپا ہوا تھا۔ انسان کا حصہ اُس میں صرف اتنا ہے کہ اُس نے اُس کو دریافت کر کے اُسے استعمال کیا۔ ٹی وی کی ٹیکنالوجی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی دین ہے نہ کہ کسی دشمن اسلام کی دین۔

یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ ٹی وی پر بہت سے غیر اخلاقی پروگرام آتے ہیں۔ مگر یہ ٹی وی کا غلط استعمال ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ غلط استعمال ہر چیز کا ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ ثابت شدہ طور پر مقدس چیزوں کا بھی۔ غلط استعمال کی بنا پر کسی چیز کو چھوڑ نہیں دیا جائے گا بلکہ اُس کے استعمال کو درست کیا جائے گا۔

اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ منفی ردعمل ظاہر کر کے الگ ہو جائے۔ اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ایک مثبت ذمہ داری ہے۔ اور یہ کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ ٹی وی

کے طریقہ کو فنی طور پر سمجھیں۔ وہ اس کے استعمال کی تفصیلات کو جانیں۔ وہ یہ دریافت کریں کہ ٹی وی کو کس طرح اصلاحی کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پھر مذہبی طبقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ضروری تیاری کے بعد ٹی وی کے لیے اعلیٰ درجہ کے اسلامی پروگرام تیار کرے، ایسا پروگرام جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ جس کو دیکھنے کے لیے لوگ راغب ہوں۔ جو آج کے انسان کے ذہن کو ایڈرس کرے۔

اسلام کا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہے بلکہ منفی حالات میں مثبت پہلو تلاش کرنے کا طریقہ ہے۔ اس کی ایک مثال قدیم کعبہ کی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور مرد کو آزادی دی گئی ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ موجودہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک رہے، کوئی ناخوشگوار بات پیش نہ آئے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ناموافق حالات موجود رہیں گے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ناموافق حالات کے درمیان موافق پہلو کو دریافت کریں اور اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

اس اصول کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ان مع العسر یسرا ۔یعنی جہاں مسائل ہیں، وہیں مواقع بھی موجود ہیں۔ تم مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ یہ ایک آفاقی حکمت ہے۔ اس حکمت کا تعلق ٹی وی سے بھی ہے اور دوسری تمام چیزوں سے بھی۔

حکمتِ علم

قومی بیداری

یونان کا ایک قدیم شہر ہے جس کا نام سالونیکا ہے۔ اس کا دوسرا نام تھیسالونیکا ہے۔ ۱۹۱۲ تک یہاں ترکوں کی حکومت تھی جو پہلی عالمی جنگ میں ترکوں کی شکست کے بعد ختم ہو گئی۔

یہ یونانی شہر ۳۱۵ ق م میں باقاعدہ طور پر آباد کیا گیا۔ موجودہ انجیل میں سینٹ پال کے جو خطوط ہیں ان میں سے دو خط یہاں کے ان مسیحیوں کے نام ہیں جنھوں نے ابتداءً مسیحی مذہب قبول کیا تھا۔ یہاں یہودی تقریباً پچاس ہزار کی تعداد میں آباد تھے۔ مگر ۱۹۴۳ء میں نازیوں نے ان میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ نیز اس مقام پر جتنے یہودی آثار تھے ان کو بھی مٹا دیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۴ دسمبر ۱۹۸۳) میں بتایا گیا تھا کہ اب یہاں کی بقیہ یہودی آبادی نے اپنی تنظیم قائم کی ہے۔

اِس تنظیم کے صدر لیون بن میور (Leon Bin Muir) سے پوچھا گیا کہ یہودیت نے یہاں کیا چیزیں کھوئی ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ تقریباً ہر چیز (almost every thing) انھوں نے مزید کہا کہ یہ صرف مصیبت کے لمحات ہیں جب کہ ہمارے نوجوان لوگ اپنے کو یہودی محسوس کرتے ہیں:

It is only in moments of peril that the younger people feel (themselves) Jewish.

یہ بات جو یہودی عالم نے یہودیوں کے بارہ میں کہی، وہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے بھی درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم نوجوانوں میں، ہمارے لکھنے اور بولنے والوں کے الفاظ میں، اسلام زندہ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ اس کو "صحوہ اسلامیۃ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض قومی مصیبت کی زمین پر اُبھرنے والا اسلام ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں خدا کی معرفت کی زمین پر ابھرنے والا اسلام۔

قرآن (۵۱/۱۴) کے مطابق، اِس قسم کی مذہبیت معتبر نہیں۔ حقیقی مذہبیت وہ ہے جو معرفتِ خداوندی کی بنیاد پر ابھرے، نہ کہ مصیبتِ قومی کی بنیاد پر۔ جس کا سرچشمہ حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت ہو، نہ کہ مادی مسائل میں مبتلا ہونا۔

علم کی اہمیت

ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ محمد کو اس اعتبار سے شہرت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے پیرؤوں کو علم حاصل کرنے کی تاکید کی ۔ خواہ اس کے لیے انھیں چین جانا پڑے ۔ مورخین بتاتے ہیں کہ انھوں نے کچھ جنگی قیدیوں کو یہ اجازت دی کہ وہ قید سے اس طرح رہائی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص تعداد میں مسلمانوں کو پڑھنا اور لکھنا سکھا دیں ۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ ہی میں ایسے مکاتب قائم ہو گئے تھے جہاں لوگوں کو تعلیم دی جائے اور انھیں خواندہ بنایا جا سکے ۔

مسلمانوں میں تعلیم مختلف طریقوں سے پھیلی ۔ مثلاً قرآن ، حدیث اور فقہ کو سیکھنے کے ذریعہ ۔ عربی زبان چونکہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے ضروری تھی ، اس لیے عربی بھی ان کی تعلیم کا جز بنی رہی ۔ اسی کے ساتھ منطق اور کلام بھی ۔ فقہ کا علم گاؤں تک کے لوگوں کے لیے ضروری تھا ۔ اس لیے معاشرہ کی ہر سطح پر علم پھیل گیا ۔

ہر مسجد مسجد ہونے کے ساتھ مدرسہ کا بھی کام کرنے لگی ۔ لوگ مسجد کے صحن میں جمع ہو کر حدیث اور فقہ پر مباحثہ کرنے لگے ۔ جب بھی کوئی شخص مستند عالم کی حیثیت اختیار کر لیتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس کا گھر ایک مدرسہ بن جاتا ۔ لوگ ایک مسجد سے دوسری مسجد کا سفر کرنے لگے تاکہ مستند علما رسے علم حاصل کر سکیں ۔ بہت سی مسجدوں میں کتب خانے بن گئے ۔ یہ کتب خانے عوام کے لیے حصول علم کا مستقل ذریعہ تھے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کتب خانہ اسلامی معاشرہ کا ایک اہم جزر تھا ۔ بہت سے ادارے ایسے قائم تھے جہاں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود تھیں ۔ وہ لٹریچر جس نے یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے لیے محرک کا کام کیا ۔ اس کا بیشتر حصہ انھیں مسلم کتب خانوں کے عربی ترجموں سے حاصل کیا گیا تھا ۔

مذکورہ مستشرق اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ مذہب اسلام نے علم اور تعلیم کے حصول کے لیے ایک مستقل دباؤ پیدا کیا ۔ رسمی مدرسوں (اور بغداد کی نظامیہ اور قاہرہ کے الازہر جیسی یونیورسٹیوں) کے علاوہ اسلام میں دوسرے بہت سے طریقے ظہور میں آئے جو لوگوں کے لیے علم کے حصول کا ذریعہ تھے :

Encyclopaedia Britanica, 1984, Vol. 15

علم کے بغیر آدمی نہ دنیا کو سمجھ سکتا اور نہ دین کی گہری معرفت حاصل کر سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے علم کو نمبر ایک اہمیت دی ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ ہر ممکن ذریعہ کو اختیار کر کے علم حاصل کیا جائے ۔

راستہ یہاں ہے

ہندستان کی آریہ سماج نے اپنی ۸۴ سالہ جشن جوبلی کے موقع پر مختلف مقامات پر ہفتہ منانے کا انتظام کیا تھا۔ اس سلسلے میں سیوہارہ (بجنور) میں نومبر ۱۹۵۹ میں ایک آل مذاہب کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے اور مثبت انداز میں اپنے اپنے مذہب کا تعارف پیش کیا۔ راقم الحروف نے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ کو اپنا مقالہ پڑھا۔

۲۔ ہندستان میں ایک ادارہ ہے۔ اس کا صدر دفتر نئی دہلی میں ہے اور اس کا نام ہے مذاہب کی عالمی انجمن (World Fellowship of Religions) اس ادارہ کی تیسری سالانہ کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی۔ اس میں ہندستان کے علاوہ بیرونی ملکوں سے مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس موقع پر ۲۷ فروری ۱۹۶۵ کے اجلاس میں میں نے مذہب اور سائنس کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

۳۔ آریہ سماج (الہ آباد) نے مئی ۱۹۶۰ میں اپنی گولڈن جوبلی منائی۔ اس سلسلے میں ۲۲ مئی کو الہ آباد میں سرو دھرم سمیلن کا ایک پروگرام ہوا۔ اِس سمیلن میں مختلف مذاہب کے علماء نے شرکت کی۔ اُس کا عنوان یہ تھا:

"مانو وکاس کے لئے آپ کے ہی دھرم کو ماننا کیوں آوشیک ہے"

راقم الحروف نے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنا مقالہ (منزل کی طرف) پیش کیا۔

غیر مسلموں کے اجتماع میں اسلام کے تعارف کا مجھے بار بار موقع ملا ہے اور ہر بار یہ تجربہ میرے لئے بہت خوش گوار ثابت ہوا ہے۔ بجنور کے مذکورہ بالا اجتماع میں صدارت کی کرسی پر مرادآباد کے ایک آریہ سماجی وکیل تھے۔ آخر میں جب انھوں نے اپنی صدارتی تقریر کی تو انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے صفائی کے ساتھ کہا کہ یہاں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے اپنے اپنے مذہب کو پیش کیا ہے مگر "حقیقت یہ ہے کہ صرف مولانا صاحب تھے جنھوں نے موضوع کا حق ادا کیا" ـــــ یہ اعتراف حقیقۃً کسی شخص کا نہیں بلکہ اسلام کا تھا۔ اسلام کو جب بھی میدان میں لایا جائے گا وہ دوسرے دینوں کے مقابلہ میں ہمیشہ برتر ثابت ہوگا۔

تشکیلِ حیات

ایک مبصر نے جدید سائنسی تہذیب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے اندر فکری استحکام نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بطلیموس کی جگہ کوپرنیکس ظاہر ہوا۔ پھر کوپرنیکس کی جگہ نیوٹن نے لے لی۔ اس کے بعد نیوٹن کی جگہ آئن اسٹائن آگیا :

Copernicus replaced Ptolemy, Newton replaced Copernicus, and Einstein replaced Newton.

موجودہ دور کے کلچر کو "کلچر آف ٹکنالوجی" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک متضاد ترکیب ہے۔ کلچر اپنی ذات میں دوامیت چاہتا ہے۔ مگر سائنس یا ٹکنالوجی دوامی صفت سے خالی ہیں۔ ایسی حالت میں ٹکنالوجی کی بنیاد پر بننے والا کلچر ہمیشہ غیر مستحکم رہے گا۔ وہ انسانی فطرت کے ابدی تقاضے کو پورا نہیں کرسکتا۔

ٹکنالوجی انسان کی خادم ہے، وہ انسانی کلچر کی بنیاد نہیں۔ ٹکنالوجی صرف یہ کرسکتی ہے کہ وہ زراعت کو ہل کے دور سے نکال کر ٹریکٹر کے دور میں پہنچا دے، یا سفر کو بیل گاڑی کے دور سے آگے بڑھا کر ہوائی جہاز کے دور میں داخل کر دے۔ لیکن ٹکنالوجی حقیقی معنوں میں انسان کو کلچر یا تہذیب نہیں دے سکتی۔ ٹکنالوجی انسان کی خادم بن سکتی ہے، مگر اس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ انسان کو مذہب حیات فراہم کرنے کا کام انجام دے گی۔

ٹکنالوجی، ایک لفظ میں، خادم حیات ہے اور کلچر مذہب حیات۔ ٹکنالوجی اگر زندگی کی سواری ہے تو کلچر انسان کی منزل متعین کرنے والا ہے۔ سواری جیسی چیزوں کے معاملہ میں تبدیلی سے کوئی حقیقی نقصان نہیں۔ لیکن اگر کلچر کی بنیادوں میں تبدیلی کی جانے لگے تو پوری انسانی زندگی اپنی معنویت کھو دے گی۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹکنالوجی کو زندگی کا خدمت گزار بنایا جائے۔ اور مذہب کو کلچر کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا جائے۔ پھر جب یہ دیکھا جائے کہ تمام مذاہب میں محفوظ اور ثابت شدہ مذہب صرف اسلام ہے تو یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ کلچر کے اعتبار سے زندگی کی تشکیل کے لیے واحد بنیاد صرف اسلام ہے۔ اسلام انسانی زندگی کی تشکیل کے لیے ایسی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

اپنا مسئلہ

بعض باتیں قواعد زبان کے اعتبار سے بظاہر درست نظر آتی ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل غلط ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال لیجئے۔ "انقلابی اسلام" کے ایک علم بردار نے اپنے نظریہ کو اس سوال و جواب کی صورت میں بیان کیا ہے :

زمین کس کی ہے

اللہ کی

پھر زمین میں کس کا قانون چلنا چاہیے

اللہ کا

اس نظریہ نے بہت سے مسلم نوجوانوں کو اس فریب میں ڈال دیا کہ ہمارا مقصد "عالمی حکومتِ الٰہیہ" قائم کرنا ہے۔ وہ بندوق لے کر نکل پڑے ہیں کہ لوگوں کو مار مار کر خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری کریں۔ ان میں سے جن لوگوں کے لیے بندوق سنبھالنے کے مواقع نہیں ہیں، وہ الفاظ کو بندوق کی گولی کا بدل بنائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ ایک طبع زاد نظریہ ہے۔ شاعرانہ مضمون کی طرح کچھ لوگوں نے خودساختہ طور پر اس کو گھڑ لیا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

قرآن کے مطابق، زمین پر خدا کی حکومت اوّل دن سے قائم ہے، اسے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کی روشنی میں غور کیجئے تو صحیح بات یہ قرار پائے گی :

زمین پر کس کا حکم چل رہا ہے

اللہ کا

پھر آدمی کو کس کا حکم ماننے چاہیے

اللہ کا حکم ماننا چاہیے

حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ زمین کا نہیں، مسئلہ اپنی ذات کا ہے۔ ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کی طرح خدا کے حکم کا پابند بنائے۔ وہ اپنی ذات کو اسی طرح خدا کا مطیع بنا لے جس طرح بقیہ کائنات خدا کی مطیع بنی ہوئی ہے (آل عمران ۸۳)

فرضی نام

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ پیغمبروں نے جب اپنی قوموں کے سامنے توحید خالص کی دعوت پیش کی اور ان کے مزعومہ شریکوں کا انکار کیا تو لوگوں نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم صرف ایک اللہ کے عبادت گزار بنیں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔ پیغمبر نے جواب دیا کہ کیا تم لوگ مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، جن کی کوئی سند خدا نے نہیں اتاری (اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم ما نزل اللہ بھا من سلطان) الاعراف ۷۱

نام رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک عاجز چیز کو طاقت ور چیز کہنا۔ ایک پتھر کی مورت کو ایسے نام سے پکارنے لگنا جو اس کے لیے سزاوار نہیں۔ مثلاً قدیم عرب میں قبیلۂ قریش کا ایک بت تھا جس کو وہ پوجتے تھے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف ایک بے جان پتھر تھا۔ مگر قریش نے اس کا نام عُزّیٰ رکھ دیا تھا۔ عُزّیٰ کا لفظ اعزّ کا مؤنث ہے۔ یعنی بہت معزز، بہت طاقت ور۔

قدیم زمانہ میں اس طرح کے بے اصل نام زیادہ تر بتوں کے ہوا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں پریس کے رواج نے اسی نوعیت کی ایک اور برائی کو بہت بڑے پیمانہ پر پیدا کیا ہے۔ اس نئی برائی کو اکابر پرستی کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہر قوم اپنی محبوب شخصیتوں کو بڑے بڑے لقب دیتی ہے۔ اس لقب کو پریس اور میڈیا کے ذریعہ مشہور کر کے لوگوں کے دماغوں میں اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ شخصیتیں واقعۃً ویسی ہی ہیں جیسا کہ ان کے لقب میں انھیں بتایا گیا ہے

قطب الاقطاب، غوث الاعظم، قائد اکبر، حکیم مشرق، حضرت اقدس، مجاہدِ اسلام، علامۂ زماں، شہیدِ اعظم، مجتہد العصر، امامِ حریت، وغیرہ، سب اسی قسم کے نام ہیں جو لوگوں نے بطور خود رکھ لیے ہیں۔ انھیں مفروضہ القاب کا یہ نتیجہ ہے کہ ان شخصیتوں پر کوئی تنقید کی جائے تو لوگ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص تو "حضرت اقدس" ہے، اس پر کیسے تنقید کی جا سکتی ہے، حالاں کہ حضرت اقدس کچھ لوگوں کا اپنا گھڑا ہوا نام ہے نہ کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا لقب۔

قدیم وجدید

ابتدائی دور میں عربوں نے عملی سائنس کو بہت کچھ ترقی دی۔ مثال کے طور پر یہ عرب ہی تھے جنھوں نے ساتویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے قابل استعمال گھڑی تیار کی۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں اعتراف کیا ہے کہ اُس زمانہ میں دمشق میں ایک مشہور گھڑی موجود تھی، اور اسی طرح ہارون رشید کے زمانہ کے بغداد میں:

> Damascus had a famous clock and so did the Baghdad of Harun-al-Rashid's day. (p.261).

گھڑی کو مسلمانوں نے شروع کیا۔ مگر اس کو ترقی یافتہ صنعت بنانے کا تمام کام مغرب میں ہوا۔ آج یہ حال ہے کہ صرف گھڑیوں کی خریداری میں مسلم ملکوں کے کروروں ڈالر ہر سال مغربی دنیا میں پہونچ رہے ہیں۔

یہی معاملہ دوسری تمام جدید صنعتوں کا ہے۔ ان صنعتوں کا آغاز کرنے والے مسلمان تھے، مگر بعد کو وہ خود تو باہمی جھگڑوں میں پڑ گئے اور مغرب ان کی چیزوں کو لے کر ساری دنیا پر چھا گیا۔

مسلمانوں میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو مذکورہ ماضی پر فخر کرتے ہیں۔ مگر ان میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو حال میں دوبارہ وہ کام کرنے کا پیغام دے جو ماضی میں قدیم مسلمانوں نے کیا تھا۔ یہ محض فخر ہے، اور فخر کبھی عمل کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

اسٹیم پاور سے چلنے والے جہاز کے وجود میں آنے سے پہلے تک مسلمان سمندری جہاز رانی میں دنیا سے آگے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مورخ کے الفاظ میں، انھوں نے میڈیٹرینین سمندر کو عرب جھیل بنا دیا تھا۔ مگر آج اسٹیم شپ کے دور میں مسلمانوں کی کوئی جہاز راں کمپنی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بعد کو اپنے دور زوال میں پہنچنے کی وجہ سے مسلمانوں نے یہ صلاحیت کھو دی کہ وہ نئی چیزوں کو سیکھیں اور نئی تحقیقات پر دھیان دیں۔ انھوں نے ہر معاملہ میں "قدیم" سے جڑے رہنے کو مذہب سمجھا اور "جدید" سے وابستہ ہونے کو لامذہبیت سمجھنے لگے۔

امور دین (عقائد، عبادات، اخلاق) کے معاملہ میں ہم کو بلاشبہ پیچھے کی طرف دیکھنا ہے۔ مگر "امور دنیا" کے معاملہ میں ہم کو آگے کی طرف نظر رکھنا ہے۔ موجودہ مسلمان اس فرق کو نہ سمجھ سکے، یہی وجہ ہے کہ وہ زمانۂ حاضر میں ایک پچھڑی ہوئی قوم بن گئے۔

تنقید کا اصول

ایک صاحب نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپ صحابۂ کرام، علماء عظام سب پر تنقید کرتے ہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل لغو بات ہے۔ صحابہ اور علماء کے درمیان کاما نہیں ہے بلکہ فل اسٹاپ ہے۔ علماء پر تنقید کا ہر شخص کو حق ہے، مگر صحابہ پر تنقید کا کسی کو حق نہیں۔

اصحاب رسول کا معاملہ ایک خصوصی معاملہ ہے۔ ان کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ لاتتخذوھم من بعدی غرضا (میرے بعد ان کو نشانہ نہ بناؤ) اس لئے صحابہ مطلق طور پر تنقید سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے سلسلہ میں صرف یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں اگر دو صحابی کے درمیان ایسا اختلاف پایا جائے جس میں تطبیق نہ دی جاسکتی ہو تو دونوں میں سے ایک کا انتخاب کیا جائے گا۔ یعنی ایسے مسئلہ میں ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے گا نہ کہ تنقید کا طریقہ۔

مگر صحابہ کے بعد جہاں تک دوسرے علماء اور رہنماؤں کا تعلق ہے تو ان کے بارہ میں امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ بھی آدمی اور ہم بھی آدمی (ھم رجال ونحن رجال) یہی صحیح اسلامی مسلک ہے اور یہی میرا مسلک ہے۔ میں صحابہ کرام کو تنقید سے مستثنیٰ سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی صحابہ کرام پر تنقید نہیں کی اور نہ بقید ہوش وحواس ایسا کرسکتا ہوں۔ مگر صحابہ کے بعد دوسری اسلامی شخصیتوں پر علمی تنقید کی جاسکتی ہے۔ اور ایسی تنقید ہر دور میں علماء امت کے درمیان جاری رہی ہے۔ غیر صحابہ پر تنقید کے معاملہ میں کبھی کسی نے نکیر نہیں کی۔

تاہم غیر صحابہ پر تنقید کے سلسلہ میں بھی ایک فرق کو ملحوظ رکھنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ تنقید ہو نہ کہ تعییب۔ یعنی علمی اختلاف رائے ہو نہ کہ ذاتی الزام تراشی۔ مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸) کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے نکاح نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کے نکاح نہ کرنے کو میں ایک ذاتی مسئلہ قرار دوں گا اور اس کی بنیاد پر ان کے اوپر کوئی تنقید نہیں کروں گا۔ مگر ان کی کتابیں میرے نزدیک مقدس نہیں۔ ان میں اگر کوئی بات غیر صحیح نظر آئے تو اس پر علمی حدود میں تنقید کی جاسکتی ہے۔

مزید وضاحت کے لئے میں نے اپنی الماری سے ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل

دین المسیح نکالی۔ یہ ضخیم کتاب ابن تیمیہ نے ایک عیسائی عالم کے جواب میں لکھی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحیح کتاب ہے۔ مگر اس کی بہت سی باتیں مناظرانہ انداز کی ہیں۔ خالص شرعی معیار پر وہ درست نہیں۔

مثال کے طور پر کتاب کے جزء ۴ میں انھوں نے اس بات کی مختلف دلیلیں دی ہیں کہ دین مسیح کے مقابلہ میں دین محمدی زیادہ کامل ہے۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا دین پہنچایا جب کہ دوسرے پیغمبروں نے پورا دین نہیں پہنچایا:

فضمن اللّٰہ لہ العصمۃ اذ ابلغ رسالاتہ فلھٰذا ارشد الناس الی جمیع الحق والقی الی الناس مالم یکن غیرہ من الانبیاء القاءہ خوفا ان یقتلوہ کما یذکرون عن المسیح وغیرہ (صفحہ ۱۴)

اللہ نے تبلیغ رسالت کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ضمانت لے لی تھی۔ اس لئے آپ نے لوگوں کو پورا حق بتایا۔ آپ نے لوگوں کو وہ باتیں پہنچائیں جو آپ کے سوا دوسرے نبیوں کے لئے ممکن نہ ہوسکیں کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ لوگ ان کو قتل کردیں گے جیسا کہ مسیح اور دوسرے نبیوں کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ بات بذات خود صحیح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دین کامل ہے۔ مگر اس کی مذکورہ توجیہہ ہرگز صحیح نہیں۔ یہ قرآن کی تصریحات سے ٹکراتی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ اللہ نے اپنے تمام پیغمبروں کی پوری مدد فرمائی۔ کسی پیغمبر کو اللہ نے اس طرح بے حفاظت نہیں چھوڑا کہ وہ لوگوں کی تعدی کے خوف سے خدا کی وحی کو کامل طور پر لوگوں تک نہ پہنچائے۔

جہاں تک موجودہ انجیل کا تعلق ہے، اس میں اس سلسلہ میں متضاد باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس میں ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ جو باتیں میں نے اپنے باپ سے سنیں وہ سب تم کو بتادیں (یوحنا ۱۵ : ۱۵) دوسری طرف انجیل میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ساری باتیں نہیں بتارہا ہوں۔ تاہم اس کا سبب، انجیل کے بیان کے مطابق قتل کا خوف نہیں بلکہ مخاطبین کا عدم تحمل ہے۔ اس سلسلہ میں انجیل کے الفاظ یہ ہیں ـــــ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کرسکتے:

I have yet many things to say unto you, but ye cannot bear them now
(St. John 16:12)

اگر بالفرض حضرت مسیح نے یہ کہا ہو کہ میں تم کو پوری بات نہیں بتا رہا ہوں تو اس کا سبب خود انجیل کے بیان کے مطابق ، یہ نہیں تھا کہ حضرت مسیح اس معاملہ میں اپنی ذات کے بارہ میں خوف رکھتے تھے ۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ آنجناب کے نزدیک آپ کے مخاطبین اس کی استعداد نہیں رکھتے تھے کہ وہ پوری بات کا تحمل کرسکیں ۔

یہ ایک عام شرعی اصول ہے جس پر خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے ۔ مثلاً مکہ میں آپ پر شراب اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی بابت احکام نہیں اترے ، کیوں کہ اس وقت لوگوں کے اندر اس کو قبول کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہوا تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کسی بھی درجہ میں کوئی ممنوع چیز نہیں ۔ جو چیز ممنوع ہے وہ اسلوب تنقید ہے نہ کہ خود تنقید ۔ تنقید کا مطلب دلائل کے ذریعہ اختلاف رائے ہے ۔ اس معنی میں تنقید بلاشبہہ مطلوب ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کو سب وشتم کرے یا بلا دلیل کسی کی مذمت کرنے لگے تو ایسا فعل یقیناً غیر شرعی ہوگا ۔ اندیشہ ہے کہ ایسا آدمی اللہ کے یہاں سخت پکڑ میں آجائے ۔

مزید یہ کہ تنقید زندگی کی علامت ہے ۔ زندہ قومیں تنقید کا استقبال کرتی ہیں ۔ جو لوگ حق کے طالب ہوں وہ کبھی تنقید کو برا نہیں مانیں گے ۔ البتہ جو لوگ شخصیتوں کے پرستار بن جائیں وہ ضرور تنقید کو سن کر بھڑ اٹھیں گے ، کیوں کہ تنقید کی زد ہمیشہ شخصیتوں پر پڑتی ہے نہ کہ حق وصداقت پر ۔

اعتراض برائے اعتراض

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ایک سمپوزیم تھا۔ اس کا موضوع تھا: مذہب فرقہ پرستی کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خود خدا کی تخلیقی اسکیم کے تحت اس دنیا میں آزادانہ مسابقت جاری ہے۔ اسی مسابقت کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ بار بار ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف اور ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عین فطری ہے اور وہ ہمیشہ اس دنیا میں باقی رہے گی۔ ایسی حالت میں پُرامن زندگی گزارنے کی تدبیر صرف ایک ہے، اور وہ اعراض ہے۔ یعنی زندگی کی سرگرمیوں میں جب بھی ایسا ہو کہ ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کا اندیشہ پیدا ہو تو وہاں اعراض کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اس طرح عملی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئے گی اور ہر ایک کے لیے محفوظ طور پر اپنی زندگی کی تعمیر ممکن ہو جائیگی۔

اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ آپ نے سڑکوں پر دیکھا ہوگا کہ جگہ جگہ اس مضمون کا بورڈ لگا رہتا ہے کہ فاصلہ پر رہو (keep distance)۔ اس ٹرافک اصول کو اختیار کرنے کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ سڑک پر بیک وقت بہت سی سواریاں دوڑیں، پھر بھی ان کے درمیان حادثہ کے واقعات پیش نہ آئیں۔ اسی اصول کو ہمیں عام زندگی میں بھی اختیار کرنا ہے۔

تقریر کے خاتمہ پر سوال و جواب کا وقفہ تھا۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے "فاصلہ پر رہو" کے جس اصول کی تلقین کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں الگ الگ خانوں میں بٹ جائیں اور ایک دوسرے سے بےتعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ ایسا کرنے کے بعد تو ہندستان میں ہمارے مسائل اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔

میں نے کہا کہ "فاصلہ پر رہو" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الگ الگ زندگی گزارو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نزاع کی صورت پیش آنے پر ٹکراؤ سے بچو۔ سڑک پر اس مضمون کے بورڈ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اپنی گاڑیاں گھروں پر کھڑی رکھیں، وہ ان کو سڑک پر نہ چلائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ چلتے ہوئے جب کبھی ٹکراؤ کا اندیشہ ہو تو اپنی گاڑی کنارے کرلیں۔ اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر سنجیدہ نہ ہو تو وہ سیدھی بات کا بھی الٹا مطلب نکال سکتا ہے۔

ناقص، جامع

ایک شخص نے کہا کہ محبت نام ہے : "دل سے چاہنے کا"۔ دوسرا آدمی بولا کہ تم نے محبت کا بہت ناقص مفہوم بیان کیا۔ محبت صرف دل سے چاہنے کا نام نہیں۔ محبت کا جامع تصور یہ ہے —— دل سے چاہنا، جس سے محبت ہے اس سے ملنا، سلام ومصافحہ کرنا، اس کی تواضع کرنا، اس کی خدمت کرنا، اس کی خاطر دوسروں سے جنگ کرنا۔ اس کے نام کا ڈنکا بجانا، اس کا استقبال کرنا، وغیرہ۔

دوسرے آدمی کے نزدیک بظاہر اس کا اپنا تصورِ محبت جامع ہے اور پہلے شخص کا تصورِ محبت ناقص۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سوچ بجائے خود غلط ہے۔ محبت کے معاملہ میں جامع اور ناقص کی تقسیم نہیں۔ بلکہ حقیقی اور غیر حقیقی کی تقسیم ہے۔ آپ کو کسی آدمی سے قلبی تعلق ہو جائے تو کہا جائے گا کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ یہ محبت اگر سچی ہو تو مختلف مواقع پر اس کے تقاضوں کا ظہور ہوگا۔ لیکن اگر قلبی محبت نہ ہو اور آدمی اوپری طور پر فہرستِ محبت کے مذکورہ افعال کرے تو وہ ظاہر داری ہوگی نہ کہ فی الواقع فہرستِ محبت کی تکمیل۔

یہی معاملہ دین کا ہے۔ "دین کا ناقص تصور" اور "دین کا جامع تصور" سراسر مبتدعانہ اصطلاحیں ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ اندازِ تعبیر قرآن اور حدیث میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اگر دین کے تصور کو بتانے کے لیے یہ کوئی صحیح تشریح ہوتی تو قرآن وحدیث میں ضرور یہ الفاظ پائے جاتے۔ مگر سارے قرآن میں کہیں بھی اس قسم کے الفاظ موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دین میں صحیح تقسیم حقیقی اور غیر حقیقی کی ہے۔ مطلوب دین داری وہ ہے جو اللہ سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ اگر آدمی کے دل میں سچا تقویٰ پیدا ہو جائے تو آدمی کا پورا سلوک اسی کے رنگ میں ڈھل جائے گا۔ دین کی حقیقت اس کے تمام قول وفعل میں ظاہر ہوتی چلی جائے گی۔

اس کے برعکس اگر آدمی کے اندر قلبی تقویٰ پیدا نہ ہو تو وہ یا تو سرکش انسان ہوگا یا منافق انسان۔ سرکش انسان کھلم کھلا حکم الٰہی سے سرتابی کرتا ہے۔ اور منافق انسان اندر سے

خالی ہوتا ہے مگر اوپری طور پر دکھاوے والے اعمال کرتا ہے۔ مگر دینی حقیقت کے بغیر دینی ظاہرداری کی کوئی قیمت نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق (لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا) اللہ کسی شخص پر صرف اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا اس کو دیا ہے (لا یکلف اللہ نفسا الا ما آتاھا) دوسری جگہ فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے (فاتقوا اللہ ما استطعتم)

اس طرح کی ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی واجبات کا تعلق تمام تر حالات سے ہے۔ کسی مومن یا کسی مومن گروہ کی دینی ذمہ داری باعتبار استطاعت ہے نہ کہ باعتبار فہرست۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص کا دین ناقص نظر آئے گا، حتی کہ انبیاء کرام کا بھی۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اجتماعی احکام نافذ نہیں کیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نماز باجماعت قائم نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو والدین کے حقوق ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وغیرہ۔ اسی طرح ہر پیغمبر کا دین ناقص اور نامکمل قرار پائے گا۔ کیوں کہ کسی بھی پیغمبر کے یہاں فہرست کے اعتبار سے واجباتِ دین کے کامل نفاذ کی مثال موجود نہیں۔

دین کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ جس آدمی کے اندر اخلاص ہو وہ کامل دین پر ہے اور جس آدمی کے اندر اخلاص نہ ہو وہ ناقص دین پر۔

علم اور اسلام

سکندرِ اعظم کے بعد بطلیموس ثانی (Ptolemy II) مصر کے علاقہ کا حکمراں ہوا۔ اس کا زمانہ تیسری صدی قبل مسیح ہے۔ وہ ذاتی طور پر علم کا قدرداں تھا۔ اس نے اسکندریہ میں ایک کتب خانہ بنایا جس میں مختلف علوم کی تقریباً ۵ لاکھ (500,000) کتابیں تھیں۔ یہی وہ کتب خانہ ہے جو تاریخ میں کتب خانہ اسکندریہ (Library of Alexanderia) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتب خانہ بعد کو (اسلامی دور سے پہلے) تباہ کر دیا گیا۔

اس کتب خانہ کے بارے میں غلط طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے حکم سے اس کو جلایا گیا۔ حالاں کہ ظہور اسلام سے بہت پہلے چوتھی صدی عیسوی میں اس کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) نے لکھا ہے کہ وہ رومی حکومت کے تحت تیسری صدی عیسوی تک موجود تھا (I/227) اس کے بعد وہ باقی نہ رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کتب خانہ کا نصف حصہ جولیس سیزر (Julius Caesar) نے ۴۷ قبل مسیح میں جلایا۔ تیسری صدی عیسوی میں مسیحیوں کو اس علاقہ میں غلبہ حاصل ہوا۔ اس دوران غالباً ۳۹۱ء میں مسیحیوں نے اس کو جلا کر آخری طور پر ختم کیا۔ اس بات کا اعتراف انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> These institutions survived until the main museum and library were destroyed during the civil war of the 3rd century AD; a subsidiary library was burned by Christians in AD 391 (1/479).

دو جگہ اس واضح اعتراف کے باوجود اسی انسائیکلو پیڈیا میں تیسرے مقام پر غیر ضروری طور پر کتب خانہ کی بربادی کو مسلم عہد کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ ''سنسرشپ'' کے مقالہ کے تحت درج ہے کہ اس بات کے مختلف ثبوت موجود ہیں کہ اسکندریہ کا کتب خانہ مختلف مرحلوں میں جلایا گیا۔ ۴۷ ق م میں جولیس سیزر کے ذریعہ، ۳۹۱ء میں مسیحیوں کے ذریعہ، ۶۴۲ھ میں مسلمانوں کے ذریعہ۔ بعد کے دونوں موقع پر یہ کہا گیا کہ ان کتابوں سے مسیحیت اور قرآن کو خطرہ ہے:

> In the latter two instances, it was alleged that pagan literature presented a danger to the Old and New Testaments or the Quran. (3/1084)

یہاں کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے واقعہ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں۔ خود برٹانیکا کے مذکورہ بالا دو اقتباسات اس کی واضح تردید کر رہے ہیں۔ اسلام عین اپنی فطرت کے اعتبار سے علم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ علم کی حوصلہ شکنی سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں — اسلام دورِ جدید کا خالق)

عالم کون

فارسی کا ایک قطعہ ہے کہ — وہ شخص جو نہیں جانتا مگر جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے وہ ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے مگر جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا وہ ایک لنگڑا گدھا ہے جو منزل پر پہنچ جائے گا:

آن کس کہ نداند و بداند کہ بداند   در جہل مرکب ابد الدھر بماند

و آں کس کہ بداند و بداند کہ نہ داند   او نیز خر لنگ بہ منزل برساند

عالم ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ آدمی کو اپنی بے علمی کا احساس ہونے لگے۔ علم یا معلومات کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ کوئی بھی شخص اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک بے علم یا جاہل آدمی تو سمجھ سکتا ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مگر جو آدمی علم کے سمندر میں داخل ہو وہ وہاں سے صرف یہ احساس حاصل کرے گا کہ میں تو کچھ نہیں جانتا۔ اس کا ہر علمی اضافہ صرف اس کے احساس بے علمی کو بڑھائے گا۔

علم کی اسی نوعیت کی بنا پر یہاں ایسا ہوتا ہے کہ جو آدمی علم کی وسیع دنیا سے بے خبر ہو وہ اپنی بے خبری کی بنا پر اس بے بنیاد احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ''میں سب کچھ جانتا ہوں''۔ ایسا آدمی ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ بے خبر جیتا ہے اور بے خبر ہی مر جاتا ہے۔

حقائق کی دنیا نا قابل بیان حد تک وسیع ہے۔ قیامت تک لوگ اس کو دریافت کرتے رہیں گے مگر کبھی بھی یہ حقائق ختم نہ ہوں گے۔ ایسی حالت میں جو آدمی یہ سمجھ لے کہ میں عالم ہو گیا اس نے گویا اپنے لئے نئی معلومات کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے برعکس جس کا احساس یہ ہو کہ ابھی میں نے نہیں جانا وہ ہر دن اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اس کا بے علمی کا احساس اس بات کی ضمانت بن جائے گا کہ اس کی دریافتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ ہر روز نئی حقیقتوں سے وہ اپنے علمی خزانہ میں اضافہ کرتا رہے۔

ایک پروگرام

ڈاکٹر ایم سی شرما (عمر ۴۱ سال) سے ۱۹ جولائی ۱۹۸۹ کو ملاقات ہوئی۔ وہ آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی پیدائش چورو (راجستھان) میں ہوئی۔ اسکول میں طالب علمی کے زمانہ میں وہ آر ایس ایس سے وابستہ ہوئے۔ وہ اس کے ایک کٹر ممبر تھے۔ ان کا خیال یہ ہو گیا کہ ہندستان کی تمام مصیبتوں کے ذمہ دار گاندھی تھے۔ وہ گاڈسے کو ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگے جس نے ۱۹۴۸ میں گاندھی جی کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

وہ اپنے انھیں انتہا پسندانہ خیالات پر تھے کہ ۱۹۷۵ میں سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ہندستان میں ایمرجنسی نافذ کی۔ آر ایس ایس کے کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں میں سے ایک ڈاکٹر شرما بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جیل کی نظر بندی کے زمانہ میں ان کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ گاندھی جی کی کتابیں جیل میں آسانی کے ساتھ دستیاب تھیں۔ اس لیے مطالعہ کو جاری رکھنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

انھوں نے بتایا کہ اس مطالعہ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ جب میں جیل سے نکلا تو میں ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ گاندھی اس ملک کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ ساورکر جیسے لوگ جدید ہندستان کے رہنما نہیں بن سکتے تھے۔ اس کام کو کرنے کے لیے گاندھی اور نہرو جیسے لوگ درکار تھے۔

ڈاکٹر شرما کی روداد سننے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ ہندستان میں کرنے کا ایک ضروری کام یہ ہے کہ شہر سے الگ کسی پُرسکون مقام پر ایک مرکز بنایا جائے۔ یہاں اسلام کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں جدید معیار پر موجود ہوں۔ اسی کے ساتھ وہاں قیام کا اچھا بندوبست ہو۔ اس کے بعد تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کو یہاں بلایا جائے، اور چند دن یا چند ہفتہ ٹھہرا کر انھیں اسلام سے واقف کرانے کی کوشش کی جائے۔ اگر ایسا مرکز قائم کیا جا سکے تو اس سے وہی فائدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر حاصل ہوگا جو ڈاکٹر شرما کے حق میں جیل کا ہوا۔

اگر ایسا مرکز قائم ہو تو وہ ہندو نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ مرکز اس ملک میں اسلام کی جدید تاریخ بنانے کا دروازہ کھول دے۔

اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ آدمی کے اندر روحانی صفات پیدا ہوں۔ وہ روحانی ترقی (spiritual development) کا درجہ حاصل کرے۔

روحانیت ایک فطری صفت ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتی ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو فطرت کے اس عمل میں رکاوٹ (distraction) پیدا کرنے والی ہوں۔ انھیں میں سے ایک کھانا پینا بھی ہے۔ آدمی صبح سے شام تک مختلف صورتوں میں کچھ نہ کچھ کھاتا پیتا رہتا ہے۔ یہ کھانا پینا فطرت کے اس عمل کے راستہ میں ایک مستقل خلل اندازی ہے۔ چنانچہ ایک مہینہ کے لیے دن کے اوقات میں اس خلل اندازی پر روک لگا دی جاتی ہے تاکہ روحانی ارتقار کا عمل آدمی کے اندر بے روک ٹوک جاری ہو سکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہے (ولخلوف فم الصائم عند اللہ اطیب من ریح المسك) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱

اس حدیث میں گویا خوشبو کا لفظ محض اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ علامتی معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کا ظاہری پہلو اگرچہ ناخوش گوار ہے مگر اس کا اندرونی پہلو خوش گواریوں سے بھرا ہوا ہے۔ بھوک پیاس کا پُرمشقت تجربہ آدمی کے اندر اس کی روحانیت کو جگاتا ہے۔

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اس کے اندر مادیت بھی ہے اور روحانیت بھی۔ روحانیت کی ترقی ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ مادیت کے عنصر کو دبایا جائے۔ روزہ اسی قسم کی ایک تدبیر ہے۔ روزہ کا مقصد آدمی کو اس کے لیے تیار کرنا ہے کہ وہ اپنی روحانیت کا محافظ بن جائے۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنی مادی ضرورتوں میں کمی کرے، خواہ کمی کرنے کا یہ عمل کھانے اور پینے جیسی ناگزیر انسانی ضروریات تک کیوں نہ پہنچ جائے۔

۲۔ حدیث میں روزہ کو شہر الصبر کہا گیا ہے۔ یعنی صبر کا مہینہ۔ اس سے روزہ کا ایک اور اہم پہلو معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ صبر وضبط ہے۔ صبر کیا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ وہ بے قید زندگی کے مقابلہ میں پابند زندگی کا طریقہ اختیار کرے۔ اس اعتبار سے روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی مشق ہے جو صالح زندگی گزارنے کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

مُرتد اور اِرتداد

ارتداد کے لفظی معنیٰ ہیں لوٹنا یا پھر جانا، اور مرتد وہ شخص ہے جو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف لوٹ جائے۔ عام طور پر یہ لفظ دینی ارتداد کے لیے بولا جاتا ہے۔ روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرے اور پھر وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرے دین کی طرف چلا جائے تو اس کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

اس معاملہ میں سب سے پہلی بات یہ جاننا چاہیے کہ ارتداد ایک فوجداری جرم نہیں ہے بلکہ وہ ایک فکری انحراف ہے، اور فکری انحراف کرنے والا سب سے پہلے تبلیغ و نصیحت کا موضوع ہوتا ہے نہ کہ سزا کا موضوع۔ اگر کوئی شخص اعلان کے ساتھ مرتد ہو جائے تو مسلم معاشرہ کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اس کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرے۔ وہ دلیل اور نصیحت کے ذریعہ مرتد کو آمادہ کرے کہ وہ دوبارہ اسلام کی طرف واپس آجائے۔

اگر قابل لحاظ مدت تک نصیحت پر عمل کرنے کے بعد بھی وہ شخص دوبارہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کے بعد بھی افراد معاشرہ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس کو ماریں یا بطور خود اس کو کوئی سزا دیں۔ اس کے بعد انہیں یہ کرنا چاہیے کہ اس شخص کے معاملہ کو اسلامی عدالت کے حوالہ کر دیں۔ اب یہ عدالت کا کام ہوگا کہ وہ ضروری تحقیق کے بعد اس کے جرم کی نوعیت متعین کرے اور پھر اس کے بارے میں شرعی حکم کا فیصلہ دے۔

مرتد کی سزا کا مسئلہ

موجودہ زمانہ میں اسلام کی نسبت سے جو سوالات قائم کیے گئے ہیں اُن میں سے ایک مشہور سوال وہ ہے جس کا تعلق اسلام میں مرتد کی سزا سے ہے۔ روایتی فقہ کے مطابق، مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص جو باقاعدہ طور پر مسلم سماج کا ایک ممبر ہو وہ اگر اعلان کے ساتھ یہ کہے کہ میں نے اسلام کو اپنے مذہب کی حیثیت سے چھوڑ دیا۔ میں اب عقیدہ کے اعتبار سے مسلم نہیں۔ اس روش کو شریعت میں ارتداد یعنی اسلام سے پھر جانا کہا جاتا ہے، اور جو شخص اس روش کا ارتکاب کرے اس کے بارے میں اکثر

فقہائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ اُس کو حد شرعی کے طور پر قتل کر دیا جائے گا (یُقتل حدًّا)

فقہ اسلامی کے اس روایتی مسلک کو لے کر موجودہ زمانہ میں یہ کہا جانے لگا ہے کہ اسلام ایک جبری مذہب ہے۔ اسلام میں مذہبی آزادی کا تصور موجود نہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کا خالص علمی اور تحقیقی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے اور کسی صحیح مسلک تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

زیر نظر مقالہ کا موضوع یہی ہے۔ اس مقالہ میں اولاً فقہ کا جائزہ لیا جائے گا اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ کیا فقہ، قرآن کی طرح ابدی ہے یا وہ قرآن کی ابدی تعلیمات کی زمانی تعبیر ہے اور وہ اس شرعی اصول کے ماتحت ہے کہ "**تتغير الأحكام بتغير الزمان و المكان**" یعنی زمان اور مکان کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

فقہ کی حیثیت

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ قرآن اسلام کی دوامی تعبیر ہے اور سنت اسلام کی زمانی تعبیر۔ یہ بات سنت رسول کے بارہ میں تو صحیح نہیں۔ البتہ فقہ کے بارہ میں ضرور وہ صداقت کا ایک پہلو رکھتی ہے۔ موجودہ مدون فقہ ان معنوں میں کوئی مطلق چیز نہیں جن معنوں میں قرآن یا ثابت شدہ سنت ایک مطلق چیز ہے۔ فقہ دراصل ایک مخصوص زمانہ میں اسلام کے عملی انطباق کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ اس لیے اس کے اندر زمانی حالات کی چھاپ بالکل ناگزیر تھی۔

مثال کے طور پر فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ قاضی خاں میں ایک جزئیہ یہ بیان ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھالے کہ وہ ہوا میں اڑے گا تو ایسی قسم پر کفارہ واجب نہیں۔ کیوں کہ ہوا میں اڑنا ایک محال امر ہے۔ اس بنا پر وہ ایک مہمل قسم (المائدہ ۸۹) قرار پاتی ہے جس پر شریعت میں کوئی کفارہ نہیں۔ آج کوئی بھی مفتی ایسی قسم پر اِس طرح کا فتویٰ نہیں دے گا۔ کیوں کہ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج ہوا میں اڑنا امر محال نہیں رہا۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ مدون فقہ، اپنے قیمتی دوامی اجزاء کے ساتھ، اس قسم کے زمانی اجزا بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

ایک مثال

احکام میں زمانی رعایت کی ایک مثال مؤلفۃ القلوب (التوبہ ۶۰) ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے لوگوں کو تالیف قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دئے گئے۔ لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ کے بعد صدقات کی یہ مد باقی ہے یا نہیں۔ اکثر فقہاء اس مد کو کسی نہ کسی طور پر باقی مانتے ہیں مگر فقہائے احناف کے نزدیک اب یہ مد ساقط ہو چکی ہے، اب مؤلفۃ القلوب کو اس سلسلہ میں کچھ دینا جائز نہیں۔

حنفیہ کا استدلال اس واقعہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد عُیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور انہوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی۔ آپ نے ان کو عطیہ کا فرمان لکھ دیا۔ انہوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے صحابہ کی تصدیق بھی اس فرمان پر حاصل کر لیں۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ حضرت عمر فاروق کے پاس گئے۔ انہوں نے اس فرمان کو پڑھ کر اسے ان کی آنکھوں کے سامنے چاک کر دیا اور ان سے کہا کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیف قلب کے لیے تمہیں دیا کرتے تھے مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا۔ اب اللہ نے اسلام کو تم جیسے لوگوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

اس پر وہ لوگ خلیفہ ابوبکر صدیق کے پاس شکایت لے کر آئے اور کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر۔ لیکن نہ تو ابوبکر صدیق نے اس پر کوئی نوٹس لیا اور نہ دوسرے صحابہ میں سے ہی کسی نے حضرت عمر کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس سے حنفیہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ جب مسلمان کثیر التعداد ہو گئے اور ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی کہ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو سکیں تو وہ سبب باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے ابتداءً مولفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا تھا، اس لیے باجماع صحابہ یہ حصہ ہمیشہ کے لیے ساقط ہو گیا ہے۔ (قاضی محمد ثناء اللہ العثمانی، التفسیر المظہری، المجلد الرابع، صفحہ ۲۳۶_۲۳۴)

حنفیہ کا یہ مسلک واضح طور پر زمانی تاثر کا نتیجہ ہے۔ حنفی فقہ چوں کہ ایسے زمانہ میں مرتب ہوئی

جب کہ اسلام غالب حالت پر تھا۔ اس لیے بظاہر تالیف قلب کی ضرورت پائی نہیں جاتی تھی۔ اس وقتی صورت حال کی بنا پر انہوں نے اپنا مذکورہ مسلک بنایا۔ مگر اب دوبارہ حالات بدل چکے ہیں۔ چنانچہ متعدد علماء نے صراحت کی ہے کہ قرآن کے دوسرے احکام کی طرح یہ حکم بھی دائمی ہے اور وہ اب بھی مطلوب ہے۔

ارتداد کے سلسلے میں جو لوگ فقہ سے استدلال کرتے ہیں کہ اس کی سزا قتل ہے، اس کی نوعیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ موجودہ فقہ اس وقت مدون ہوئی جب کہ اسلام ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے بالفعل ایک بااقتدار طاقت بن چکا تھا۔ اس وقت ارتداد کے معنٰی سادہ طور پر صرف اسلامی عقیدہ بدلنے کے نہیں تھے بلکہ ارتداد کے بیش تر واقعات سیاسی وفاداری تبدیل کرنے کے ہم معنٰی بن گئے تھے۔ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ارتداد عموماً بغاوت کے ہم معنی ہوا کرتا تھا۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں وہ فقہی احکام مرتب ہوئے جو آج ہمیں کتابوں کے اندر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے ارتداد کو وقت کے عملی اور عمومی مسئلہ کی روشنی میں ریاست سے بغاوت کے معنٰی میں لیا، انہوں نے اس کی سزا قتل قرار دی۔ کیوں کہ ریاست سے بغاوت کی سزا بلاشبہہ یہی ہے۔ اور جن لوگوں نے ارتداد کو مجرد تبدیلیٔ مذہب کے عقیدہ کے معنٰی میں لیا، انہوں نے طلبِ توبہ کے سوا کسی اور کارروائی کی ضرورت نہیں سمجھی۔

قرآن کی روشنی میں

اس مسئلہ پر جب ہم قرآن کی روشنی میں غور کرنا شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے حسبِ ذیل آیت ہمارے سامنے آتی ہے: **لا اکراہ فی الدین، قد تبین الرشد من الغي، فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لاانفصام لها، واللہ سمیع علیم** (البقرۃ: ۲۵۶) یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں۔ بے شک ہدایت کا راستہ اور گمراہی کا راستہ واضح ہو چکا ہے۔ اب جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے بڑا مضبوط حلقہ

پکڑ لیا جس کو ٹوٹنا نہیں، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

یہ آیت اس باب میں نص صریح ہے کہ اسلام میں مذہبی جبر کا حکم نہیں۔ اکراہ کے معنی عربی زبان میں مجبور کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔۔۔الاّ من اکرہ وقلبه مطمئن بالایمان (النحل ۱۰۶) اب اگر مجرد ارتداد کی سزا قتل قرار دی جائے جو واضح طور پر اکراہ کی صورت ہے تو یہ اس آیت سے ٹکرا جائے گی۔ مجرد ارتداد کی سزا قتل کو قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ زبردستی لوگوں کو مسلمان بنا کر رکھا جائے اور اگر وہ اس کے لیے راضی نہ ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ مذکورہ قرآنی آیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ قرآن میں واضح طور پر یہ اعلان کیا گیا ہے: فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر (الکہف: ۲۹) اور یہ کہ: لست عليهم بمصيطر (الغاشیۃ ۲۲) یعنی اسلام کی بنیاد پُرامن فہمائش پر ہے نہ کہ زور زبردستی پر۔

اسی طرح ایک آیت میں کہا گیا ہے: ولو شاء ربك لآمن من في الأرض كلّهم جميعا أفانت تكره الناس حتى يكونوا مؤمنين (یونس ۹۹) اگر تمہارا رب چاہتا تو بلاشبہہ زمین کے سارے لوگ ایمان لاتے اب کیا تم زبردستی کرو گے کہ لوگ مسلمان ہو جائیں۔

ان قرآنی آیتوں سے اصولی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں رکھی گئی ہے۔ تاہم ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ آیتیں ان لوگوں کے بارہ میں ہیں جو ابھی ایمان نہیں لائے ہیں۔ ایک بار ایمان قبول کرنے کے بعد صورت حال بدل جاتی ہے۔ مگر قرآن اس بارہ میں خاموش نہیں۔ متعدد آیتوں میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دین میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ اپنے دین کو بدل لیں۔ مگر کہیں بھی ان کو قتل کا مستوجب قرار نہیں دیا گیا ہے۔ چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

ومن يتبدل الكفر بالايمان فقد ضل سواء السبيل (البقرہ ۱۰۸) اور جس شخص نے ایمان کو کفر سے بدل لیا تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

يا ايها الذين آمنوا من يرتد منكم عن دينه فسوف ياتى الله بقوم يحبهم و يحبونه اذلة على المؤمنين اعزة على الكافرين يجاهدون فى سبيل الله و لا يخافون

لومة لائم ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، واللّٰہ واسع علیم (المائدہ ۵۴) اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسے لوگ لے آئے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور جن کو اللہ سے محبت ہوگی۔ وہ اہل ایمان پر نرم ہوں گے، منکرین پر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔

یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه، قل قتال فيه كبير، وصد عن سبيل الله و كفر به والمسجد الحرام، واخراج أهله منه اكبر عند الله، والفتنة اكبر من القتل، ولايزالون يقاتلونكم حتى يردوكم عن دينكم ان استطاعوا، ومن يرتدد منكم عن دينه فيمت و هو كافر فاولئك حبطت أعمالهم فى الدنيا والآخرة، واولئك اصحاب النار هم فيها خالدون (البقرة ۲۱۲)

لوگ تم سے شہر حرام میں لڑائی کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے اور روکنا اللہ کی راہ سے، اور اس کا انکار کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا، اور نکال دینا اس سے لوگوں کو، اس سے بھی بڑا گناہ ہے اللہ کے نزدیک۔ اور فتنہ زیادہ بڑا گناہ ہے قتل سے۔ اور یہ تمہارے ساتھ جنگ جاری رکھیں گے یہاں تک کہ پھیر دیں تم کو تمہارے دین سے اگر مقدور پائیں۔ اور جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے اور وہ اسی حال میں مر جائے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے اور وہ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

ان آیتوں میں صراحتاً دین بدلنے والوں اور ارتداد اختیار کرنے والوں کا ذکر ہے۔ مگر اس جرم کے لیے ان کی کوئی دنیوی سزا نہیں بتائی گئی ہے۔ صرف اخروی سزا کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس آیت میں فیمت کا لفظ بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ان کے لیے حالات میں طبعی موت کا امکان تسلیم کر رہا ہے، نہ یہ کہ قتل ہو کر ان کے مرنے کی خبر دے رہا ہے۔

جولوگ ارتداد کی سزا قتل قرار دیتے ہیں، وہ قرآن کی حسب ذیل آیت سے اس کا حکم اخذ کرتے ہیں: **قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اولی باس شدید تقاتلونھم او یسلمون فان تطیعوا یوتکم اللہ اجراً حسناً وان تتولوا کما تولیتم من قبل یعذبکم عذابا الیما** (الفتح ١٦) کہہ دو پیچھے رہنے والے اعراب سے کہ عنقریب تم ایسے لوگوں کی طرف لائے جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہوں گے، تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ پس اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو اچھا اجر دے گا اور اگر پھر جاؤ گے جیسا پھر گئے تھے پہلی بار، تو وہ تم کو دردناک سزا دے گا۔

اس آیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں اس جہاد کی پیشین گوئی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے زمانۂ خلافت میں مرتدین (مانعین زکوٰۃ) کے خلاف کیا تھا۔ مگر اس آیت میں صریح طور پر لڑنے والوں کا ذکر ہے، نہ کہ مذہب بدلنے والوں کا۔ بالفاظ دیگر، یہ آیت حکومتِ اسلامی کے خلاف جارح باغیوں کا حکم بتا رہی ہے، نہ کہ صرف عقیدہ تبدیل کرنے والوں کا حکم۔ ایسی حالت میں اس آیت سے مرتدین کا حکم نکالنا محض استنباطی چیز ہے۔ کیوں کہ آیت میں مرتدین کا صراحتاً ذکر نہیں۔ مزید یہ کہ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس آیت میں کون سا گروہ مراد ہے۔

آیت میں جہاں تک **تقاتلونھم او یسلمون** کے فقرہ کا تعلق ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ متفقہ طور پر اس کا حسب ذیل مطلب بتایا گیا ہے: **اما المقاتلة او الاسلام لا ثالث لھما لاینقطع القتال بغیر الاسلام** (روح المعانی) یعنی یا جنگ یا اسلام۔ ان دو کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں۔ جنگ نہیں رکے گی جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں۔

مگر اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون سا گروہ ہے جس کے بارہ میں یہ سخت حکم دیا گیا ہے۔ ابن المنذر اور طبرانی نے زہری سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد بنو حنیفہ اور اہل یمامہ ہیں جنہوں نے مسیلمہ کا ساتھ دیا۔ عطار اور مجاہد سے ابن جریر اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد فارس کے لوگ ہیں۔ عکرمہ اور ابن جُبیر اور قتادہ کا قول ہے کہ اس سے مراد قبیلۂ ہوازن اور وہ لوگ ہیں

جنہوں نے حنین میں آپ سے جنگ کی۔ قتادہ سے ایک اور قول مروی ہے کہ اس سے مراد قبیلہ ثقیف کے لوگ ہیں۔ کعب کا قول ہے کہ یہ اہل روم کے بارہ میں ہے جن کی طرف آپ تبوک کے غزوہ پر نکلے۔ ایک اور قول ہے کہ اس سے مراد اعراب فارس اور اکرادِ عجم ہیں (روح المعانی، الجامع لاحکام القرآن)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: للعلماء اختلاف فی کونهم فی الاصل عربا او غیرهم فقیل لیسوا من العرب و قیل منهم (علماء کا اس معاملہ میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں عرب مراد ہیں یا ان کے علاوہ قومیں مراد ہیں۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ غیر عرب ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عرب ہیں۔

چوں کہ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفسیر مروی نہیں، اس لیے مختلف اقوال کی تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ یہ اقوال اصل آیت کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ وہ اس کے مختلف انطباقات ہیں۔ صاحب روح المعانی مختلف اقوال کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں: وقال ابو حیان الذي أقوله ان هذه الاقوال تمثيلات من قاتلهما لا تعيين القوم (ابوحیان نے کہا ہے، اور اسی سے مجھے بھی اتفاق ہے، کہ یہ تمام اقوال ان لوگوں کی مثالیں ہیں جن سے جنگ ہوئی۔ یہ کسی ایک گروہ کی تعیین نہیں ہے)۔

امام رازی نے الی قوم اولي بأس شديد کے حسب ذیل مصداقات جمع کیے ہیں:

۱۔ ہوازن وثقیف جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی۔

۲۔ فارس وروم جن سے حضرت عمر نے جنگ کی۔

۳۔ بنو حنیفہ جنہوں نے مسیلمہ کا ساتھ دیا اور حضرت ابوبکر نے ان سے جنگ کی۔

امام رازی لمبی بحث کے بعد لکھتے ہیں: و اقوى الوجوه هو ان الدعاء كان من النبي صلى الله عليه وسلم (زیادہ قوی پہلو یہ ہے کہ اس آیت میں جس پکار کا ذکر ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار تھی۔ (یعنی اس سے مراد کوئی ایسی قوم ہے جس سے خود رسول نے جنگ کی ہو)

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے سلسلے میں خود یہ امر ثابت شدہ نہیں ہے کہ وہ

''مرتدین'' کے بارے میں ہے۔ ایسی حالت میں اس سے مرتدین کی سزا کا حکم نکالنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورہ فتح کی مذکورہ آیت سے قتل مرتد کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ نہ اس آیت میں ایسا کوئی لفظ ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ یہ آیت مرتدین کے بارہ میں ہے۔

بالفرض اگر مان لیا جائے کہ سورہ فتح کی مذکورہ بالا آیت خلافت ابوبکر کے زمانہ میں ہونے والے مرتدین کے خلاف جہاد کی پیشین گوئی تھی، جب بھی اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ مجرد ارتداد کی سزا قتل ہے۔ کیوں کہ وہ لوگ جن کے خلاف خلیفۂ اول نے جنگ کی تھی وہ عام معنوں میں ''مرتد'' نہیں تھے۔ یعنی انہوں نے اسلام اور کلمۂ اسلام کو ترک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے صرف ''منع زکوٰۃ'' کا فعل کیا تھا۔ وہ صراحتاً کہتے تھے کہ ہم اسلام کو مانتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔ حتی کہ خود زکوٰۃ کی فرضیت سے بھی انہیں انکار نہ تھا۔ وہ صرف یہ کہتے تھے کہ ہم حکومتِ مدینہ کے عُمّال کو اپنی زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ گویا کہ یہ مانعین زکوٰۃ، حکومت کی اطاعت نہ کرنے کے مجرم تھے نہ کہ اسلام کو ترک کردینے کے۔ یہ بغاوت کا معاملہ تھا نہ کہ ارتداد (ترک اسلام) کا معاملہ۔ خود خلیفہ ابوبکر نے ان کے خلاف کارروائی منع زکوٰۃ کی بنیاد پر کی تھی نہ کہ ارتداد کی بنیاد پر۔

حدیث سے استدلال

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ البتہ البخاری اور الترمذی اور دوسرے محدثین نے اس سلسلے میں ایک روایت نقل کی ہے۔ امام مالک نے موطا میں زید بن اسلم سے ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: مالک عن زید بن اسلم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من غیّر دینہ فاضربوا عنقہ (امام مالک نے زید بن اسلم سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان اپنے دین کو بدل ڈالے اس کی گردن ماردو)۔ عبداللہ بن عباس کی روایت میں مَن بدّل دینَہ فاقتلوہ کے الفاظ ہیں۔ امام سرخسی نے اسی کو نقل کیا ہے۔ اب اس حدیث پر غور کیجئے۔

اس حدیث کے سلسلے میں ہم کہیں گے کہ ہر دوسرے عمل کی طرح تبدیل دین یا تغییر دین کے دو درجے ہیں۔ایک یہ کہ آدمی ذاتی طور پر محض اپنے عقیدے کو بدل لے۔دوسرے یہ کہ وہ دین کے محاذ سے نکل کر کفر کے محاذ میں چلا جائے۔قرائن بتاتے ہیں کہ اس حدیث میں دوسری نوعیت کے جرم کا ذکر ہے۔اس میں مجرد اعتقادی ارتداد کا حکم نہیں بتایا گیا ہے بلکہ یہاں اس ارتداد کا ذکر ہے جو موجودہ اصطلاح میں ریاستی بغاوت (treason) کے درجہ کو پہنچ گیا ہو۔

مذکورہ بالا حدیث ارتداد کی سزا کے بارہ میں اگر اتنی قطعی ہوتی تو اس بارہ میں فقہاء کی دو رائیں نہ ہوتیں۔مگر علامہ شعرانی کے الفاظ میں، اس بارہ میں ''نرم اور سخت'' دو قسم کے اقوال پائے جاتے ہیں۔یہ اختلاف خود بتاتا ہے کہ یہ حدیث سزائے موت کے بارے میں اتنی قطعی نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔

علامہ ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب الأحکام السلطانیہ میں مذکورہ بالا حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تبدیلیٔ دین یا ارتداد کے واقعہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ایک یہ کہ اسلامی سلطنت (دارالاسلام) میں کچھ افراد انفرادی طور پر مرتد ہو جائیں۔وہ کسی مستقل سیاسی ہیئت یا تنظیمی ڈھانچہ سے وابستہ نہ ہوئے ہوں، جو ان کو مسلمانوں سے علیحدہ ایک فعال گروہ کی حیثیت دے دے۔ ایسی صورت میں ان سے قتال کی ضرورت نہیں۔کیوں کہ وہ اقتدار اسلامی کی دسترس میں ہیں۔بلکہ ان کے ارتداد کا سبب معلوم کیا جائے گا۔اگر وہ دین میں کسی شبہ کا اظہار کریں تو دلائل کے ذریعہ اس کو دور کیا جائے گا تاکہ ان پر حق واضح ہو جائے۔اور ان کو باطل سے توبہ کرنے پر آمادہ کیا جائے گا (اما ان یکونوا فی دار الاسلام شذاذا أو أفراداً لم یتحیزوا بدار یتمیزون بها عن المسلمین، فلا حاجة بنا إلى قتالهم، لدخولهم تحت القدرة، ویکشف عن سبب ردّتهم، فإذا ذكروا شبهة في الدين، أو ضحت لهم بالحجج والأدلة، حتى يتبين لهم الحق، وأخذوا بالتوبة مما دخلوا فيه من الباطل)

دوسری حالت وہ ہے جب کہ وہ کسی مستقل سیاسی ہیئت یا تنظیمی ڈھانچہ سے وابستہ ہو کر

مسلمانوں سے الگ ایک طاقتور گروہ بن جائیں۔ ارتداد کی اس صورت میں ان سے قتال کیا جائے گا۔ مگر اس سے پہلے ان سے اسلام پر مناظرہ کیا جائے گا اور اس کے حق میں دلائل واضح کیے جائیں گے۔ (الحالة الثانية أن ينحازوا بدار يتفردون بها عن المسلمين، حتى يصيروا ممتنعين، فيجب قتالهم على الردة، بعد مناظرتهم على الاسلام وايضاح دلائله)

الماوردی کی اس تصریح سے اس قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ حدیث میں مرتد کو قتل کرنے یا اس سے قتال کرنے کا جو حکم ہے، وہ مطلق نہیں بلکہ اس صورت حال کے ساتھ مخصوص ہے جب کہ ارتداد مسلم ریاست کے خلاف بغاوت کے ہم معنیٰ بن جائے۔

صاحب بدایۃ المجتہد لکھتے ہیں: المرتد اذا ظفر به قبل ان يحارب...... اور مرتد پر جب غلبہ پالیا جائے اس سے پہلے کہ وہ محاربہ کرے......)

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ فقہاء جب ارتداد کا حکم بیان کررہے تھے تو اس کو وہ ایک علیٰحدہ واقعہ کے طور پر نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ اس کو وہ محاربت کے مسئلہ سے مربوط سمجھتے تھے۔ اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ارتداد پر جن فقہاء نے قتل کا حکم لگایا ہے وہ محاربت کے پس منظر میں لگایا ہے نہ کہ مطلق طور پر۔ یعنی مرتد سے اُن کی مراد مرتدِ محارب ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف مرتد۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس قولِ رسول سے انہوں نے یہ حکم مستنبط کیا ہے، اس قول کے وقت مرتد کے یہی معنیٰ تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مرتد اور باغی کے لیے الگ الگ الفاظ مستعمل نہیں ہوتے تھے، جیسا کہ آج ہے۔

اس قیاس کے حق میں دوسرا قرینہ یہ ہے کہ فقہا میں ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ مرتدہ (مرتد عورت) کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ صرف قید کردیا جائے گا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ عورت صنفِ ضعیف ہے۔ اس سے محارب بننے کا خطرہ نہیں۔ تاہم حالتِ جنگ میں وہ جاسوسی وغیرہ کے ذریعہ دشمن کی مدد کرسکتی ہے۔ اس لیے اس کو قید کرنے کا حکم دیا گیا۔ اگر اس حکمت کو تسلیم نہ کیا جائے تو ایک ہی جرم کی سزا عورت اور مرد کے لیے اتنی مختلف کیوں مقرر کی گئی۔

ابن حجر نے حدیث کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے ایک فقرہ یہ ہے: واستدل به

عـن قتل المرتدة كالمرتد وخصه الحنفية بالذكر وتمسكوا بحديث النهى عن قتل النسـاء وحـمـل الـجمهور النهي على الكافرة الاصلية اذا لم تباشر القتال ولا القتل لـقـولـه في بعض طرق حديث النهي عن قتل النساء لما رأى المرأة مقتولة ما كانت هـذه لتـقـاتـل ثم نهى عن قتل النساء (اوراس سے مرتدہ کے قتل پر استدلال کیا گیا ہے مرتد کی طرح، اور حنفیہ نے اس حکم کو مرتد مرد کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ان کے استدلال کی بنیاد وہ حدیث ہے جس میں عورت کے قتل کو منع کیا گیا ہے۔اور جمہور نے اس ممانعت کو اصل منکر عورت سے متعلق کیا ہے جب کہ وہ لڑائی میں شریک نہ ہو رہی ہو۔جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جب آپ نے مقتول عورت دیکھی جو جنگ میں شریک نہ تھی تو آپ نے عورت کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

حدیث: من بـدل دينه فاقتلوه کے راوی عبداللہ بن عباس ہیں۔(ملاحظہ ہو صحیح البخاری، رقم الحدیث ۳۰۱۷، نیز رقم الحدیث ۶۹۲۳)۔یہ حدیث اُنہوں نے مدنی دور میں ایک جنگ کے موقع پر بیان کی۔یہاں یہ سوال ہے کہ اعتقادی ارتداد کے واقعات مکّی دور اور مدنی دور دونوں ہی زمانوں میں پیش آئے۔پھر ایسا کیوں ہے کہ مکّی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول سامنے نہیں آیا، وہ صرف مدنی دور میں سامنے آیا، جب کہ اسلام ایک ریاست کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ارتداد کی سزا کا تعلق مجرّد عقیدہ یا مذہب کی تبدیلی سے نہیں ہے بلکہ اُس کا تعلق ریاستی دور کے معاملات سے ہے۔چناں چہ کچھ علماء نے اس حکم کو حکم الحربی کے معنیٰ میں لیا ہے۔(فتح الباری لابن حجر، جلد ۱۲، صفحہ ۲۸۱) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارتداد کا تعلق مجرد اعتقادی ارتداد سے نہیں ہے بلکہ اُس کا تعلق اُن افراد سے ہے جو اسلامی ریاست کے خلاف برسرِ جنگ ہوں۔

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نبوت ملنے کے بعد ۱۳ سال تک مکّہ میں رہے۔اس کے بعد آپ ہجرت کر کے مدینہ چلے گیے۔وہاں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکّہ کے تیرہ سالہ دور میں بھی ارتداد کے بعض واقعات پیش آئے۔مثلاً مکّی دور میں اہل ایمان کا ایک قافلہ مکّہ کو چھوڑ کر پڑوسی ملک حبش میں چلا گیا۔یہ لوگ، دو

قسطوں میں وہاں گئے تھے اور ان کی مجموعی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔

ان مسلمانوں میں ایک وہ تھے جن کا نام عبیداللہ بن جحش تھا۔ اُنہوں نے رسول اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا اور پھر مشرکین مکہ کی ایذا رسانی کی بنا پر ہجرت کر کے حبش چلے گیے تھے۔ حبش ایک عیسائی ملک تھا۔ وہاں وہ عیسائیوں سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے اعلان کے ساتھ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۳، صفحہ ۴۱۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''ارتداد'' کے اس واقعہ کا علم ہوا۔ مگر رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ شخص مرتد ہو گیا ہے اور شرعی قانون کے مطابق، اُس کو قتل کر دینا چاہیے۔ یہ فرق کہ مرتد کے لیے قتل کا حکم مکّی دور میں بیان نہیں ہوا، وہ صرف مدنی دور میں بیان ہوا، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ارتداد کی سزا کا حکم مجرّد اعتقادی تبدیلی سے نہیں ہے بلکہ اُس کا تعلق اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت سے ہے۔ یعنی اس معاملہ میں حکم قتل کا تعلق جارحانہ ارتداد سے ہے، نہ کہ مجرّد طور پر سادہ ارتداد سے۔

مرتد کی سزائے قتل کا مسئلہ اگر اعتقادی روش پر مبنی ہو، یعنی مجرّد یہ بات کہ ایک شخص جو اعلان کے ساتھ مذہب اسلام پر ہو اور پھر وہ اعلان کے ساتھ مذہب اسلام کو ترک کر دے تو وہ قتل کا مستوجب قرار پائے گا۔ اگر یہ حکم صرف شخصی نوعیت کے اعتقادی جُرم پر مبنی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس معاملہ میں حدّ شرعی قائم کرتے ہوئے عورت اور مرد کے درمیان فرق رکھا جائے گا، جب کہ قرآن و حدیث کے دوسرے احکام میں صنفی بنیاد پر اس قسم کی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: **الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة** (النور ۲) اسی طرح قرآن میں ہے: **السارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما** (المائدة ۳۸)۔ اس طرح کے دوسرے بہت سے حوالے قرآن اور حدیث میں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جرم کی سزا کے معاملے میں شریعت نے عورت اور مرد کے درمیان فرق نہیں کیا ہے۔ اگر جرم یکساں ہے تو سزا بھی یکساں دی جائے گی۔

مگر جیسا کہ معلوم ہے، فقہاء نے مرتد اور مرتدہ دونوں کی سزا کے معاملہ میں فرق کیا ہے۔

جہاں تک مرتد مرد کا تعلق ہے اُس کو وہ قابلِ قتل قرار دیتے ہیں مگر مرتد عورت کے بارے میں وہ قتل کے قائل نہیں۔ اس فرق کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ قتل کے معاملہ کو مرتد باغی سے متعلق کیا جائے۔ کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ باغیانہ سرگرمیاں ہمیشہ مرد کرتے ہیں، عورت اپنی انفعالی فطرت کی بنا پر باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوا کرتی۔

فقہاء کی رائے

یہاں ہم زیر بحث مسئلہ میں علامہ شعرانی اور امام سرخسی کی تصریحات نقل کرتے ہیں۔
علاّمہ شعرانی کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''ارتداد کا مطلب اسلام سے تعلق منقطع کرنا ہے، نیت سے یا قول سے یا عمل سے۔ اور ائمہ کا اتفاق ہے کہ جو اسلام سے مرتد ہو جائے اس کا قتل واجب ہے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ زندیق کا قتل واجب ہے اور زندیق وہ ہے جو کافر ہو گیا ہو مگر کفر کو چھپائے اور اسلام کا اظہار کرے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ اہل بلد جب مرتد ہو جائیں تو ان سے جنگ کی جائے گی اور ان کا مال مالِ غنیمت شمار ہوگا۔

یہ وہ مسائل ہیں جن میں میں نے اتفاق پایا ہے۔ جن مسائل میں اختلاف ہے، ان میں سے امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ مرتد کو فوراً قتل کر دیا جائے گا اور توبہ طلب کرنے کے لیے توقف نہیں کیا جائے گا۔ اور جب توبہ طلب کی جائے اور وہ توبہ نہ کرے تو اس کو مہلت نہ دی جائے گی الاّ یہ کہ وہ خود مہلت مانگے۔ اگر وہ مہلت مانگے تو تین بار مہلت دی جائے گی۔ ان کے اصحاب میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ مہلت دی جائے گی خواہ اس نے مہلت نہ مانگی ہو۔

امام مالک نے کہا ہے کہ توبہ طلب کرنا واجب ہے۔ اگر وہ فوراً توبہ کرے تو توبہ قبول کی جائے گی۔ اور اگر فوراً توبہ نہ کرے تو تین بار مہلت دی جائے گی۔ اس امید میں کہ شاید وہ توبہ قبول کر لے۔ پس اگر توبہ کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعی کا قول ہے کہ توبہ طلب کرنا واجب ہے، اس کے بعد مہلت نہ دی جائے گی بلکہ فوراً قتل کر دیا جائے گا

جب کہ وہ ارتداد پر اصرار کر رہا ہو۔ امام احمد سے دو قول مروی ہیں۔ ایک وہی جو امام مالک کا ہے۔ دوسرا یہ کہ توبہ طلب کرنا ضروری نہیں۔ مہلت دینے کے معاملہ میں ان سے مختلف روایتیں منقول ہیں۔ حسن بصری کے بارہ میں منقول ہے کہ مرتد سے نہ توبہ طلب کی جائے گی اور نہ فوراً اس کا قتل واجب ہے (ان المرتد لا یستتاب و لا یجب قتله فی الحال) عطار نے کہا کہ اگر وہ پیدائش سے مسلمان تھا اور پھر مرتد ہوا، تو اس سے توبہ طلب نہ کی جائے گی۔ اور اگر کافر سے مسلمان ہوا ہو اور پھر ارتداد کا راستہ اختیار کرے تو اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔ سفیان ثوری سے منقول ہے کہ اس سے ہمیشہ توبہ ہی طلب کی جائے گی (أنّه یُستتاب أبداً و لا یُقتل)

پس امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا قول سخت ہے، سوا امہال کے ابوحنیفہ کے نزدیک۔ اور اصحاب ابوحنیفہ کے قول میں تخفیف ہے۔ اسی طرح امام مالک کا قول ہے امہال اور طلب توبہ کے بارے میں۔ امام احمد کے دو اقوال ہیں۔ ایک قول اسی قسم کا ہے۔ اور امام حسن بصری کے قول میں بھی تخفیف ہے۔ اور عطار کے قول میں تفصیل ہے۔ سفیان ثوری کے قول میں بھی تخفیف ہے۔ کیوں کہ اس کے مطابق، مرتد سے ہمیشہ توبہ ہی طلب کی جائے گی اور اس کو قتل نہ کیا جائے گا (انه یستتاب ابدا و لا یقتل)

ائمہ ثلاثہ کے قول کے مطابق، مرتدہ (عورت) کا حکم بھی وہی ہے جو مرتد (مرد) کا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ عورت کو قید کیا جائے گا اور اس کو قتل نہ کیا جائے گا۔ پس پہلا قول سخت ہے اور دوسرے قول میں تخفیف ہے۔ پہلے قول کی وجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ من بدل دینه فاقتلوه (جو شخص اپنے دین کو بدلے اس کو قتل کر دو)

اس میں مرد اور عورت دونوں شامل معلوم ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس حکم کو صرف مردوں سے خاص کرتے ہیں ان کے خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنے ارتداد سے دین میں کوئی بڑا خلل پیدا نہیں کر سکتی۔ اور نہ مرتد ہو کر وہ دین کفر کی طرف سے جنگ کر سکتی

ہے جیسا کہ مرد کرتا ہے (فان المرأة لاتظهر فی دین الاسلام کبیر خلل بردتها ولا تحارب عن دین الکفر اذ ارتدت بخلاف الرجل) عبدالوہاب شعرانی، کتاب المیزان، الجزء الاول، باب الردة، مطبع حجازی، قاہرہ، ۱۹۳۶، صفحات ۱۵۷۔۱۵۶، کتاب المبسوط، شمس الدین السرخسی، مصر ۱۳۲۴ھ، جلد ۱۰)

المبسوط میں مرتدین پر تقریباً ۳۰ صفحات کا طویل باب ہے جس میں مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہے۔ یہاں ہم زیر بحث پہلو سے متعلق ضروری حصہ نقل کرتے ہیں:

واذا ارتد المسلم عرض علیه الإسلام، فان اسلم والا قتل مکانه الا ان یطلب ان یوجل فاذا طلب ذلک اجل ثلاثة ایام۔ والاصل فی وجوب قتل المرتدین قوله تعالیٰ: تقاتلونهم او یسلمون، قیل الآیة فی المرتدین۔ وقال صلی الله علیه وسلم من بدل دینه فاقتلوه۔ وقتل المرتد علی ردته مروی عن علی وابن مسعود ومعاذ وغیره من الصحابة رضی الله عنهم، وهذا لان المرتدبمنزلة مشرکی العرب او اغلظ منهم جنایة، فانهم قرابة رسول الله صلی الله علیه وسلم، والقرآن نزل بلغتهم، و لم یراعوا حق ذلک حین اشرکوا، وهذا المرتد کان من اهل دین رسول الله صلی الله علیه وسلم وقد عرف محاسن شریعته، ثم لم یراع ذالک حین ارتد۔ فکما لا یقبل من مشرکی العرب الا السیف اوالاسلام، فکذالک من المرتدین الا انه اذا طلب التاجیل اجل ثلاثة ایام، لأن الظاهر انه دخل علیه شبهة ارتد لاجلها، فعلینا ازالة تلک الشبهة، او هو یحتاج الی التفکر لیتبین له الحق، فلا یکون ذالک الا بمهلة، فان استمهل کان علی الامام ان یمهله، و مدة النظر مقدرة بثلاثة ایام فی الشرع کما فی الخیار، فلهذا یمهله ثلاثة ایام لا یزیده علی ذالک، و ان لم یطلب التاجیل یقتل من ساعته......

وقال الشافعی رحمه الله تعالیٰ یجب علی الامام أن یوجله ثلاثة ایام ولا

يحل ان يقتله قبل ذالک، لما روى ان رجلا قدم عمر رضى الله عنه فقال له هل من مغربة خبر، فقال نعم، رجل كفر بعد ايمانه۔ فقال ما ذا صنعتم به، قال قدمناه فضربنا عنقه۔ فقال لو وليت منه مثل الذي وليتم لاستتبته ثلاثة ايام، فان تاب والا قتلته۔ فهذا دليل انه يستحب الامهال۔

......ولا تقتل المرتدة ولكنها تحبس و تجبر على الاسلام عندنا۔ وقال الشافعي رحمه الله تعالىٰ تقتل ان لم تسلم۔ وهٰكذا كان يقول ابو يوسف رحمه الله تعالىٰ فى الابتداء ثم رجع......وحجتنا فى ذالک نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن قتل النساء، وفيه حديثان احدهما ما رواه رباح ابن ربيعة رضى الله تعالىٰ عنه ان النبى صلى الله عليه وسلم رأى فى بعض الغزوات قوما مجتمعين على شيئ، فسال عن ذالک، فقالوا ينظرون الى امرأة مقتولة فقال لواحد ادرک خالداً وقال له لا يقتلن عسيفا ولا ذرية......

ولما رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم فتح مكة امرأة مقتولة فقال ها ما كانت هذه تقاتل۔ ففي هذا بيان لک استحقاق القتل بعلة القتال وان النساء لا يقتلن لانهن لا يقاتلن...... والمرتدة التي قتلت كانت مقاتلة۔ فان ام مروان كانت تقاتل وتحرض على القتال...... وهٰذا لأن القتل ليس يجزأ على الردة بل هو مستحق باعتبار الاصرار على الكفر۔ الا ترى انه لو اسلم يسقط لانعدام الاصرار۔ وما يكون مستحقا جزاء لا يسقط بالتوبة كالحدود۔ فانه بعد ما ظهر سببها عند الامام لايسقط بالتوبة ......

ان تبديل الدين واصل الكفر من اعظم الجنات ولكنها بين العبد وبين ربه فالجزاء عليها مؤخر الى دار الجزاء، وما عجل فى الدنيا سياسات مشروعة لمصالح تعود الى العباد۔ كالقصاص لصيانة النفوس، وحد الزنا لصيانة الانساب،

وحد السرقة لصيانة الاموال، وحدالقذف لصيانة الأعراض، وحد الخمر لصيانة العقول۔

وبالاصرار على الكفر يكون محاربا للمسلمين فيقتل لدفع المحاربة، الا ان اللّٰه تعالىٰ نص على العلة في بعض المواضع بقوله تعالىٰ فان قاتلوكم فاقتلوهم...... فاذا ثبت ان القتل باعتبار المحاربة وليس للمرأة بنية صالحة للمحاربة فلا تقتل فى الكفر الاصلى ولا فى الكفر الطارى ولكنها تحبس...... واذا كانت مقاتلة فقتلها للدفع، وبدون القتل هٰهنا يحصل المقصود اذا حبست...... وبدون تحقق السبب لا يثبت الحكم۔

واختلف مشائخنا في ذوي الاعذار من مشركى العرب فمنهم من يقول يقتلون في الكفر الاصلى لان حلول الآفة كعقد الذمة، فانه ينعدم به القتال۔ فمن لا يسقط القتال عنه بعقد الذمة في الكفر الاصلي فكذالک بحلول الآفة۔ فعلى هذا القول ذوو الاعذار من المرتدين يقتلون۔ وقيل حلول الآفة بمنزلة الانوثة لانه تخرج به بنيته من أن تكون صالحة للقتال۔ فعلى هذا القول لا يقتلون بعد الردة كما لا يقتلون في الكفر الاصلي...... واذا ثبت ان المرتدة لا تقتل، قلنا تسترق اذا لحقت بدار الحرب۔ وذكر عاصم عن ابي رزين عن ابن عباس رضي الله عنهما في النساء اذا ارتددن يسبين ولا يقتلن۔ وهذا لانها كالحربية، والاسترقاق مشروع في الحربيات...... وفي النوادر عن أبي حنيفة رحمه الله انها تسترق لانا لما جعلنا المرتد بمنزلة حربى مقهور لا امان له، فكذالک المرتدة بمنزلة حربية مقهورة لا امان لها، فتسترق ويقتل المملوک على الردة لانه محارب كالحر......ولا تقتل المملوكة وتحبس لانها ليس لها بنية صالحة للقتال كالحرة ۔ (كتاب المبسوط، شمس الدين السرخسی، مصر ۱۳۲۴ھ، جلد ۱۰، صفحه ۱۲۴-۹۸)

اور جب مسلمان مرتد ہو جائے تو اس پر اسلام پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو ٹھیک ہے ورنہ قتل کر دیا جائے گا، الّا یہ کہ وہ مہلت مانگے۔ پس اگر وہ مہلت مانگے تو اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ اور قتل مرتد کے واجب ہونے کی بنیاد قرآن کی یہ آیت ہے، تقاتلونهم او يسلمون ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے دین کو بدلے اس کو قتل کر دو۔ اور ارتداد پر مرتد کو قتل کرنا حضرت علی، ابن مسعود اور معاذ وغیرہ صحابہ سے مروی ہے اور یہ حکم اس لیے ہے کہ مرتد کا معاملہ مشرکین عرب جیسا ہے یا اس کا جرم اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں اور قرآن ان کی اپنی زبان میں اترا پھر بھی انہوں نے اس کی صحیح رعایت نہیں کی اور شرک کا طریقہ اختیار کیا۔

اسی طرح یہ مرتدین رسول اللہ کے دینی خاندان میں شامل تھے۔ انہوں نے شریعت کی خوبیوں کو جانا پھر بھی وہ اس کی رعایت نہ کر سکے اور ارتداد کا طریقہ اختیار کیا۔ پس جس طرح مشرکین عرب کے لیے حکم ہے کہ اسلام یا تلوار، اسی طرح مرتدین کا معاملہ بھی ہے، الّا یہ کہ اگر وہ مہلت مانگے تو اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ کیوں کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی شبہہ لاحق ہوا ہو اور اس کی وجہ سے وہ مرتد ہوا ہو۔ پس ہمارا فرض ہے کہ اس شبہہ کو زائل کرنے کی کوشش کریں، یا یہ کہ اسے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہو تا کہ اس پر حق واضح ہو جائے اور یہ کام مہلت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

پس اگر وہ مہلت مانگے تو امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے مہلت دے۔ اور اس کی مدت تین دن خیار کے مسئلہ پر قیاس کر کے لی گئی ہے۔ پس اس بنا پر اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی اور اس میں اضافہ نہیں کیا جائے گا اور اگر مہلت نہ مانگے تو اسی وقت قتل کر دیا جائے گا۔

اور امام شافعی کا قول ہے کہ امام پر واجب ہے کہ اس کو تین دن تک مہلت دے، اس

سے پہلے قتل کرنا جائز نہیں۔ روایت ہے کہ ایک شخص باہر کے کسی مقام سے حضرت عمر کے پاس آیا۔ آپ نے پوچھا کوئی نئی خبر ہے۔ اس نے جواب دیا ہاں، ایک شخص ایمان کے بعد کفر کی طرف چلا گیا۔ پوچھا پھر تم نے کیا سلوک کیا۔ اس ن جواب دیا کہ ہم نے اس کو لیا اور اس کی گردن ماردی۔ آپ نے کہا کہ اگر میں ایسے مرتد کو پاتا تو میں اس سے تین دن تک توبہ طلب کرتا۔ اگر وہ توبہ کر لیتا تو چھوڑ دیتا ورنہ اس کو قتل کر دیتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہلت دینا مستحب ہے۔

اور مرتدہ قتل نہیں کی جائے گی بلکہ ہمارے نزدیک وہ قید کی جائے گی اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کی جائے گی۔ امام شافعی کا قول ہے کہ مرتدہ اگر اسلام قبول نہ کرے تو قتل کی جائے گی۔ امام ابو یوسف کا خیال بھی پہلے یہی تھا پھر انہوں نے اس سے رجوع کرلیا۔ اس معاملہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بارہ میں دو حدیثیں ہیں۔ ایک وہ جو رباح ابن ربیعہ سے مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک جگہ جمع ہیں۔ آپ نے دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ ایک مقتول عورت کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کوئی جا کر خالد سے کہہ دیتا کہ وہ کسی مزدور اور عورت کو قتل نہ کریں۔

فتح مکہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتول عورت کو دیکھا تو فرمایا اس کو کیوں قتل کردیا۔ یہ تو جنگ نہیں کر رہی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل کا سبب قتال کرنا ہے اس لیے عورتیں قتل نہیں کی جائیں گی کیوں کہ وہ قتال نہیں کرتیں۔ اور وہ مرتدہ جو قتل کی گئی وہ قتال کرنے والی تھی، کیوں کہ ام مروان قتال میں شریک تھی اور لوگوں کو قتال پر ابھارتی تھی۔ اور یہ اس لیے کہ قتل، ارتداد کی جزا کے طور پر نہیں ہے بلکہ کفر پر اصرار کی بنا پر وہ قتل کا مستحق ہوگا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب وہ اسلام لائے تو اصرار ختم ہو جانے کی وجہ سے سزائے قتل ساقط

ہو جاتی ہے۔اور جو بطور جزا کے مستحق ہو وہ توبہ سے ساقط نہیں ہوتی جیسے حدود۔ کیوں کہ جب اس کا سبب امام پر ظاہر ہو جائے تو وہ توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔

بلاشبہ تبدیل دین اور کفر اصلی بہت بڑے گناہ ہیں مگر وہ بندے اور خدا کے درمیان کی چیز ہے۔ پس اس کی جزا آخرت پر چھوڑ دی گئی ہے اور جو سزا دنیا ہی میں دے دی جائے وہ ایک شرعی سیاست ہے، ان مصالح کی خاطر جو بندوں کو پہنچتی ہیں۔ جیسے قصاص جان کی حفاظت کے لیے، زنا کی حد نسب کی حفاظت کے لیے، چوری کی حد مال کی حفاظت کے لیے، قذف کی حد آبرو کی حفاظت کے لیے اور شراب کی حد عقل کی حفاظت کے لیے ہے۔

اور کفر پر اصرار سے ایک شخص مسلمانوں کے خلاف محارب ہو جاتا ہے پس وہ دفع محاربت کے لیے قتل کیا جائے گا بعض مواقع پر اللہ تعالیٰ نے اس علت کو بیان کیا ہے جیسے یہ آیت کہ ''پس اگر وہ تم سے قتال کریں تو تم بھی ان سے قتال کرو''۔ پس جب ثابت ہو گیا کہ قتل محاربت کے اعتبار سے ہے اور عورت اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے محاربت کے قابل نہیں ہوتی تو وہ قتل نہیں کی جائے گی البتہ وہ محبوس کی جائے گی۔اور جب وہ قتال میں شریک ہو تو اس کا قتل دفع کی غرض سے ہوگا۔اور جب عورت محبوس کر دی جائے تو بغیر قتل کے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔اور سبب کے تحقق کے بغیر حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ہمارے مشائخ نے مشرکین عرب کے معذورین کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ پس ان کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ وہ کفر اصلی میں قتل کیے جائیں گے کیوں کہ آفت میں مبتلا ہونا عقد ذمہ کی مانند ہے جس سے قتال رک جاتا ہے۔ مگر وہ بھی ہیں کہ عقد ذمہ کے بعد بھی جن سے کفر اصلی میں قتال نہیں رکتا تو ایسے ہی آفت میں مبتلا ہونے کا معاملہ ہے۔ پس اس قول کے مطابق، مرتدین میں سے معذور لوگ قتل کیے جائیں گے اور دوسرے طبقہ کا قول ہے کہ آفت میں مبتلا بمنزلۂ عورت ہونے کے ہے۔ کیوں کہ آفت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کا جسم اس

قابل نہیں رہ جاتا کہ وہ قتال کریں۔لہذا اس قول کی بنا پر وہ ارتداد کے بعد قتل نہیں کیے جائیں گے جیسا کہ وہ کفر اصلی کی بنا پر قتل نہیں کیے جاتے......

جب ثابت ہو گیا کہ مرتدہ قتل نہیں کی جائے گی تو ہم کہتے ہیں کہ وہ لونڈی بنائی جائے گی جب کہ وہ دار الحرب کی طرف چلی جائے۔ اور ابن عباس سے مرتد عورتوں کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ لونڈی بنائی جائیں گی اور قتل نہیں کی جائیں گی۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ حربیہ کی مانند ہیں اور لونڈی بنانے کا حکم حربی عورتوں کے بارہ میں ہے۔ اور امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ مرتد عورت لونڈی بنائی جائے گی کیوں کہ جب ہم نے مرتد مرد کو بمنزلہ حربی قرار دیا ہے جس کو امان نہیں تو اسی طرح مرتدہ عورت بمنزلۂ حربیہ ہے، پس اس کو لونڈی بنایا جائے گا۔ اور مملوک کو قتل کیا جائے گا ارتداد پر کیوں کہ وہ آزاد کی طرح محارب ہے۔ اور مملوکہ قتل نہیں کی جائے گی بلکہ قید کی جائے گی کیوں کہ وہ قتال کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

امام شعرانی اور امام سرخسی کی تصریحات جو ہم نے اوپر نقل کیں، ان سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

- ارتداد کی سزا کے بارے میں نرم اور سخت دو قسم کی رائیں منقول ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک ہی امام نے دو حالتوں میں دو مختلف رائیں دی ہیں۔
- جس طرح مرتد کو قتل کرنے کے متعلق اقوال ہیں اسی طرح بعض اقوال یہ بھی ہیں کہ مرتد کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس سے ہمیشہ صرف توبہ ہی طلب کی جائے گی، یعنی اس کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔
- عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دین کفر کی طرف سے ہو کر جنگ نہیں کرتی۔ بعض مرتد عورتوں کو قتل کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قتال میں کسی اعتبار سے شریک تھیں۔
- قتل ارتداد کی سزا نہیں۔ یہ سزا صرف اصرارِ کفر کی بنا پر ہے، وہ اصرارِ کفر جو محاربت تک پہنچ گیا ہو۔

- تبدیلیٔ دین، خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔ یہ ریاست کا معاملہ نہیں۔ اس معاملہ میں جو سزا دی جاتی ہے وہ شرعی مصلحت کی بنیاد پر ہوتی ہے نہ کہ کسی مذہبی حکم کی بنیاد پر۔
- مرتد کو دفع محاربت کے لیے قتل کیا جائے گا نہ کہ مجرد ارتداد کی بنا پر۔
- قتل کی سزا کا سبب دفع محاربت ہے اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ سبب کے تحقق کے بغیر حکم ثابت نہیں ہوتا۔
- جن مرتدین کے قتل کا حکم ہے ان کو بمنزلہ حزبی قرار دے کر یہ حکم دیا گیا ہے۔
- مرتدین اہل اسلام کے لیے اہل حرب (برسرِ جنگ گروہ) کی مانند ہیں۔
- اگر مجرد ارتداد شرعاً ایک مستوجب قتل جرم ہوتا تو توبہ کے باوجود مرتد کو قتل کر دیا جاتا۔

کیوں کہ حدود شرعیہ کے اسباب قطعی طور پر متحقق ہو جانے کے بعد امام کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کا نفاذ کرے۔ مجرم کی توبہ یا کسی کی سفارش وغیرہ کی بنیاد پر انہیں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

فقہاء کی ایک تعداد یہ کہتی ہے کہ ''مرتد'' سے ہمیشہ توبہ طلب کی جائے گی اور اس کو قتل نہیں کیا جائے گا (یُستتاب ابدا و لا یقتل)۔ تجربہ کے مطابق، یہ طریقہ درست ثابت ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایسے شخص کو مرتد قرار دے کر اس کے گردن زدنی ہونے کا فتویٰ دینا، عملی تجربہ میں بے فائدہ ثابت ہوا ہے۔ اس کی دو مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔

امریکا میں سیاہ فام مسلمانوں کا ایک فرقہ پیدا ہوا جو اپنے کو نیشن آف اسلام کہتا تھا۔ ان کے عقائد تقریباً وہی تھے جو انڈیا میں احمدی فرقہ کے عقائد ہیں۔ دونوں کے کیس کی نوعیت ایک تھی۔ برصغیر ہند میں علماء کی بہت بڑی تعداد احمدی فرقہ کے خلاف قلمی جنگ میں مصروف ہوگئی۔ ان کو کافر قرار دیا گیا۔ ان کے خلاف سخت فتوے دیے گئے۔ مگر عملاً احمدی جماعت (قادیانی جماعت) کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اور نہ وہ تائب ہوئے۔

اس کے برعکس مثال امریکا کی ہے۔ امریکا میں وہ ماحول نہ تھا جو برصغیر ہند میں تھا۔ نیشن آف اسلام کے خلاف تکفیر اور گردن زدنی کے فتوے امریکا میں نہیں دیے جا سکتے تھے۔ اس طرح کے کیس

میں وہاں صرف ایک ہی چیز ممکن تھی۔ اور وہ ڈائیلاگ ہے۔ چنانچہ امریکا کے مسلمان حالات کے زیراثر پُرامن نصیحت اور ڈائیلاگ میں مصروف ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیشن آف اسلام کی بڑی اکثریت تائب ہوکر مسلمانوں کی مین اسٹریم میں شامل ہوگئی۔

یہ تقابلی مثال واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں فتویٰ کا طریقہ درست نہیں۔ اس طرح کے معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ جولوگ ارتداد میں مبتلا ہوئے ہوں، ان کے لیے دعائیں کی جائیں، ان کو ہمدردانہ نصیحت کی جائے، ان کو دلائل کی زبان میں مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہی طریقہ اسلامی طریقہ ہے اور یہی طریقہ عملاً نتیجہ خیز ہے۔

اسی نوعیت کی اور مثال وہ ہے جو ۱۹۴۷ کے زمانہ میں ہندستان میں سامنے آئی۔ ۱۹۴۷ میں جب انڈیا آزاد ہوا تو اسی کے ساتھ یہاں ہندو۔مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ دہلی کے آس پاس کے سیکڑوں دیہاتوں میں یہ ہوا کہ حالات کے شدید دباؤ کے تحت یہاں کے مسلمان مرتد ہوگئے۔ اُنہوں نے دوبارہ ہندودھرم اختیار کرلیا۔ اُنہوں نے اپنے گھروں میں مورتیاں رکھ لیں، وغیرہ۔

خوش قسمتی سے یہاں مفتی صاحبان نہیں پہنچے۔ اس کے برعکس تبلیغی جماعت کے لوگ ان دیہاتوں میں پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے طریقہ کے مطابق، پرامن انداز میں خاموش اصلاحی کام شروع کردیا۔ تبلیغی جماعت نے اپنے طریقہ کے مطابق، ان مرتدین پر فقہی حکم نہیں لگایا بلکہ اپنی ساری توجہ ان کی اصلاح پر لگادی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مرتدین کی بڑی اکثریت تائب ہوکر دوبارہ اسلام میں داخل ہوگئی۔

مفتی صاحبان کے طریقہ کو میں اصولی طور پر غلط سمجھتا ہوں۔ اسی کے ساتھ عملی تجربہ میں بھی وہ تمام تر غلط ثابت ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں تبلیغی جماعت کا اصلاحی طریقہ شرعاً بھی درست ہے اور اپنے تجربہ میں بھی وہ مفید ثابت ہوا ہے۔

تاریخ کی شہادت

ارتداد کے مسئلہ کو جب ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایسے واقعات آتے

ہیں جو مندرجہ بالا نتائج کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

خلیفۂ اول ابوبکر صدیق نے اپنے زمانۂ خلافت میں یمن کے جن مرتدین سے قتال کیا، ان کے دو طبقے تھے۔ ایک طبقہ مانعینِ زکوٰۃ کا تھا۔ انہوں نے دین اسلام کو ترک کرکے کفر و شرک کو نہیں اختیار کرلیا تھا بلکہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور اسلام کے دیگر ارکان مثلاً نماز اور روزہ کی پابندی کا یقین بھی دلاتے تھے، حتیٰ کہ وہ زکوٰۃ کی فرضیت کے بھی معترف تھے۔ مگر محض بخل اور تنگ دلی کی وجہ سے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کررہے تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ بخدا ہم نے ایمان کے بعد کفر نہیں کیا۔ بلکہ اپنے مالوں پر حرص کیا (حتی قالوا، والله ما كفرنا بعد إيماننا، ولكن شححنا على أموالنا) الاحكام السلطانيه، قاضى ابو ليلى۔

مگر چوں کہ اس وقت زکوٰۃ کی وصولی شرعی قاعدہ کے مطابق، اسلامی حکومت کے مقرر کردہ عاملین کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اس کی ادائیگی سے انکار گویا اسلامی نظام حکومت کی اطاعت سے انکار کرنا تھا۔ اس بنا پر ان سے قتال کیا گیا۔ چنانچہ قاضی ابویعلیٰ نے لکھا ہے:

ولو امتنعوا من آدائها إلى الإمام العادل مع الاعتراف بوجوبها، كانوا من بغاة المسلمين، يقاتلون على المنع منه ۔(الاحكام السلطانية) یعنی اگر وہ امام عادل کو زکوٰۃ نہ دیں، خواہ وہ اس کے وجوب کا اعتراف کرتے ہوں تو ان کا شمار مسلم باغیوں میں ہوگا اور اس بنا پر اُن سے قتال کیا جائے گا۔

مرتدین کا دوسرا طبقہ وہ تھا جنہوں نے صرف زکوٰۃ کی فرضیت یا اس کی ادائیگی سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنے اپنے قبیلہ کے جھوٹے مدعیان نبوت کا ساتھ دے کر مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف ایک مستقل محاذ بنالیا اور اس کو ختم کرنے کے درپے ہوگئے۔ قبائلی عصبیت کے شدید غلبہ کی وجہ سے ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ مدینہ کی سیاسی اطاعت کے معنیٰ ہیں، قریش کی بالادستی کو تسلیم کرنا جس کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اقتدار میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن افراد نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جنہوں نے ان کا ساتھ دیا اس کے پیچھے اصلاً یہی سیاسی محرک کارفرما تھا نہ کہ کوئی دینی محرک۔

مثال کے طور پر مسیلمہ کذاب نے دعویٰ نبوت کے بعد اپنے قبیلہ بنوحنیفہ کے لوگوں کے سامنے جو پہلی تقریر کی اس میں یہ مطالبہ کیا کہ سرزمین عرب کا آدھا حصہ قریش کے لیے ہو اور دوسرا آدھا بنو حنیفہ کے لیے۔ لیکن قریش انصاف کرنے والے لوگ نہیں (أن یکون نصف الأرض لقریش، ولبنی حنیفة نصفها، ولکن قریشا قوم لا یعدلون) محمد الخضری بک، تاریخ الأمم الاسلامیة، الجزء الاول، الطبعة الرابعة ۱۳۵۴ھ، ص ۱۷۸

بنوحنیفہ کی مجنونانہ عصبیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود ان میں بعض ایسے افراد تھے جو کہتے تھے کہ مسیلمہ یقیناً جھوٹا ہے۔ اور محمد یقیناً سچے ہیں، لیکن ربیعہ کا کذّاب ہمیں مضر کے صادق سے زیادہ عزیز ہے۔ (کان بعضهم یقول أشهد أن مسیلمة کذاب، وأن محمدا صادق، ولکن کذاب ربیعة أحب إلینا من صادق مضر) بحوالہ سابق

مالک بن نویرہ کی قیادت میں ابتداءً بنوتمیم کے کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ جب کہ دوسرے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئے ہوئے عہد پر قائم رہے اور انہوں نے حضرت ابوبکر کو اپنی زکوٰۃ ادا کی۔ مگر بعد میں مالک بن نویرہ اپنے ساتھیوں کو لے کر بنوتغلب کی ایک عورت سجاح بنت الحارث سے مل گیا جو نبوت کی مدعی تھی اور اپنے ساتھ تغلب کے عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد کو لے کر مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے نکلی تھی۔ مالک بن نویرہ نے اس سے مصالحت کر کے اس کو مشورہ دیا کہ پہلے بنوتمیم کے ان لوگوں کا صفایا کرنا چاہیے جو ہماری مخالفت کر رہے ہیں اور اب بھی مدینہ کی اسلامی ریاست کے وفادار بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکر کو اکسایا کہ وہ ایسے تمام لوگوں کو بے دریغ قتل کر دیں۔

اس کے بعد اس نے یمامہ کا رخ کیا۔ جہاں مسیلمہ اپنے تقریباً ۴۰ ہزار پیرووں کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ دونوں نے آپس میں صلح کر لی اور یہ فیصلہ کیا کہ خالد بن ولید کی قیادت میں یمامہ کی طرف بڑھنے والی مسلم فوج کا دونوں مل کر مقابلہ کریں گے۔

یمامہ کی خوں ریز لڑائی میں مسیلمہ کے قتل کے بعد مرتدین کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ سب کے

سب بھاگ کر قلعہ بند ہو گئے۔ ان کی طرف سے جماعہ بن مرارہ نے حضرت خالد بن ولید کو صلح کی پیش کش کی۔ جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جنگ میں شریک افراد کو قتل نہ کیا جائے (ألا یقتل المقاتلون) حضرت خالد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے صلح نامہ لکھ دیا۔ عین اس موقع پر حضرت ابوبکر کا ایک خط ان کو ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ بنو حنیفہ کے وہ تمام لوگ قتل کر دیے جائیں جو اس جنگ میں شریک تھے۔ مگر حضرت خالد نے شرائط صلح کی پابندی کرتے ہوئے انہیں قتل نہیں کیا۔ اس کے بعد بنو حنیفہ نے وفود کی شکل میں حضرت ابوبکر کے پاس جا کر دوبارہ اسلام کا اقرار کر لیا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر ارتداد ہر حال میں اور مطلق طور پر مستوجبِ قتل ہوتا تو ان لوگوں کو بالکل معاف نہیں کیا جاتا۔

نبوت کا دعویٰ کرنے والوں میں ایک طلیحہ بن خویلد الاسدی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پا کر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ بنو اسد بن خزیمہ اور اس کے حلیف قبائل طئی، غطفان اور ذبیان وغیرہ کے بے شمار لوگ مرتد ہو کر اس کے ساتھ ہو گئے اور اس کی قیادت میں بزاخہ کے مقام پر اپنا ایک فوجی محاذ قائم کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید نے جب ان کو شکست دی تو طلیحہ وہاں سے بھاگ کر شام چلے گئے اور حضرت ابوبکر کی وفات تک وہیں رہے۔ پھر حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں وہ دوبارہ مسلمان ہو کر مدینہ آئے تو حضرت عمر نے ان کے اسلام کو قبول کیا اور ان سے نہ کسی خون پر مؤاخذہ کیا نہ مال پر (فأقره عمر رضي الله عنه بعد إسلامه، ولم يأخذه بدمٍ ولا مالٍ)۔ الأحكام السلطانية، للماوردی۔ حالاں کہ کسی حد کی سزا توبہ کی بنیاد پر معاف نہیں ہوتی۔

مذکورہ واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں عمومی ارتداد کا جو واقعہ پیش آیا وہ محض تبدیلیٔ دین کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ اسی کے ساتھ وہ مدینہ کی اسلامی ریاست کے ساتھ سیاسی غداری بھی تھی۔ مزید یہ کہ ان مرتد قبائل میں سے بعض نے عملاً مدینہ کے اوپر جارحانہ حملے بھی کئے۔ بعض نے اپنے قبیلہ کے ان وفادار مسلمانوں کا قتل عام کیا جو اب بھی اپنے عہد پر قائم رہتے ہوئے خلیفہ کے عاملین کو زکوٰۃ ادا کر رہے تھے۔ اگر مجرد تبدیلیٔ دین پر قتل یا قتال کے حکم کو ایک مطلق اور

قطعی حکم مانا جائے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے تو ہم ان واقعات کی کوئی توجیہہ نہیں کر سکتے جن میں مرتدین پر قابو پالینے کے بعد انہیں معاف کر دیا گیا۔

بعد کے دور میں بھی اس کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ ارتداد کے باوجود افراد کو قتل نہیں کیا گیا اور اس فعل پر علماء وفقہاء نے کوئی نکیر نہیں کی۔ مثال کے طور پر ابوزید احمد بن سہل بلخی نے لکھا ہے کہ ہندستان میں عباسی زمانہ میں مسلم اقتدار کے علاقوں میں ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص مسلمان ہو کر دوبارہ اپنے سابق مذہب کی طرف لوٹ جاتا تھا اور قدیم رواج کے مطابق، اس کی واپسی کی مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ ہندستان میں ان مسلمانوں کو دوبارہ غیر مسلم بنانے کا طریقہ کیا تھا، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

ومن ارتد منهم اذا سباه المسلمون لم يقتلوه حتى يزكوه ويطهروه ان تحلق كل شعرة من رأسه وجلده ثم يجمع بول البقر واختثائها وسمنها ولبنها فيسقى منها اياما ثم ينصب به الى البقرة فيسجد بها (البدء والتاریخ، جلد ۴، صفحہ ۲)

ہندستان میں مسلمان جب کسی غیر مسلم کو جنگ میں گرفتار کرتے اور بعد میں وہ اپنے مذہب میں واپس چلا جاتا تو اس کی قوم والے اسے قتل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ پاک کرتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اس کے سر اور بدن کے تمام بال مونڈ دیتے، پھر گائے کا پیشاب، گوبر، دودھ، گھی جمع کر کے اسے کئی دن تک پلاتے۔ اس کے بعد اسے گائے کے سامنے لے جاتے اور وہ اس کو سجدہ کرتا۔

اس قسم کی ''ارتداد'' کی مثالیں پیش آتی رہیں مگر ایسا نہیں ہوا کہ ان کو قتل کر دیئے جانے کا فتویٰ دیا جائے۔

پچھلی بحث سے معلوم ہوا کہ قتل مرتد کا حکم قرآن (فتح ۱۶) سے ثابت نہیں ہوتا۔ یہ صرف ایک تفسیری قیاس ہے جس کے لیے کوئی قطعی دلیل نہیں۔ سورہ فتح کی آیت کی زیادہ صحیح تفسیر وہ ہے جو دوسری آیات اور احادیث سے نکلتی ہے، یعنی یہ کہ یہ آیت مشرکین عرب کے بارے میں ہے جن سے متعلق اما الاسلام او القتل کا حکم تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر نبی نے آخری حد تک حجت تمام کر دی تھی۔ اس لیے سنت انبیاء کے مطابق، حکم دیا گیا کہ وہ یا تو اسلام لائیں ورنہ قتل کر دئے جائیں گے۔ فتح

کی آیت سے اگر قتل مرتد کا حکم نکالا جائے تو یہ قرآن کے دوسرے حکم کے خلاف ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ لا اکراہ فی الدین۔

مذکورہ حدیث میں تغییرِ دین یا تبدیل دین کا لفظ ہے۔ اس سے بظاہر وہ حکم بھی نکالا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے دوسرے معنیٰ یہ بھی لیے جا سکتے ہیں کہ اس سے مراد وہ تبدیلیٔ دین ہے جو اسلام کے محاذ سے نکل کر غیر اسلام کے محاذ میں چلے جانے کے ہم معنیٰ ہو۔ جیسا کہ عملاً اُس وقت تھا۔ یہ حدیث ہجرت کے بعد کی ہے جب کہ اسلام اور غیر اسلام میں مکمل تصادم شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت دین بدلنے کے معنیٰ عملاً یہی بن گئے تھے کہ آدمی اسلامی کیمپ سے نکل کر غیر اسلامی کیمپ میں جانا چاہتا ہے۔ یہ سادہ معنوں میں صرف اسلامی عقیدہ کو چھوڑنا نہیں تھا بلکہ وہ وفاداری تبدیل کرنا یا دوسرے الفاظ میں ریاست سے بغاوت کرنا تھا۔ اس قسم کا سیاسی ارتداد شارع کی نظر میں گردن زدنی ہے۔

اسلام میں دو قسم کی سزائیں ہیں — ایک اخروی سزا اور دوسرے دنیوی سزا۔ دنیوی سزا کا تعلق سماجی جرم سے ہے، یعنی ایک شخص ایسا جرم کرے جس سے سماج میں فساد پیدا ہوتا ہے، جس سے دوسرے انسانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچے، جس سے دنیوی زندگی کے معمول میں کوئی خرابی واقع ہوتی ہو۔ اس سزا کا تعلق حکومت اور عدالت سے ہے۔ حکومت اور عدالت ایسے ہر سماجی جرم پر مجرم کو حسبِ ضرورت کم یا زیادہ سزا دے سکتی ہے۔ شریعت میں اس دنیوی سزا کو حدود اور تعزیرات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حدود سے مراد وہ سزا ہے جو نصِ قطعی سے ثابت ہو، اور تعزیرات سے مراد وہ سزا ہے جو حاکمِ وقت اپنے اختیار کے تحت نافذ کرے۔

دوسری سزا وہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ یہ سزا جہنم کی صورت میں کسی کو آخرت میں دی جائے گی۔ اس دوسری سزا کا تعلق شخصی گناہ پر ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اعتقادی ارتداد اُخروی معنوں میں ایک انفرادی جرم ہے، وہ سماجی نوعیت کا جرم نہیں۔ اس اصول کی روشنی میں مجرّد اعتقادی ارتداد کی سزا دنیوی قتل نہیں ہو سکتا۔ یہ اُخروی

نوعیت کا ایک جُرم ہے اور اُس کی سزا بھی صرف آخرت میں خدا کے حکم کے مطابق دی جائے گی۔

یہ بات بجائے خود درست ہے کہ فقہاء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ یعنی جو شخص مسلم سماج کا ممبر ہو اور اعلان کے ساتھ اسلام اختیار کر چکا ہو، اگر وہ اس کے بعد مرتد ہو جائے اور ترکِ اسلام کا اعلان کرے تو اُس کو قتل کر دیا جائے گا۔

مگر سوال یہ ہے کہ فقہاء کی اس رائے کی شرعی بنیاد کیا ہے۔ یہ بنیاد صرف ایک خبرِ واحد ہے۔ یعنی من بدّل دينه فاقتلوه۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن میں موجود نہیں۔ کسی جُرم پر قتل کا حکم ایک آخری اور انتہائی سزا ہے۔ اس نوعیت کی سزا کا ذکر قرآن میں ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے قرآن کی آیتوں کو دیکھئے تو اس میں ارتداد کے بعد قتل کا حکم نہیں ہے بلکہ طبعی موت مرنے کا ذکر ہے (ومن يرتد منكم عن دينه فيمت و هو كافر)۔

قرآن اور حدیث کے درمیان اس واضح اختلاف کی صورت میں اصولی طور پر یہ کیا جانا چاہیے کہ قرآن کی روشنی میں حدیث کی تاویل کی جائے، نہ کہ حدیث کی روشنی میں قرآن کی تاویل کی جائے۔ ایک خبرِ واحد کی بنیاد پر قرآن کی تاویل کرنے کے بجائے زیادہ محفوظ موقف یہ ہے کہ قرآنی آیتوں کو اصل بنیاد بنا کر اُس کی روشنی میں حدیث کا ایسا مفہوم متعین کیا جائے جو قرآن سے ٹکرانے والا نہ ہو۔

— یہ محفوظ تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ قرآن میں اعتقادی ارتداد کا ذکر ہے اور حدیث میں سیاسی ارتداد (اسٹیٹ سے بغاوت) کا۔ یہی تاویل زیادہ قرینِ صواب ہے۔

آخری بات

جیسا کہ اوپر کی بحث سے واضح ہوا، قتلِ مرتد کا حکم قرآن میں موجود نہیں ہے۔ حدیث میں یہ حکم ایک خبرِ واحد کے طور پر ملتا ہے۔ فقہاء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مرتد کے قتل پر اُن کا اجماع ہے، مگر یہ بات درست نہیں۔ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ جمہور فقہاء (فقہاء کی اکثریت) اس رائے کے حق میں ہے، مگر اجماع کا دعویٰ یقینی طور پر درست نہیں۔

تاہم اگر کچھ لوگوں کے نزدیک مرتد کے قتل کا حکم اسلامی شریعت کا ایک حکم ہے، تب بھی یہ

کہنا درست ہوگا کہ اس معاملہ میں نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں خود شریعت کے اس متفقہ حکم کو منطبق کرنا چاہیے: الضرورات تبیح المحظورات (ضرورت ناجائز کو جائز کر دیتی ہے)۔ اور یہ کہ تتغیر الأحکام بتغیر الزمان والمکان (زمان اور مکان کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں)۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ کو لے کر بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کو بدنام کیا گیا ہے۔ میڈیا میں عام طور پر یہ تصور دیا گیا ہے کہ اسلام جبر اور تشدد کا مذہب ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلامی دعوت کا عمل رک گیا۔ ظاہر ہے کہ جس مذہب کو لوگ منفی نظر سے دیکھنے لگیں، اُس کا مطالعہ وہ ہمدردی کے ساتھ نہیں کریں گے اور نہ اُس کو قبول کرنے کا جذبہ اُن کے دل میں پیدا ہوگا۔

ایسی حالت میں اب آخری وقت آگیا ہے کہ اس پورے معاملہ پر ازسرِ نو غور کیا جائے اور پھر یا تو اس روایتی مسلک کو اسلام میں اضافہ قرار دیتے ہوئے اس کو رد کر دیا جائے یا پھر اُس کا اجتہادی جائزہ لے کر یہ اعلان کیا جائے کہ جدید حالات کا تقاضا ہے کہ اس فقہی مسلک کو بدلا جائے اور مرتدین کے مسئلہ کو پُر امن نصیحت کا موضوع بنایا جائے، نہ کہ قتل کا موضوع۔